ISSN 0974-1372

عثمانی نمبر

سہ ماہی

جہان طب

نئی دہلی

جلد: ۱۶ | جنوری-جون ۲۰۱۵ء | شمارہ: ۳-۴

حکیم مظہر سبحان عثمانی

(۱۹۳۸-۲۰۱۳ء)

CCRUM

سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن

ISSN: 0974-1372

سہ ماہی

جہان طب

جلد–۱۶

شمارہ – ۳، ۴

حکیم مظہر سبحان عثمانی نمبر

جنوری - جون ۲۰۱۵ء

سرپرست اعلیٰ

جناب شریپاد یسو نائک

وزیر مملکت برائے آیوش [آزاد چارج]، حکومت ہند

سرپرست

جناب اجیت ایم شرن

سکریٹری وزارت آیوش، حکومت ہند

مدیر اعلیٰ

پروفیسر رئیس الرحمٰن

ڈائرکٹر جنرل، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی

مجلس مشاورت

طبیبہ ام الفضل
حکیم محمد خالد صدیقی
پروفیسر انیس احمد انصاری
پروفیسر منصور احمد صدیقی
پروفیسر محمد محی الحق صدیقی
حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی
حکیم سید غلام مہدی
پروفیسر ابوبکر خاں
پروفیسر سید شاکر جمیل
حکیم فضل الرحمٰن مصباحی
پروفیسر محمد سکندر حیات صدیقی
پروفیسر عبداللطیف

مجلس ادارت

حکیم خالد محمود صدیقی، حکیم محمد فضیل، حکیم احمد سعید، محمد نیاز احمد

مدیر

حکیم وسیم احمد اعظمی

معاون مدیر

حکیم امان اللہ

صدر دفتر

سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن
۶۵–۶۱، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جنک پوری، نئی دہلی–۱۱۰۰۵۸
فون: +91-11- 28521981
+91-11- 28525982-3
+91-11- 28520846,28522524
+91-11- 28525831,52,62,83,97
+91-11- 28520501
فیکس: +91-11- 28522965
ای میل: unanimedicine@gmail.com
ویب سائٹ: http//www.ccrum.net

خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ

سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن
۶۵–۶۱، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جنک پوری، نئی دہلی–۱۱۰۰۵۸

قیمت فی شمارہ : ۵۰ روپے
سالانہ زر تعاون: ۲۰۰ روپے

کمپوزنگ

امجد علی کمپیوٹر سنٹر، ابوالفضل انکلیو، پارٹ - ۱، جامعہ نگر، نئی دہلی

ناشر و طابع

ایڈمنسٹریٹو آفیسر
سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن
۶۵–۶۱، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جنک پوری، نئی دہلی–۱۱۰۰۵۸

مطبع

راکمو پریس پرائیویٹ لمیٹڈ
C-59، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-۱، نئی دہلی–۱۱۰۰۲۰

ترتیب

اداریہ	مدیر اعلیٰ	۵
حکیم مظہر سبحان عثمانی کا علمی وفنّی تبحر	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	۷
کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے	پروفیسر رئیس الرحمٰن	۱۴
حکیم مظہر سبحان عثمانی	پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن	۱۸
حکیم مظہر سبحان عثمانی — 'جس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا'	پروفیسر عبدالحق	۲۱
پروفیسر حکیم مظہر سبحان عثمانی — ایک لائق طبیب وایک فاضل استاذ	پروفیسر انیس احمد انصاری	۲۵
حکیم مظہر سبحان عثمانی — خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا	ڈاکٹر خاور ہاشمی	۲۷
طب یونانی کا انسائیکلوپیڈیا — حکیم مظہر سبحان عثمانی	حکیم سید غلام مہدی	۳۰
حکیم مظہر سبحان عثمانی اور ہمارے مراسم	طبیبہ ام الفضل	۳۳
حکیم مظہر سبحان عثمانی — ایک گنج گراں مایہ	حکیم محمد خالد صدیقی	۳۵
حکیم مظہر سبحان عثمانی — کچھ یادیں کچھ باتیں	پروفیسر سید شاکر جمیل	۳۸
محسن طب — حکیم مظہر سبحان عثمانی	حکیم خالد محمود صدیقی	۴۰
حکیم مظہر سبحان عثمانی — تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے ایک مایۂ ناز فرزند	حکیم وسیم احمد اعظمی	۴۴
کاغذ کا غذ دھول	ایم۔اے۔فاروقی	۵۳
حکیم مظہر سبحان عثمانی	پروفیسر سید مشکور احمد	۵۹
حکیم مظہر سبحان عثمانی — اپنا تاثر	پروفیسر سید مودود اشرف	۶۲
استاذ محترم حکیم مظہر سبحان عثمانی	پروفیسر خالد زماں خاں	۶۴
حکیم مظہر سبحان عثمانی — ایک معتبر شخصیت	پروفیسر منصور احمد صدیقی	۶۷
حباب میں موتی — حکیم مظہر سبحان عثمانی	حکیم شمس الآفاق	۷۰
حکیم مظہر سبحان عثمانی — ایک ہمہ گیر شخصیت	پروفیسر ابوبکر خاں	۷۲
استاذِ محترم پروفیسر حکیم مظہر سبحان عثمانی: کچھ یادیں کچھ باتیں	ڈاکٹر محمد سکندر حیات صدیقی	۷۴
استاذی محترم جناب حکیم مظہر سبحان عثمانی	حکیم شارق علی خاں	۷۸

طب وادب کا مظہر — حکیم مظہر سبحان عثمانی	حکیم اشہر قدیر	۸۲
حکیم مظہر سبحان عثمانی کی طبّی نگارشات	حکیم محمد رضی الاسلام ندوی	۸۶
حکیم مظہر سبحان عثمانی — وہ جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں	خوشنود حسن قدوسی	۹۴
آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی	ڈاکٹر اسلم جاوید	۹۶
ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات — ایک مطالعہ	حکیم محمد فضیل	۹۹
میرے پاپا	ڈاکٹر دانش ریحان عثمانی	۱۰۲
شاہدِ شمع فروزاں	حکیم احمد سعید	۱۰۵
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا	حکیم سید امام الدین احمد	۱۱۶
حکیم مظہر سبحان عثمانی — چند یادیں اور تاثرات	حکیم برکت اللہ ندوی	۱۱۸
حکیم مظہر سبحان عثمانی — فن اور شخصیت	ڈاکٹر وسیم احمد	۱۲۰
حکیم مظہر سبحان عثمانی	حکیم مقبول احمد خاں، حکیم محمد نفیس خاں	۱۲۹
حکیم مظہر سبحان عثمانی: میرے استاذ، میرے مربی	حکیم ضیاء الحق صدیقی	۱۳۱
حکیم مظہر سبحان عثمانی سے ایک انٹرویو	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	۱۳۴
عکس تحریر	**جمع و ترتیب:** حکیم امان اللہ	۱۳۹
حکیم اجمل خاں کا قومی تصور اور انقلابی کردار	حکیم مظہر سبحان عثمانی	۱۴۱
الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے	حکیم مظہر سبحان عثمانی	۱۴۷
تذکرہ استاذ	حکیم مظہر سبحان عثمانی	۱۴۹
حنین ہندی — زبدۃ الحکماء علامہ حکیم محمد کبیر الدین	حکیم مظہر سبحان عثمانی	۱۵۴
حکیم محمد عبدالرزاق — ایک مقناطیسی شخصیت	حکیم مظہر سبحان عثمانی	۱۵۷
یونانی طِب میں استفراغ و تنقیہ کی اہمیت	حکیم مظہر سبحان عثمانی	۱۵۹
اطبائے قدیم کے سہل الاستعمال مجربات	حکیم مظہر سبحان عثمانی	۱۶۲
'تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں'	مظہر سبحان گورکھپوری	۱۶۴
'آئینۂ عبرت'	مظہر سبحان گورکھپوری	۱۶۵
'یہ بندگان نہرو'	مظہر سبحان گورکھپوری	۱۶۶
خودکشی — مغربی تہذیب کے جوہر سے پھوٹنے والی ایک وباء میرلن منرو — اس تہذیب کا ایک پامال وجود	م۔س گورکھپوری	۱۶۸
کعبہ سے .... بت خانے تک	ملا امرود بخت شالجی	۱۷۱
مرثیہ جناب حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم قطعہ تاریخ وفات	اجمل صدیقی	۱۷۵
حکیم مظہر سبحان عثمانی تصویروں کے آئینے میں		۱۷۶

اداریہ

حکیم مظہر سبحان عثمانی ہشت پہلو شخصیت کے مالک تھے۔ طبِ یونانی میں حذاقت کے مرتبہ پر فائز تھے اور طبّی ادبِ عالیہ پر گہری نظر رکھتے تھے۔ اچھے استاذ تھے اور دیگر معاصر نظامہائے علاج سے بھی واقفیت رکھتے تھے۔ پُر جوش اور خوش بیان مقرر تھے۔ صاحبِ اسلوب مؤلف تھے اور لکھنے اور بولنے میں لفظوں کا انتخاب بڑی دانشوری کے ساتھ کرتے تھے۔ وطنی سیاست پر مخصوص زاویۂ نگاہ رکھتے تھے۔ خوش فکر اور روشن ضمیر شاعر تھے اور ان سب پر مستزاد دردمند، رحم دل اور انتہائی مخلص انسان تھے۔ مختلف علوم وفنون میں غیر معمولی مہارت رکھنے اور دنیا کا سرد وگرم چشیدہ ہونے کے باوجود وہ خشک اور عزلت گزیدہ نہیں تھے، بلکہ اُن کے مزاج میں ظرافت اور بذلہ سنجی تھی۔ اُن کی شخصیت میں وجدانی تمکنت اور احترامِ انسانیت والا وقار تھا۔ اُن کے وجود میں دلوں کو مسخر کرنے والی روحانیت تھی۔ وہ احترامِ انسانیت کے علم بردار اور مذہبی رواداری کے نمائندے تھے۔ وہ پر وقار خاکساری، کریم النفسی اور قومی مساوات کے اوصاف سے متصف سیکولر ذہنیت کے انسان تھے۔ اُن کے مزاج میں جدت پسندی اور فکر میں اختراعیت تھی۔ وہ پامال راہوں کے مسافر نہ تھے، سنگ لاخ راستوں کے راہی تھے اور آبلہ پائی سے اُنہیں عزم وحوصلہ ملتا تھا۔ علم وآگہی اور خود اعتمادی وعرفانِ ذات کے ساتھ نصب العین تک پہنچنے کی مسلسل جدوجہد نے اُن کی شخصیت کو بلندیوں کے مقامِ اعلیٰ تک پہنچا دیا تھا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کو امراضِ مزمنہ کے معالجہ میں دستِ شفا حاصل تھی۔ وہ طب کے دبستانِ لکھنؤ کے پروردہ تھے، اختراعی ذہن اور اجتہادی فکر رکھتے تھے، اسی لیے اس میں طب کے دہلوی دبستان کے معالجہ کو برتنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ جدید طب کے مبادیات سے بھی آگہی تھی اور تشخیصی مراحل میں اس سے بھی استفادہ کرتے تھے بایں ہمہ نسخوں میں پیوندکاری کے خلاف تھے اور خالص یونانی دوائیں استعمال کراتے تھے۔ معاصر طبوں پر نظر تھی، اسی لیے مریضوں کا پڑھا لکھا طبقہ اُن کے علم اور حذاقت کا معترف ہو جاتا تھا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کو عربی اور فارسی میں مہارت حاصل تھی اور طبّی ادبِ عالیہ، جس کا بیشتر سرمایہ اِنہیں زبانوں میں ہے، پر بھی اُن کی ناقدانہ نظر تھی، جس کا اظہار مطب اور درس میں ہوتا رہتا تھا۔ درس وتدریس کا اُن کا اپنا منفرد انداز تھا۔ وہ طلبہ کی نفسیات سے واقف اور اُن کے مزاج شناس تھے، اسی لیے اپنے مضامین کو اس انداز میں پڑھاتے تھے کہ دل سے نکلے، دل میں سمائے۔ درس کے دوران اُن کی شگفتگی اور بذلہ سنجی، اپنے تمام تر وقار کے ساتھ جاری رہتی تھی، جس سے طلبہ تازہ دم اور شاداب رہتے تھے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے زیادہ کچھ نہیں لکھا ہے، تاہم جو بھی لکھا ہے اس میں تحقیق کے ساتھ اسلوب کی جدت اور فکر کی تازگی ہے۔ مقالات اور مضامین کی تعداد دو درجن سے زیادہ نہ ہوگی اور 'ٹیپو سلطان کے معالجات وتکنیکی تجربات' کے نام سے ۶۴ صفحات پر مشتمل ایک مختصر کتاب۔ لیکن جب ہم ان کی تکنیکی اور

موضوعاتی توقیت کرتے ہیں تو کمیت کا شکوہ نہیں رہتا۔ انہوں نے اپنی اس کتاب میں ٹیپو سلطان کے معالجاتی اور تکنیکی تجربات کو جس فنی دانشوری کے ساتھ قلم بند کیا ہے اور اس دور کی تہذیب و معاشرت کو جس انداز میں بیان کیا ہے وہ یقیناً لائق تحسین ہے۔ اردو، فارسی اور انگریزی کے کم و بیش چوالیس مطبوعہ و غیر مطبوعہ مصادر کے تناظر میں اس موضوع پر ایک بڑا اہم علمی کام کیا ہے۔ حکیم صاحب کے مضامین اور مقالات میں بھی فنی آگہی اور عصری وجدان کا پتہ چلتا ہے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی شعلہ بیاں اور جادو اثر مقرر تھے۔ اُن کی آواز میں باوقار سنجیدگی اور لہجے میں عذوبت تھی۔ علم اور حافظہ نے اُن کی خطابت کو واضحیت اور قطعیت عطا کی تھی۔ وہ اپنی تقریروں میں تاریخی حقائق، شواہد، دلائل اور ذاتی تجربات کے ذریعہ بات کو منقح کر کے اپنے سامع کے ذہن و دماغ کو مسحور کر دیتے تھے۔ اپنے لیے اُنہوں نے سیاست کی جو راہ منتخب کی تھی، وہ خاروں بھری تھی۔ سارے وجود کا لہولہان ہونا یقینی تھا، وہ اپنی سوچ، اپنی فکر اور اپنے نظریے کو سود و زیاں کے میزان پر تولنے کے قائل نہ تھے۔ جس بات کو سچ جانا، اس پر عمل کیا، جس کو سچا جانا، اس کا ساتھ دیا۔ نہ کسی کو مرعوب کیا اور نہ ہی کسی سے مرعوب ہوئے۔ ملکی سیاست میں فعال شمولیت رہی اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ قومی سطح پر اُن کی خدمات کا اعتراف کیا گیا کہ اُنہیں نیشنل مائنارٹیز کمیشن کا وائس چیرمین مقرر کیا گیا۔ اس منصب پر رہ کر انہوں نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے بہت سے کام کیے اور متعدد رفاہی اور ترقیاتی پالیسیوں کے وضع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی شاداب ذہن اور روشن ضمیر شاعر تھے۔ مظہرؔ اور زخمیؔ تخلص کرتے تھے۔ مخصوص شعری نشستوں میں اپنا کلام سناتے تھے۔ لیکن افتادِ طبع کچھ ایسی تھی کہ ان کو محفوظ رکھنے کی جانب دھیان نہیں گیا، کچھ کلام 'سوزِ دروں' کے نام سے منتشر شکل میں ہے اور غالباً یہی اُن کی پوری شعری کائنات ہے۔

سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن سے حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کا گہرا ربط رہا۔ وہ کونسل کی سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی کے رکن ہونے کے ساتھ اس کی کلینکل ریسرچ سَب کمیٹی کے چیئرمین رہے۔ اس کے علاوہ بہت سی دیگر اہم کمیٹیوں سے بھی ان کی وابستگی رہی۔ کونسل کے سیمینار، کانفرنس اور دیگر مختلف پروگرام ان کی شمولیت کے بغیر ادھورے خیال کیے جاتے۔ کونسل کی بہت سی تحقیقی حصولیابیاں ان کی رہنمائی کی ہی مرہون منت ہیں۔

جہانِ طب کا یہ خصوصی شمارہ حکیم مظہر سبحان عثمانی کی طبّی اور قومی خدمات کے اعتراف کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ شاید اس کے ذریعہ کونسل اور طبّی برادری ان کے گراں قدر احسانات سے عہدہ برآ ہو سکے۔

[پروفیسر رئیس الرحمٰن]

مدیرِ اعلیٰ

حکیم مظہر سبحان عثمانی کا علمی وفنّی تبحر

☆حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی

پروفیسر حکیم مظہر سبحان عثمانی کی یہ انتہائی خوش بختی تھی کہ موضع صمد پور، گورکھپور کے متوسط زمیندار گھرانے میں یکم جولائی، ۱۹۳۸ء کو پیدا ہونے کے باوصف علمی و دینی تعلیم کا ماحول بھی اسی گھرانے نے فراہم کیا، جہاں دولت کی فراوانی کے سبب اُس زمانے میں بچوں کی بے راہ روی کے امکانات زیادہ روشن رہتے تھے۔ جسے صرف اور صرف اُن کی خوش طالعی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے مدرسہ ناصر العلوم، گھوسی سے نہ صرف رسمِ مکتب بلکہ ابتدائی درسیات کی بھی تکمیل کی، جو اُس وقت اعظم گڑھ ضلع میں تھا۔ اس کے بعد ثانوی تعلیم گورکھپور کے قدیم دینی و رفاہی ادارہ انجمن اسلامیہ سے مکمل کی۔ پھر عربی، فارسی اور دینی تعلیم کے حصول اور اسے حدِ کمال تک پہنچانے کے لیے سلسلۂ جنبانی جاری کیا، جس کے نتیجے میں مشرقی یوپی کے مشہور جامعات یعنی مدرسہ اسلامیہ عربیہ بیت العلوم سرائے میر [اعظم گڑھ]، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر [اعظم گڑھ]، مدرسہ مفتاح العلوم [مئو] اور آخر میں مدرسہ کنز العلوم، ٹانڈہ [فیض آباد] میں اپنے وقت کے نابغۂ روزگار اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا شرف حاصل کیا۔[۱،۲] مدرسہ بیت العلوم میں اُس وقت والد محترم مولانا محمد سعیدؒ مہتمم کے علاوہ مولانا عبدالقیومؒ، مولانا افتخار احمدؒ اور مولانا عبید الرحمٰن جامؔؒ جیسے اساتذۂ کرام موجود تھے۔ اسی طرح کنز العلوم میں مولانا قاری علیم اللہؒ مہتمم کے علاوہ مولانا وکیل الدینؒ، مولانا سید نصرت علیؒ اور مولانا نور محمدؒ جیسے علماء وفضلاء موجود تھے۔ بیت العلوم میں مولانا عبید الرحمٰن جامؔ پڑھتے بھی تھے، پڑھاتے بھی تھے، تقریر پر اُنہیں ملکہ حاصل تھا، جن کا عثمانی مرحوم پر گہرا رنگ چڑھ گیا تھا۔

علوم شرقیہ کی تکمیل کے بعد طبّی تعلیم کی طرف رخ کیا اور ۱۹۵۹ء میں تکمیل الطب کالج، لکھنؤ سے پنج سالہ ڈگری کورس ایف، ایم، بی، ایس کی سند حاصل کی۔ کسب و استفادہ کی غیر معمولی صلاحیت کے سبب ہی فاضل اساتذۂ کرام کی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ چنانچہ حکیم شکیل احمد شمسؔی نیز شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین کی خصوصی توجہ اور التفاتِ پیہم انھیں حاصل رہا۔

موخر الذکر کے زیرِ تلمذ نسخہ نویسی کی علمی مشق کی تکمیل کی۔ تاہم وہ حکیم شکیل احمد شمسؔی سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ جس کا سبب غالباً اُن کا ذوقِ سخن بھی تھا۔[۳،۴،۵]

آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے تاریخی اجلاس منعقد ۱۹۵۹ء، علی گڑھ میں پہلی بار شرکت کا شرف حاصل ہوا، جو فیضانِ نظر تھا، حکیم شمسؔی کا اس اجلاس میں صدر الاطباء حکیم محمد الیاس خاں، شفاء الملک حکیم احمد عثمانی، شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی اور حکیم عبدالحمید جیسے اساطینِ وقت اور عمائدینِ فن شریک تھے۔[۶]

ایسا نہیں کہ اُنہوں نے سارے مدارج ایک جست میں طے کر لیے ہوں، اُنہوں نے وطن، گھوسی اور گورکھپور کے علاوہ چار مشہور مشرقی جامعات سے اکتسابِ فیض کیا، جن کا ذکر اُوپر کیا جاچکا ہے۔ اسی طرح اے اینڈ یو طبّیہ کالج، دہلی میں مستقل ملازمت تک بھی بڑی آبلہ پائی سے دوچار ہوئے، جہاں اُنہیں صحیح معنوں میں علم وفن کی خدمت کا بھرپور موقع ملا۔ پھر تو اُن کا ہنر نکھرتا چلا گیا۔

☆سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی

آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس میں سینئر وائس پریسیڈنٹ کے عہدے تک رسائی حاصل ہوئی۔ حکیم عبدالحمید اُن سے برابر فنی مشورے کرتے تھے۔ ملک کے مختلف طبّی اور ادبی اداروں کے ممبر رہے ہیں۔ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس نیز سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی بیشتر کانفرنسوں میں شرکت فرماتے رہے۔ مدراس، بنگلور، ممبئی، پونہ، سری نگر، کلکتہ، حیدرآباد اور نئی دہلی جیسے مرکزی شہروں میں منعقد ہونے والے سیمیناروں، کانفرنسوں میں گیسٹ لکچر کے لیے مدعو ہوتے رہے، جہاں حکیم صاحب کی عالمانہ بصیرت اور شعلہ بیانی سے سامعین مسحور ہوجاتے تھے۔ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن [CCRUM] کی سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی نیز کلینکل سب کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے، ملک کی کم وبیش جملہ دانش گاہوں کے تحت انڈر گریجویٹ [BUMS] اور پوسٹ گریجویٹ [MD] کے ممتحن مقرر ہوتے رہے۔[۷]

تمام تر مصروفیات کے باوصف دہلی کے نامور معالجین میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ غربا و مساکین کے علاوہ پڑھے لکھے اور دانشورانِ علم وفن بھی اُن کا علاج کرا کے آسودگی محسوس کرتے تھے اور خالص یونانی طریقۂ علاج سے شفایاب ہوتے تھے۔ وہ طبِ یونانی کے بڑے بڑے معترضین، جس میں بیشتر لوگ تعلیم یافتہ اور بڑے عہدوں پر فائز ہوتے تھے، کو بھی عالمانہ گفتگو سے قائل کرلیا کرتے تھے اور بعد میں دستِ شفا کی مہر بھی ثبت کر کے اپنا اور طبِ یونانی کا معتقد بنالیا کرتے تھے۔[۸]

ادب، صحافت، شعر وشاعری، تحریر وتقریر پر یکساں قدرت حاصل تھی جس سے اُن کے تحقیقی رجحان کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں حکیم سید شجاع الدین حسین ہمدانی ایک غیر مطبوعہ تحریر میں لکھتے ہیں:

> ''حکیم عثمانی مستقل کتابیں لکھنے کے عادی نہیں ہیں، لیکن جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کی جودتِ طبع آسمان پر پرواز کرنے لگتی ہے۔ اس کی بہترین مثال ان کی کتاب 'ٹیپو سلطان کے معالجات' ہے۔ ٹیپو سلطان میں ایک طبیب کی تلاش ایک محقق ہی کرسکتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بات کو سطحی نظر سے دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو نہایت عمیق اور دقیق نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس میں کوئی نئی بات تلاش کرلیتے ہیں''۔[۹]

ٹیپو سلطان کے علمی وطبّی ذوق اور تجدید فن کے محاسن کو حکیم عثمانی نے درج ذیل لفظوں میں بیان کیا ہے:

> ''ٹیپو سلطان جس کا علمی وطبّی ذوق موضوع کن ہے، اس کی فرماں روائی ہندوستان کے بہت سے عظیم المرتبت بادشاہوں کی جاہ و حشمت اور وسعتِ مملکت کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، مگر اس کی شخصیت نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کے دور انحطاط کا بہت ہی دلآویز مرقع ہے۔ اس کی طباعی، جدت پسندی اور تجسسِ علمی اسے دنیا کے اُن معدودے چند صاحبِ نظر تاجداروں کے ہم پلہ قرار دیتی ہے جو تاریخ کے ہر دور میں لائقِ خراجِ عقیدت ہیں''۔[۱۰]

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے نہ صرف ٹیپو سلطان کی طبّی وفنی بصیرت پر روشنی ڈالی ہے، بلکہ اس کی تجاویز و ہدایات کی توثیق طبّی اُمہات کتب سے بھی کی ہے، مثلاً ایک خط سید محمد قلعدار کے نام نقل کر کے ذاتی تبصرہ اور توثیق حکیم عثمانی کے وسعت مطالعہ کا پتہ دیتے ہیں:

> ''سری رنگا پٹنم اطلاع ملی ہے کہ کرشناراؤ کو سگِ دیوانہ نے کاٹ کھایا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ اس کو حکیم محمد بیگ کے زیر علاج رکھا جائے اور حکیم صاحب سے کہا جائے کہ اس کا علاج تن دہی سے کریں اور یہ بھی کہا جائے کہ زخم کو کم از کم چھ ماہ تک بند نہ کریں، تاکہ زہر پوری طرح خارج ہوجائے''۔[۱۱]

اب عثمانی صاحب کا عالمانہ تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

> ''سلطان کا یہ لکھنا کہ زخم بند نہ کیا جائے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کو مرض کی جملہ معلومات حاصل تھیں اور وہ اس کے اظہار میں کسی طرح کی جھجک نہیں کرتا تھا۔ خواہ اس کا مخاطب کوئی ماہر طبیب ہی کیوں نہ ہو''[۱۲]

اگلا پیراگراف حکیم صاحب کے عمیق اور وسیع مطالعہ اور فنّی شعور پر دال ہے:

> ''سگ دیوانہ کے کاٹے ہوئے زخم کو ایک مدت تک بند نہ کرنے کی تاکید مستند کتابوں میں وضاحت کے ساتھ کی گئی ہے، بلکہ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ زخم کو مزید کشادہ کیا جائے اور زخم کو مندمل کرنے والی دواؤں سے بچا جائے، تاکہ سمّیت پوری طرح خارج ہوجائے۔
>
> [ملاحظہ فرمائیں' کامل الصناعۃ' ج ۲، ص ۲۷۴-۲۷۳، ابوالحسن علی بن عباس المجوسی/ غلام حسنین کنتوری]''[۱۳]

اس طرح کی متعدد مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ ٹیپو سلطان نہ صرف تشخیصِ مرض بلکہ تجویز اور نسخہ نویسی پر بھی عبور رکھتا تھا۔ اس کے طبّی اور سائنٹیفک مزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طب کے علاوہ سلطان کو معدنی اور زرعی سائنسی علوم سے بھی بہت دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی ٹیپو سلطان کے مزاج کا اس طرح ایک حصہ بن چکی تھی کہ میدانِ جنگ میں اپنے دشمنوں کے بیچ محصور ہونے کے باوجود اپنے تحقیقی مشن کو بھولتا ہوا دکھائی نہیں دیتا تھا''۔[۱۴]

۱۹۶۶ء میں شائع ہونے والی اُن کی اکلوتی کتاب 'ٹیپو سلطان کے معالجات' اب نوادرات کی فہرست میں شامل ہوگئی ہے، جس پر حکیم سید غلام مہدی کا اور تکنیکی تجربات ہمدرد پندرہ روزہ کے کسی شمارہ میں تبصرہ بھی شائع ہوا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ممکنہ تلاش وجستجو کے بعد اسے حاصل کر کے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ شائع کیا جائے۔ یہ کام سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن باحسن الوجوہ انجام دے سکتی ہے۔

زبان، ادب اور فن کے سلسلے میں اُن کے تبحرِ علمی کا اندازہ اُن کے مقالہ 'حنین ہندی' کے درج ذیل اقتباسات سے بھی بآسانی کیا جا سکتا ہے جس میں وہ علامہ حکیم محمد کبیر الدین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''قدیم وجدید نظریات طب کے تعلق سے علامہ کا تقابلی مطالعہ بہت ہی وسیع وعمیق تھا۔ عربی، فارسی اور اردو لسانیات پر اُن کو قدرتِ کاملہ حاصل تھی، لاطینی زبان بھی جانتے تھے''۔ [۱۵]

ادب کا مرقع حسب ذیل شہ پارہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

''علامہ نے یونانی طب کی قدیم کتابوں کا صرف ترجمہ ہی نہیں کیا ہے، بلکہ اس پر اپنی جودت فکر کی گہری چھاپ بھی چھوڑی ہے۔ بلاشبہ انہوں نے برِصغیر ہند کے طبّی کارواں کی علمی قیادت کی ہے، علامہ کی بعض تخلیقی کاوشیں نہ صرف طبع زاد ہیں، بلکہ ہندوستان کے طبّی سرمایۂ ادب کی آبرو کہے جانے کی مستحق ہیں''۔[۱۶]

کونسل نے ایک دفعہ پاپولر لکچرز کا سلسلہ کانسٹی ٹیوشن کلب، دہلی میں شروع کیا تھا جس میں مرحوم نے متعدد بار عصری مسائل پر خطاب کیا تھا۔ جس سے ان کی علمی وفنّی بصیرت کا اندازہ بآسانی ہوتا تھا۔ اُن کے خطبات بڑے معلومات آفریں ہوا کرتے تھے۔ سامعین آخر تک ہمہ تن گوش رہا کرتے تھے، زبان آبِ کوثر میں دُھلی ہوئی 'وہ کہیں اور سنا کرے کوئی' سہلِ ممتنع کی ایسی دلنواز مثال جسے ضبطِ تحریر میں لانا ممکن نہیں، معلوم ہوتا تھا کہ ہم بھی ایسی تقریر کر سکتے ہیں، لیکن جب بولنا ہو تو پسینہ آ جائے۔ اُن کی نثر بھی ایسی کہ شاعری کا گمان ہوتا تھا جس میں آمد ہی آمد ہو، آورد کا نام بھی نہ ہو۔ ایک ایسا آبشار جو بہتا ہی چلا جائے۔

قدیم طبّی مسلمات کو عصری آگہی سے عین فطری انداز میں منطبق [Correlate] کرتے چلے جاتے تھے۔ کلاس روم، عوامی پلیٹ فارم ہو یا پھر دانشوروں کی محفل، ہر جگہ اُن کا طرز استدلال وہ بھی مکمل اعتماد کے ساتھ، متاثر کیے بغیر نہیں رہتا تھا، بلکہ سامعین کے دل و دماغ پر گہرے نقوش مرتسم ہوتے چلے جاتے تھے۔ وہ صائب الرائے تھے، اس لیے اکثر محفلوں میں اُن کی بات کو وزن دیا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو رہا کرتے تھے۔ اُن کی آواز کی سحر آفرینی صوتی زیر و بم سے ہم آہنگ ہونے کے سبب سامعین کے قلوب میں اہتزاز پیدا کیے بغیر نہیں رہتی تھی۔ جہاں چاہتے آواز میں گھن گرج پیدا ہو جاتی اور جہاں ضرورت ہوتی لب ولہجہ انتہائی نرم ہو جاتا، الفاظ بھی اُن کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے۔ زبان و بیان پر یہ قدرت بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ عثمانی صاحب گفتگو کرتے وقت غیر معمولی علمی وفنی تبحّر کا سکّہ جماتے چلے جاتے اور خاموش ہوتے تو محفل پر وقار چھا جاتا۔

عثمانی صاحب صاحبِ علم وفن ہونے کے باوصف زاہد خشک نہیں بلکہ بڑے دقیقہ رس اور بزلہ سنج بھی تھے، وہ ہنسنے ہنسانے کے دوران بھی بڑی نکتہ آفریں باتیں کہہ جاتے تھے، جس سے سامع کے ذہن میں اک دم سے برقی قمقمہ روشن ہو جاتا تھا، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ رنج ومحن سے اُن کی زندگی خالی تھی۔ وہ بھی آزمائشوں سے گزرے، لیکن اس کا اظہار کہیں نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کے برعکس بے تکلف احباب کی مجلسوں کو زعفران زار بنا دیا کرتے تھے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اُن کے فلک شگاف قہقہوں کی گہرائیوں میں حزن وملال کا سمندر موجزن ہے۔ بقول ساغرؔ اعظمی:

جو سب کے آگے چھلکتا گلاس رکھتے ہیں
تڑپ اُٹھو گے اگر اُن کی پیاس پوچھو گے

خاورؔ ہاشمی نے بجا فرمایا ہے:

''عثمانی صاحب جیسا بلند اور زندگی کی توانائی سے بھرپور قہقہہ میں نے کہیں نہیں سنا۔ اس قہقہے کے پیچھے ستا ٹھٹھول یا پھکڑ پن نہیں ہوتا۔ ایک سنجیدگی، ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ یہ حزن و ملال کی اتھاہ گہرائیوں سے پھوٹتا ہے۔ زندگی کو گوارہ بنانے کی کوشش ہوتی ہے''۔[۱۷]

شعری وجدان: حکیم عثمانی کی تقاریر اور خطبات اردو زبان وادب کا

شاہکار اور طب یونانی کا گرانقدر سرمایہ تھے، تاہم وقت گزرنے اور مختلف تلخ و تند حالات و حوادث نے ان کی نثر کا رخ شعر و سخن کی طرف موڑ دیا، چنانچہ وہ اپنے تلخ و تند تجربات اور وارداتِ قلب کو صفحاتِ قرطاس پر منتقل کرنے لگے اور بے تکلف مجلسوں میں سامعہ نوازی بھی کرنے لگے تاہم اُنہوں نے شاعری کو ذریعۂ عزت کبھی نہیں بنایا اور نہ اپنے علم و فن کو شعر و سخن کی بھینٹ چڑھایا، جب حالات حد سے تجاوز کر جاتے تو جذبات خود بخود شعر کے سانچے میں ڈھل جاتے۔ اُن کی پختہ کلامی اور شعری وجدان کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے ؎

بہاریں بھی فانی، خزائیں بھی فانی
خوشی معتبر ہے، نہ غم معتبر ہے

مانا کہ زندگی مری ناکام ہے مگر
کوئی تو بات ہے کہ جیے جا رہا ہوں میں

دیوانگی میں فرض شناسی نہیں گئی
دامانِ گل کے چاک سیے جا رہا ہوں میں

ٹوٹے گا کب نفس کا تسلسل خبر نہیں
چلتی ہوئی ہوا کا بھروسہ نہ کیجیے

ایک ایک شعر میں اسرار و معانی کا سمندر موجزن ہے، جس میں زندگی کے تجربات اور حرماں نصیبی کو سمو کر بڑی معنیٰ آفرینی پیدا کی گئی ہے۔ آخری شعر میں حیاتِ مستعار کی بے ثباتی کا ذکر انتہائی کربناک انداز میں کیا گیا ہے۔ غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا حسین امتزاج اُن کے یہاں موجود ہے اور یہی غزل کا حقیقی حسن ہے۔

حکیم عثمانی کی طبیعت میں جولانی اور جدت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پامال راہوں پر چلنے کے بجائے جدت پسندی اُن کی طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی، جس کے اثرات اُن کے طبّی افکار و خیالات پر بھی مرتب ہوئے۔ وہ تجدیدِ طب کے قائل تھے مگر طبِ یونانی کے تشخص کو داؤ پر لگا کر نہیں۔ یہ شعر اُن کے اسی جذبِ دروں کا غماز ہے ؎

نہیں پائیں گے اپنی منزل وہ مظہرؔ جو غیروں کے نقشِ قدم دیکھتے ہیں

شاعری میں وہ سب سے زیادہ حکیم مومن خاں مومنؔ، حکیم اجمل خاں شیداؔ اور آخر میں حکیم شکیل احمد سمنؔی سے متاثر نظر آتے ہیں، تاہم مقلد کسی کے نہیں۔ اُن کا شعری سرمایہ مختصر ترین ہونے کے باوجود شاعری کے پیمانے پر کھرا اترتا ہے۔

اُن کی خطابت کا تو خیر جواب ہی نہیں تھا، تاہم اُن کی تحریریں بھی ادب پارہ کی حیثیت رکھتی ہیں، کمیت کے اعتبار سے گو کہ ان کو اہمیت نہیں دی جاسکتی، تاہم کیفیت کا یہ حال ہے کہ دلوں پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی نے اپنے استاد محترم جناب حکیم شکیل احمد سمنؔی کا تذکرہ جس والہانہ انداز میں کیا ہے، اس سے اُن کے علمی و فنی تبحّر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اُن کا خوبصورت اور دلآویز اسلوب نگارش 'کرشمہ دامن دل میکشد' بن کر سحر آفریں اثر کرتا ہے، ملاحظہ ہو اقتباسِ ذیل:

> ''ہر طالب علم کو تحصیلِ علم کے مختلف المراحل دور میں متعدد اساتذہ فن سے کسبِ فیض کا موقع ملتا ہے۔ مگر ایسے اساتذہ کم ہوتے ہیں جو مدارس و جامعات کی مقررہ میعاد تعلیم ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنے تلامذہ کی علمی سطح اور فکری رُجحان کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے دم آخر تک چشمۂ فیض بنے رہتے ہیں۔ ایسے ہی اساتذۂ فن کی صف میں ایک قدآور اور دلآویز شخصیت میرے استاد شکیل احمد سمنؔی کی بھی تھی۔ استاد مرحوم سے اپنے تلمذانہ تعلق کے گزشتہ تیس سال کے طویل زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو ان کی پُرفیض رفاقت، بے پایاں محبت اور گرانمایہ سرپرستی کے آگے سر نیاز خم ہو جاتا ہے۔ یوں تو ہزاروں فرزندانِ طب کو حکیم صاحب کی شاگردی پر ناز ہوگا، ہونا بھی چاہیے مگر جو قرب و اعتماد مجھے حاصل تھا اُس پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ حکیم صاحب صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے اسم بامسمّٰی تھے، وہ رامپوری وجاہت، لکھنوی نفاست اور خاندانِ عزیزی کے آدابِ طبابت کے ایک حسین مرقع تھے۔ وہ کلاس میں لکچر دیتے وقت طلبا کو پیچیدہ طرز استدلال سے مرعوب کرنے یا اسباق کے کڑوے گھونٹ پلانے کے بجائے فنی مباحث کو جرعۂ شیریں بنا کر پیش کیا کرتے تھے۔ نجی گفتگو میں بھی ان کا لہجہ نرم و شیریں، الفاظ موزوں و برمحل اور طرزِ ادا ایسی تھی کہ سننے والا اُن کی شگفتہ مزاج طبیعت اور پُر وقار شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اپنے سے بہت چھوٹے لوگوں سے اِس طرح ملتے تھے جیسے وہ لوگ نہ صرف اُن

کے برابر ہیں بلکہ ان سے مرتبہ میں بلند ہیں۔ ایسا ہی معاملہ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ بھی رکھتے تھے جو دراصل اُن کی اپنی عظمت اور طبعی فراخدلی کا ثبوت تھا''۔[۱۸]

حکیم عثمانی مرحوم کی دریادلی اور وسعتِ فکر کا یہ عالم تھا کہ دانشورانِ طب اور علمائے فن کے محاسن بیان کرتے وقت ان کے دل کی کلی کھل جاتی تھی، بالخصوص استادِ محترم کے بارے میں تو وہ انتہائی رطب اللسان نظر آتے ہیں، اس سے بھی اُن کی فنّی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً حکیم صاحب کے مزاج میں جدت اور اختراع پسندی کا ایک خاص انداز پایا جاتا تھا جس کا اظہار ان کے انوکھے طریقِ مطب سے ہوتا تھا۔ آپ کا شمار ہندوستان کے معدودے چند کامیاب اور مصروف ترین یونانی معالجین میں ہوتا تھا۔ اپنی مصروف معالجانہ زندگی کے باوجود طبّی کانفرنس کے اجتماعات، یونانی طب سے متعلق مرکزی وزارتِ صحت کی مختلف کمیٹیوں میں باقاعدگی اور دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے تھے، جہاں اُن کے مشوروں کو بڑی قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حکیم صاحب کی تعلیم وتربیت خالص مشرقی ماحول میں ہوئی تھی، خاندانی پس منظر بھی مشرقی ہی تھا۔ مگر وہ کورانہ تقلید کے قطعاً قائل نہ تھے۔ طبِ یونانی کے تعلق سے وہ ایک ایسے موقف کو اختیار اور عام کرنا چاہتے تھے جس میں مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے تصورات کو جذب کرنے اور پھر بھی اپنی اصلیت پر قائم رہنے کی صلاحیت ہو۔

حکیم عثمانی کی ایک سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اُنہیں علمی وفنی امور میں مسلسل تجسس رہتا تھا، اس سلسلے میں وہ کسی سے استصواب رائے، تحقیق یا استفسار میں عار یا کسرِ شان نہیں محسوس کرتے تھے اور اگر کہیں سے کوئی علمی وفنی نکتہ حل ہوجائے تو اس کا برملا اظہار اور اعتراف بھی کرتے تھے، تحریر میں بھی، تقریر میں بھی۔ اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ وطیرہ ہمیشہ بڑے اطبا کا رہا ہے۔ حسب ذیل واقعہ سے میرے اس دعویٰ کی توثیق ہوتی ہے، جس میں اُنہوں نے اپنے استادِ محترم کی علمی وفنی عظمت کا اظہار کیا ہے:

''شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی، پرنسپل جامعہ طبیہ دہلی نے راقم الحروف کو ایک خط بالفاظ ذیل تحریر فرمایا:

'محبی حکیم عثمانی صاحب براہ کرم تحقیق کرکے مطلع کیجئے کہ 'لُدُ ود' کون سی دوا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم کو بخار آیا تھا، اس میں یہ دوا اُم المومنین حضرت میمونہؓ نے چٹائی تھی۔

عبداللطیف

تحقیق کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان میں حضرت عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب 'لمعات' کا ترجمہ ہورہا تھا، اس کتاب میں کسی حدیث میں لفظ 'لُدُ ود' کا ذکر آیا تھا اور مترجم کو اس کی تشریح بیان کرنی تھی، اُنہوں نے اس کے لیے شفاء الملک مرحوم سے رابطہ قائم کیا تھا، میں نے تقریباً تمام قابلِ حصول طبّی لغات کے اَوراق چھان مارے تھے مگر مجھے کہیں بھی اس کی تشریح نہیں ملی۔ حسنِ اتفاق سے اُن دنوں کسی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ملک کے نامور اطبائے یونانی بلیماران کے طبّی کانفرنس کے دفتر میں جمع تھے، میں نے بشمول علامہ حکیم کبیرالدین متعدد اطباء سے اس اصطلاح کے بارے میں واقفیت چاہی مگر کسی کی طرف سے بھی جواب نہیں ملا۔ علامہ نے مشورہ دیا کہ اپنے استاد سے پوچھو۔ حکیم شکیل مرحوم نے میرے استفسار پر فوراً فرمایا مشکوٰۃ شریف کے باب کتاب الطب اور اس پر حاشیہ مولانا عبدالحئ فرنگی محلی دیکھو، کتاب الطب کو دیکھنے پر معلوم ہوا کہ عرب 'لدود' کے نام سے اُس دواءِ سیّال کو موسوم کرتے تھے، جو ایک گوشۂ دہن سے ڈال کر دوسرے گوشۂ دہن سے خارج کرادی جاتی تھی۔ اس طرح کے عمل میں بالعموم قسط شیرین جیسی دوا سیال شکل میں کام میں لائی جاتی تھی''۔[۱۹]

حکیم محمد عبدالرزاق کے فطری کمالات پر اس طرح گہرافشانی کرتے ہیں:

''حکیم عبدالرزاق صاحب کا نام جب بھی سامنے آتا ہے، یا کبھی تصور یا ان کا خاکہ ذہن میں آتا ہے تو مجھے ایک شعر یاد آتا ہے۔ ؎

بہت ہیں جن کو تمنا ہے زندہ رہنے کی
مگر وہ کم ہیں جو سمجھیں کہ زندگی کیا ہے

دراصل حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم کی ساری زندگی اور اُن کی جدوجہد، اُن کے کارنامے، اُن کے شب وروز کا سفر، اُن کا حضر ایک مسلسل رواں دواں زندگی کے مانند تھا۔ اُنہوں نے زندگی کا آخری لمحہ بھی طب یونانی کی بقا اور ترویج کے لیے صرف کیا۔ دراصل اُن کی پوری زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو نہ صرف اس زندگی کا جو طالب علمی کے بعد کی زندگی ہے، بلکہ اس زندگی کا جو دورانِ تعلیم اُن کی زندگی تھی، تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ شروع ہی سے ایک کشمکش پسند طبیعت اور خصوصیات کے حامل تھے''۔[۲۰]

حکیم عبدالرزاق مرحوم کا ایک بہت بڑا وصف یہ تھا کہ وہ اپنے

ماتحتوں کی عزتِ نفس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ بہت زیادہ خفا ہوئے تو میٹنگ وغیرہ میں تادیباً سخت لہجہ اختیار کرلیا، تاہم قومی یا بین الاقوامی سطح کی مجالس اور سیمینار میں انہیں ماتحتوں کے محاسن بیان کرنے اور صلاحیتوں کے اعتراف میں بڑی سیر چشمی کا ثبوت دیتے تھے۔ مرحوم کے اسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے حکیم عثمانی مرحوم رقم طراز ہیں:

''حکیم عبدالرزاق نے اطبا کے وقار، اُن کی عزتِ نفس کا جتنا خیال رکھا، میں سمجھتا ہوں کہ کم ہی لوگ ہوں گے، جو اس بات کے بارے میں اُن کی برابری اور ہم پلہ ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں''۔[۲۱]

ایک جگہ حکیم عبدالحمید کی کچھ اس انداز میں پیکر تراشی کی ہے کہ اسے ہم زبان وادب کا مرقع قرار دے سکتے ہیں:

''اولوالعزمی، منصوبہ بندی، خوداعتمادی، وضع داری، تحقیق وعلم پروری، طمانیتِ قلب وخدمتِ خلق جیسی صفات عالیہ کے حسین امتزاج کا نام حکیم عبدالحمید ہے۔ نوراللہ مرقدہٗ۔ لفظوں کی مینا کاری اور حرفوں کی صناعی سے اس شخصیت کی معنویت کا ایسا خاکہ کھینچنا جیسا کہ حق ہے، ایک پیکر فکر وعمل مشکل کام ہے''۔[۲۲]

حکیم عثمانی کا مطالعہ بڑا وسیع وعمیق تھا، معالجات کو اُنہوں نے تدریسی مقصد سے منتخب کیا تو زندگی بھر کی رفاقت رہی اور متبادل کے طور پر کسی دوسرے سبجکٹ کو اختیار کر کے تن آسانی کا ثبوت نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مطب کے سلسلے میں اُن کا سکّہ عوام تو عوام خواص تک کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُن کی غیر معمولی صلاحیتوں بالخصوص مطب کی بے مثال کامیابیوں کے سبب مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات سے نوازے گئے۔ تدریس اور مطب کی غیر معمولی مصروفیات کے علاوہ اُنہوں نے میدانِ سیاست میں بھی قدم رکھ دیا اور وہاں بھی اُنہیں سربرآوردہ شخصیت ہونے کا شرف حاصل ہوا، بالخصوص بی، جے، پی دورِ حکومت میں اقلیتی کمیشن کے وائس چیئرمین رہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح اُن کا وقت ضائع ہوا، ایسا نہیں، بلکہ اُس پلیٹ فارم سے بھی بہت سے ملی اور فنی مسائل اپنے ناخن تدبیر سے حل کیے۔

فیضؔ تھی راہ سربسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

گوناگوں مصروفیات کے سبب بلاشبہ اُنہوں نے برائے نام رشحاتِ قلم چھوڑے، لیکن جو ہیں، ان کی روشنی میں بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ایک کامیاب مصنف ومولف کی بھرپور صلاحیت اُن کے اندر موجود تھی، اگر اِدھر کا رخ کرتے تو ان کے ہم عصروں میں شاید ان کا کوئی ہمسر مشکل سے ملتا۔

مظہر سبحان عثمانی نے بھرپور زندگی گزاری، وہ جس محفل میں رہتے تھے علمی وفنی تبحر کا بھرپور ثبوت دیتے رہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے بھی معنیٰ آفریں نتائج اخذ کرلینا اُن کا کمالِ فن تھا۔ طب اور طب سے متعلق انتظامی اُمور کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو چند ثانیے میں حل کردیا کرتے تھے۔

اُن کی علمی وفنی بصیرت کا اندازہ اُن کے اُس انٹرویو کے اقتباس ذیل سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے جسے راقم الحروف نے مرحوم سے براہ راست لیا تھا۔ اس میں طبّی رموز ونکات کی طرف عالمانہ لیکن لطیف اشارے موجود ہیں۔ حکیم عثمانی مرحوم سے سوال کیا گیا کہ 'طبِ یونانی کی پریکٹس سے عام اطباء گریزاں کیوں ہیں؟'۔ تو انہوں نے فرمایا:

''اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر اطبا جو کہ طبیّہ کالجوں سے نکل رہے ہیں، اس فن کی خوبیوں کے ذاتی مشاہدے سے محروم ہیں۔ بیشتر اساتذہ اپنے اپنے ذاتی مطب میں انگریزی ادویات کا استعمال کرتے ہیں اور جب صورتِ حال یہ ہو تو تلامذہ کے ذہن ودماغ میں طبِ یونانی کی معالجانہ افادیت کا مشکوک ہونا ایک امر لازمی ہے۔ طبیّہ کالجوں سے ملحق اسپتالوں میں مریضوں کے علاج معالجہ میں کما حقہٗ طب یونانی کے بنیادی اصولِ علاج پر توجہ نہیں دی جاتی۔ طلبہ کو مطب واصول علاج کے بارے میں جو عملی ٹریننگ دی جاتی ہے وہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یونانی طریقۂ علاج ایک گہرے علم اور وسیع مطالعہ اور تجربے کا متقاضی ہے اور اس کی محرومی کے نتیجے میں نئی نسل کے اطبا میں اس فن پر مکمل اعتماد ویقین نہیں ہوتا اور نتیجے میں وہ انگریزی ادویہ کے استعمال کی راہ پر چل پڑتے ہیں، جو ان کے لیے زیادہ سہل العمل دکھائی دیتا ہے''۔[۲۳]

مخصوصین کی نشست ہو یا خطابِ عام، ان کی محفلوں میں زندگی پائی جاتی تھی، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ 'افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را'۔ جہاں جاتے تھے جانِ محفل بن جاتے تھے، بقول حکیم غلام مہدی رازؔ

نگاہِ حسنِ عالم تاب کے محور میں رہتے تھے
ہم اپنے دور کے ہر خوشنما منظر میں رہتے تھے

حکیم عثمانی مرحوم جس سے ملتے تھے، بڑی خندہ پیشانی سے ملتے تھے، دل بہت وسیع تھا، اسی لیے اُن کے کردار وگفتار سے لوگ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اُن کو دیکھ کر حافظ کا یہ شعر بیساختہ ذہن میں آجاتا

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است

صراحیٔ مئے ناب و سفینۂ غزل است

[اس زمانے میں دو ہی چیزیں خلل سے خالی ہیں، یعنی مے ناب (Pure wine) یا شرابِ معرفت کی صراحی ہو اور غزل ہوتی رہے]

یہی وجہ ہے کہ وہ نہ کسی کی غیبت کرتے تھے اور نہ کسی سے اُنہیں شکوہ تھا۔ زندگی میں جن ناکامیوں اور محرومیوں سے وہ دوچار ہوئے، اس کا ذمہ دار خود کو بتاتے تھے کہ 'ہر چہ بر ماست از ماست' لیکن یافتوں اور فتوحات کو فیضانِ الٰہی سے تعبیر کرتے تھے۔ علمی وفنّی تبحّر کے ساتھ اُن کی اخلاقی خوبیوں کا تذکرہ بھی ضروری ہے، کیونکہ اگر کمالات کے خمیر میں یہ چیزیں شامل نہ ہوں، تو ان میں زیادہ کشش نہیں ہوتی اور قلوب پر دیرس اور دُوررس اثرات مرتب نہیں کرتے۔ اُن کا بڑا وصف اور کمالِ انسانیت اُن کی فروتنی میں پنہاں تھا، وجیہ، دراز قامت اور تدریس کے اعلیٰ مسند پر متمکن ہونے کے باوصف جونیر معاصرین تک سے تواضع سے پیش آتے تھے گویا کہ وہ اُن کے محترم یا ہم قد ہیں، عثمانی صاحب مرحوم کبھی کسی کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ اس طرزِ عمل سے اُن کی عظمت جھلکتی تھی۔ آج کے اطبّا کو اُن کے علمی وفنّی کمالات کے ساتھ ساتھ اُن کے اخلاقی محاسن سے بھی بہرہ ور ہونے کی بہرحال ضرورت ہے۔

حوالہ

۱- نوائے طب وصحت اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۶
۲- دستاویز، ص ۵۸
۳- ذاتی یادداشت
۴- نوائے طب وصحت، ص ۴
۵- دستاویز، ص ۵۸
۶- ایضاً، ص ۵۸
۷- ایضاً، ص ۵۸
۸- ذاتی یادداشت
۹- جہان طب، نئی دہلی، جولائی-دسمبر ۲۰۰۲ء [تکمیل الطب کالج نمبر]، ص ۲۹۹
۱۰- جہانِ طب، نئی دہلی، جون-اگست ۱۹۹۹ء، ص ۱۶
۱۱- ایضاً، ص ۱۸
۱۲- ایضاً، ص ۱۸
۱۳- ایضاً، ص ۱۸
۱۴- ایضاً، ص ۱۹
۱۵- حکیم محمد کبیر الدین، حیات اور کارنامے، ص ۱۴
۱۶- ایضاً، ص ۱۵
۱۷- طب یونانی، مسائل اور وسائل، ص ۱۳۶
۱۸- حکیم شکیل احمد شمسی [شخصیت اور خدمات]، ۱۳۹-۱۳۸
۱۹- ایضاً، ص ۱۴۳-۱۴۲
۱۰- مجاہدِ طب، حکیم محمد عبدالرزاق، ص ۷۵
۲۱- ایضاً، ص ۷۸
۲۲- پیکرِ فکر وعمل حکیم عبدالحمید، ص ۱۵۹
۲۳- نوائے طب وصحت الہٰ آباد، اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۰

مآخذ ومصادر

۱- اشہر قدیر، حکیم، ۲۰۱۳ء، حکیم مظہر سبحان عثمانی، کچھ یادیں، نوائے طب وصحت، الہٰ آباد، جنوری-مارچ ۲۰۱۳، ص ۶-۵
۲- اعظمی، حکیم شفقت، روبرو، نوائے طب وصحت، الہٰ آباد، ج ۴، ش ۴، اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۱۱-۶
۳- اعظمی، حکیم وسیم احمد، ۲۰۰۲ء، تکمیل الطب کالج کے صاحب تصنیف اطباء، جہانِ طب، نئی دہلی، ج ۴، ش ۱، ۲ جولائی-دسمبر تکمیل الطب کالج نمبر، ص ۳۰۱-۲۹۴
۴- عثمانی، حکیم مظہر سبحان، ۱۹۸۷ء، تذکرۂ استاد، حکیم شکیل احمد شمسی [شخصیت اور خدمات] مرتبہ حکیم محمد عبدالرزاق، آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، دہلی-۶، ص ۱۵۰-۱۳۸
۵- عثمانی، حکیم مظہر سبحان، ۱۹۹۵ء، حنین ہندی، حکیم محمد کبیر الدین، حیات اور کارنامے، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی، ص ۱۷-۱۳
۶- عثمانی، پروفیسر حکیم مظہر سبحان، ۱۹۹۹ء، ٹیپو سلطان کا علمی وطبّی ذوق، جہان طب، نئی دہلی، جون-اگست، ج ۱، ش ۱، ص ۲۱-۱۵
۷- عثمانی، پروفیسر حکیم مظہر سبحان، ۲۰۱۰ء، الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے، پیکر فکر وعمل-حکیم عبدالحمید مرتبہ حکیم محمد خالد صدیقی، فراز خالد، ۱۱/۱۱، جوگا بائی ایکسٹنشن، جامعہ نگر، نئی دہلی، ص ۱۶۲-۱۵۹
۸- عثمانی، حکیم مظہر سبحان، ۲۰۱۰ء، حکیم محمد عبدالرزاق، ایک مقناطیسی شخصیت، مجاہدِ طب حکیم محمد عبدالرزاق مرتبہ ام الفضل/سید غلام مہدی، ص ۷۸-۷۵
۹- ہاشمی، ڈاکٹر خاور، ۱۹۹۳ء، حکیم مظہر سبحان عثمانی، دستاویز: ہندوستان میں طبِ یونانی، ماضی، حال، مستقبل، آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، دہلی-۶، ص ۵۹-۵۸
۱۰- ہاشمی، ڈاکٹر خاور، ۱۹۹۸ء، حکیم مظہر سبحان عثمانی، طبِ یونانی [مسائل اور وسائل]، مصنف، ۱۳۸، پرتاپ کھنڈ، وشوکرما نگر، نئی دہلی، ۱۱۰۰۹۵، ص ۱۳۸-۱۳۵

●●●

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

☆پروفیسر رئیس الرحمٰن

'Twelfth Night' میں شیکسپیئر نے عظیم انسانوں کی تین قسمیں بیان کی ہیں: اول، وہ جو پیدائشی طور پر عظیم ہوتے ہیں۔ دوم، جنہیں حالات وحوادث کا بے تکا عمل عظیم بنا دیتا ہے۔ سوم، جو اپنے جذبۂ خدمت گزاری کے ذریعہ عظمت حاصل کرتے ہیں۔ میرے استاذ، حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب [۱۹۳۸ء-۲۰۱۳ء] آخرالذکر قسم سے تعلق رکھتے تھے۔ خدمت گزاری ان کا خاص وصف تھا۔ اسی وصف کے ذریعہ وہ اپنے اساتذہ کے چہیتے بنے، مادرِ علمی کے لائق فرزند قرار پائے، طلبہ کے لیے قابل احترام اور قابل تقلید ہوئے، مریضوں کے مسیحا بنے، اداروں، تنظیموں اور تحریکوں کے روح رواں ثابت ہوئے، سیاست میں مقبول ہوئے اور سب سے بڑھ کر طبِ یونانی کے لیے وجہ افتخار بنے۔

حکیم عثمانی صاحب سے پہلا غائبانہ تعارف ۱۹۸۰ء میں ہوا، جب میں آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی میں تعلیم کی غرض سے داخل ہوا۔ دوپہر کو روزانہ ایک بجے اناٹومی ہال کی جانب سے مطب ختم کرنے کے بعد وہ اپنے گھر جایا کرتے تھے، جو کالج کیمپس میں ہی واقع تھا۔ اُن کو دور سے دیکھنے کا موقع ملتا۔ اس زمانے میں طبّیہ کالج کے بیشتر اساتذہ حکیم عثمانی صاحب کی مخالفت کرتے تھے، جس کی وجہ سے اُن کے بارے میں جاننے کی جستجو ہوئی۔ سب سے پہلے نظری معائنہ ہوا۔ دراز قد، سرخ وسپید رنگت، تیکھے نقوش، مسکراتا چہرہ اور نفیس لباس نے حد درجہ متاثر کیا۔ کبھی قریب سے گزرنے کا اتفاق ہوتا تو اُن کے بے داغ لباس سے اُٹھتی عطر کی خوشبو سے بھی معطر ہو جاتا۔ بعد میں خوشبودار پان کے اعلیٰ مذاق سے بھی واقف ہوا اور یہ بات سمجھ میں آئی کہ خوشبو کی اُن کی زندگی میں خاص اہمیت ہے۔ لباس سے اُٹھے یا باتوں سے آئے؛ ہر صورت میں قریب رہنے والے کو معطر وسرشار کرتی ہے۔

۱۹۸۴ء میں جب میں فورتھ ایئر میں پہنچا تو ایک استاذ کی حیثیت سے اُن کو جاننے کا موقع ملا۔ معالجات اُن کا مضمون تھا، جس کے نظری اور عملی دونوں ہی پہلوؤں پر اُنہیں عبور حاصل تھا۔ مرض سے متعلق تفصیل کو اِس طرح بیان کرتے کہ یونانی نقطۂ نظر واضح ہو جاتا۔ اسباب، علامات اور علاج میں ایک منطقی ربط قائم کرتے۔ Oriental background رکھنے کے باوجود کلاس میں نہایت سائنٹفک انداز میں گفتگو کرتے، قدیم اور جدید دونوں بنیادوں پر مدلل بحث کر کے گفتگو کو معنی خیز بنا دیتے۔

زبان اُن کی ادبی قسم کی تھی، عربی وفارسی کے الفاظ سے آراستہ۔ لہجہ بلند آہنگ تھا۔ خطابت کا رنگ غالب ہوتا۔ آواز کا زیر و بم لکچر کو متاثر کن بنا دیتا۔ کلاس روم میں ایک جگہ جامد نہ رہ کر گردش کرتے رہتے، جس سے اُن کی فعال ومتحرک شخصیت کا اظہار ہوتا۔ کلاس روم میں کوئی رقعہ نہیں لاتے تھے، بلکہ ایسا معلوم ہوتا کہ متعلقہ موضوع پر بھرپور مطالعہ کر کے آئے ہیں۔ علاج کے ذیل میں مختلف نسخہ جات جو عموماً مفردات پر مشتمل ہوتے تھے، تحریر کراتے، وہ بھی شاید اس لیے کہ طلبہ نسخوں کو صحیح طریقے سے لکھ لیں۔ وہ ایک مشفق، ہر دلعزیز اور قابل استاذ تھے۔

☆ایڈوائزر [یونانی]، وزارت آیوش و ڈائرکٹر جنرل، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی

۱۹۸۵ء میں فائنل ایئر پاس کرنے کے بعد عثمانی صاحب سے ایک خاص قربت حاصل ہوئی۔ زمانۂ طالب علمی میں اُن کے زیادہ قریب اس لیے نہیں گیا کہ مبادا اسے اچھے مارکس حاصل کرنے کا ایک حربہ نہ سمجھا جائے۔ میری مطب کی عملی زندگی کا آغاز استاذ محترم کی سرپرستی میں ہوا۔ پھر تو یہ سلسلہ ۱۹۹۸ء میں حکیم صاحب کے ریٹائرمنٹ تک جاری رہا۔ اُن کے ساتھ مطب کرنا میرے لیے علم و افتخار دونوں کا سبب بنا ہے۔ اس زمانے میں عثمانی صاحب کو، اُن کی زندگی کو، اُن کے ماضی کو، اُن کی فکر کو، اُن کی دلچسپیوں کو اور اُن کی ذاتیات کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کم عمری ہی میں والد ماجد، محترم منظور احمد صاحب، کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے تھے۔ ایسے وقت میں اُن کی مکمل سرپرستی والدہ ماجدہ محترمہ حسیب النساء کے حصے میں آئی۔ ایک آسودہ حال، زمین دار خاندان کے چشم و چراغ ہونے کی وجہ سے معاشی تنگیوں سے محفوظ رہے۔ اس زمانے کے شرفا کے ہاں رائج دستور کے مطابق سب سے پہلے والدہ ماجدہ نے حرف شناسی سکھائی۔ قاعدہ سے لے کر عم پارہ کی سورتیں پڑھائیں۔ دینیات کی ابتدائی جانکاری دی، کلموں سے لے کر نماز و روزے کے احکامات سکھائے اور چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرائیں۔ بچپن ہی سے ذہین، مستعد، محنتی، خوش طبع اور حساس تھے۔ بعد کی زندگی میں یہی صفات اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ اُن کی شخصیت کا لازمہ بنیں۔ نہ جانے ایسا اکثر کیوں ہوتا ہے کہ منفرد اور ممتاز شخصیتیں اپنے بچپن میں سب سے عظیم رشتوں [ماں، باپ] کی جدائی کا دکھ جھیلتی ہیں۔ ابھی ماضی قریب میں حکیم عبدالحمید [وفات: ۱۹۹۹ء] اس کی ایک واضح مثال تھے۔ شاید قدرت اسی طرح بعض انسانوں کو عظمت و سربلندی کا راستہ دکھاتی ہے۔ 'ان مع العسر یسرا'۔

مشرقی اتر پردیش کے مختلف مدارس سے علوم شرقیہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد عثمانی صاحب نے تہذیب کے گہوارے لکھنؤ کا رخ کیا اور طب کی تعلیم 'تکمیل الطب کالج' سے مکمل کی، جس کی اہمیت اس زمانے میں صرف تاریخی طور پر ہی نہیں تھی، بلکہ حقیقی معنوں میں وہ طب کا ایک مایۂ ناز ادارہ تھا۔ لکھنؤ کے اعلیٰ تمدن اور قابل اساتذہ کی تعلیم و تربیت نے نہ صرف حکیم صاحب کی صلاحیتوں کو جلا بخشی، بلکہ زندگی کے تئیں ان کے نظریہ کو ایک معنویت بھی دی۔ حکیم شکیل احمد شمسی [وفات: ۱۹۸۵ء]؛ وہ ایک نام ہے جو اُن کی علمی و عملی زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوا۔ یہ نام، عثمانی صاحب ہمیشہ نہایت عقیدت و احترام سے لیتے اور اپنی تمام تر کامیابیوں کو اُنہی کی تربیت اور دعاؤں کا ثمر قرار دیتے۔ اُن کی نذر اپنے مضمون 'تذکرۂ استاذ' میں فرماتے ہیں:

> ''ہر طالب علم کو تحصیل علم کے مختلف المراحل دور میں متعدد اساتذہ فن سے کسب فیض کا موقع ملتا ہے۔ مگر ایسے اساتذہ کم ہوتے ہیں جو مدارس و جامعات کی مقررہ میعاد تعلیم ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنے تلامذہ کی علمی سطح اور فکری رجحان کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے دم آخر تک چشمہ فیض بنے رہتے ہیں۔ ایسے ہی اساتذہ فن کی صف میں ایک قدآور اور دلآویز شخصیت میرے اُستاذ شکیل احمد شمسی کی بھی تھی۔ اُستاذ مرحوم سے اپنے تلمذانہ تعلق کے گزشتہ تیس سال کے طویل زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو اُن کی پُر فیض رفاقت، بے پایاں محبت اور گرانمایہ سرپرستی کے آگے سر نیاز خم ہو جاتا ہے''۔

عثمانی صاحب کا مطب مرجع خلائق ہوا کرتا تھا۔ لکھنؤ اسکول کے پروردہ و نمائندہ تھے۔ آپ کے نسخے مفرد اور سہل الحصول ادویہ پر مشتمل ہوتے تھے جن میں اجزاء بھی زیادہ نہ ہوتے۔ حسب ضرورت مرکبات کا استعمال بھی کراتے، لیکن تاکید مفرد ادویہ پر ہی ہوتی۔ یونانی دوا ساز اداروں میں دواخانہ، طبّیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تیار کردہ مرکبات کے معیار سے مطمئن رہتے تھے۔ غیر معیاری ادویہ کبھی تجویز نہ کرتے، بھلے ہی اس کے لیے اصرار کیا جائے۔ مطب کی سب سے بڑی خصوصیت میری نظر میں، اُن کی بے خطا تشخیص تھی۔ ہر معالج پر یہ بنیادی حقیقت واضح رہنی چاہیے کہ دوا کی تجویز خواہ مفرد ہو یا مرکب، اس وقت تک بے نفع ہوگی جب تک اس کا محل استعمال درست نہ ہو۔ صحیح تشخیص کامیاب علاج کی ضمانت ہوتی ہے۔ عثمانی صاحب اس اصول پر نہ صرف خود کاربند رہے بلکہ اپنے شاگردوں کو بھی اس کی تلقین کرتے رہے۔ ذرائع تشخیص کے انتخاب میں بھی گو وسیع المشربی کے قائل تھے، لیکن کلاسیکی طریقوں پر اُن کا اعتماد اگلے

وقتوں کے اُن حاذق اطباء کی یاد دلاتا تھا، جو میکانیکی آلات کی مدد کے بغیر ہی حیرت انگیز تشخیص کیا کرتے۔ تشخیص کے پورے عمل میں جہاں اُن کا خاص انحصار روداد مرض اور معائنہ مریض پر ہوتا وہیں اطباء قدیم کے کلینکی مشاہدات بھی اُن کے پیش نظر رہتے۔ دونوں کے امتزاج ہی سے اچوک تشخیص ممکن ہو پاتی۔ مریض سے استفسار کرتے وقت اُس کے کھانے پینے کی عادات اور معمولات کو خاص طور پر دریافت کرتے اور نسخے کی تجویز کے وقت درجۂ مرض کا بھی خیال رکھتے۔ مزمن و پیچیدہ امراض کے علاج میں ملکہ حاصل تھا۔ مریض دور دور سے اُن کے پاس بڑی آس لے کر آتے اور بفضلہٖ مایوس واپس نہ لوٹتے۔ اُنہوں نے سلعاتِ رحم کے متعدد کامیاب علاج کیے۔

طبِ یونانی سے متعلق تو معلومات کا ایک سمندر ان میں موجزن تھا ہی، آیورویدکی مستند کتابیں بھی اُن کے مطالعے میں رہتی تھیں۔ گویا اپنے کالج [آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج] کی روایتوں کے صحیح معنوں میں امین تھے۔ دونوں طبوں کے مابہ الامتیاز پر گہری نظر تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس سمت میں آج بھی نہ صرف طلبہ، بلکہ اساتذہ و محققین کو بھی صحیح رہنمائی کی ضرورت ہے۔

حکیم عثمانی صاحب کثیر المطالعہ تھے۔ طب کے علاوہ ادب، تاریخ، اسلامیات اور دیگر موضوعات کی منتخب کتابیں اُن کے ذاتی ذخیرے کا حصہ تھیں۔ طب یونانی کی کلاسیکی کتابوں پر گہری نظر تھی اور رازی کی تصانیف کو خاص طور پر پسند فرماتے تھے۔ ایک ماہر فن طبیب کی تحریروں سے شاید اُنہیں زیادہ ذہنی مناسبت تھی۔ تدریسی ذمہ داریوں، مطب کی پابندی، معاشرتی تقاضوں، تنظیمی سرگرمیوں اور خانگی مشاغل کو بخوبی نباہتے ہوئے قلم و قرطاس کے لیے بھی عثمانی صاحب نے وقت نکالا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُنہوں نے زیادہ کچھ نہیں لکھا، لیکن جو لکھا اُس میں اُن کا خاص رنگ نمایاں ہے۔ 'ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات' اپنے منفرد موضوع کے اعتبار سے ایک وقیع نگارش ہے۔ 'تذکرہ استاذ'، ایک طالب علم کا اپنے استاذ کو پیش کیا جانے والا خراج عقیدت ہے۔ 'حنین ہندی — زبدۃ الحکماء علامہ حکیم محمد کبیر الدین'، حکیم کبیر الدین کی علمی و فنی خدمات کا اعتراف ہے۔ حکیم عبدالحمید اور حکیم عبدالرزاق اُن کے قدر شناس اور ستائش گر تھے۔ دونوں کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار عثمانی صاحب نے مضامین کی شکل میں کیا۔ اس کے علاوہ بھی اُن کی طبّی، ادبی اور صحافتی تحریریں ہیں جنہوں نے اہلِ علم سے دادِ تحسین حاصل کی ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں نے اُن سے زندگی کے بہتیرے اسرار و رموز سیکھے، لیکن تقریر و تحریر کا اُن کے جیسا انداز میرے حصہ میں نہ آیا۔ قدرت سے اُن کو خطابت کی اعلیٰ صلاحیت ودیعت ہوئی تھی۔ پر جوش اور مدلل تقریر کرتے جس کا خاص و عام دونوں پر یکساں اثر ہوتا۔ غالباً ۱۹۹۱ء کی بات ہے، آئی ٹی او، نئی دہلی میں حکیم اجمل خاں کی شخصیت پر اس وقت کے صدر جمہوریہ، گیانی ذیل سنگھ کی صدارت میں ایک پروگرام ہوا، جس میں عثمانی صاحب نے حکیم اجمل خاں پر نہایت پر مغز اور معنی آفریں مقالہ پیش کیا۔ پروگرام کے اختتام پر گیانی ذیل سنگھ نے صدارتی کلمات کے دوران کہا کہ حکیم عثمانی نے حکیم اجمل خاں کی شخصیت پر اس قدر نکتہ آفریں اور سنجیدہ گفتگو کی گویا کہ 'گاگر میں ساگر بھر دیا'۔

علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ حکیم مظہر سبحان عثمانی کا سیاسی شعور بہت بیدار تھا۔ ہر میدان میں وہ نئی راہ نکالنے کا ہنر جانتے تھے، ۱۹۶۶ء میں ہی 'جن سنگھ' کی رکنیت قبول کر لی تھی۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے متعدد عہدوں کو عزت بخشی، نیز اس سے وابستہ بڑی شخصیات مثلاً اٹل بہاری واجپئی، لال کرشن اڈوانی، مدن لال کھورانا، وجے کمار ملہوترا اور کیدار ناتھ ساہنی کے ساتھ اُن کے دیرینہ اور گہرے روابط تھے۔ ۲۰۰۳ء میں قومی اقلیتی کمیشن کے نائب صدر بھی منتخب ہوئے اور ۲۰۰۶ء تک اس منصب عالی پر فائز رہے۔ مزاج میں جرأت و بے باکی تھی، جس کو حق سمجھا اس پر ڈٹے رہے، نہ ریاضت سے دامن بچایا، نہ مقابلے سے آنکھ چرائی، عزتِ نفس اور اصولوں پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔

عثمانی مرحوم مجھ سے غایت درجہ شفقت اور مودّت رکھتے تھے۔ اُن کی محبت اور اعتماد کا یہ عالم تھا کہ مجھ کو اپنے ذاتی اور نجی معاملات میں برابر شریک کرتے، یہاں تک کہ میری رائے کو اپنے اہل و عیال پر ترجیح دیتے۔ بچوں کو جب اپنی کوئی بات منوانی ہوتی تو وہ مجھے اپنا شفیع بناتے۔ اُن کی پوتی 'ثنا' اپنے دادا کو پیار میں 'ددّو' کہتی تھی۔ از روئے مذاق، میں جب کوئی بات کہتا کہ اپنے ددّو سے میری یہ بات کہہ دینا تو وہ کہتی کہ وہ میرے

ددّو کہاں ہیں وہ تو آپ کے ہیں۔ آپ نے میرے ددّو کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ میرے نکاح کے وقت سب سے پہلے اُنہوں نے مجھ کو اپنے گلے لگایا اور بہت ساری دعاؤں اور نیک تمناؤں سے نوازا۔ ۲۰۱۱ء میں اُن کو قلب کی شدید تکلیف ہوئی، مجھ سے آکسیجن سلنڈر کے انتظام کے لیے کہا، اس وقت میں نے اُن کے مرض کی تشخیص LVF کی حیثیت سے کی اور اسکارٹ ہارٹ انسٹی ٹیوٹ میں داخل کرایا۔ جب بھی اُن کو یا اُن کے اہل وعیال میں سے کسی کو کوئی عارضہ لاحق ہوتا تو وہ سب سے پہلے مجھ سے مشورہ طلب کرتے۔ یہ اُن کا مجھ ناچیز پر غایت درجہ ایقان تھا۔ اُن کی By Pass Surgery کے وقت گھر کے سارے ہی افراد نے اُن کو سرجری کرانے کے لیے راغب کیا لیکن وہ تیار نہیں ہوئے بالآخر جب میں نے اُن سے کہا کہ سرجری کروالیں، اس سے نہ صرف آپ کو بہت سے عوارض سے رستگاری ملے گی، بلکہ طبعی عمر کے سفر کو طے کرنے میں بھی آسانی ہوگی تو وہ فوراً تیار ہو گئے اور سرجری کے لیے اسپتال میں داخل ہوگئے۔ دریں اثنا pulse oximeter کی وجہ سے آپ کی دو انگلیوں میں تیرگی [Gloomy] ہوگئی تھی۔ اسپتال میں موجود ڈاکٹروں نے amputation کی صلاح دی، فوراً اُنہوں نے مجھ سے مشورہ کیا۔ میں نے کہا کہ ابھی انتظار کرتے ہیں اور ساتھ ہی یونانی علاج کی بھی مدد لیتے ہیں، چنانچہ لگاتار ایک مہینے تک سیندھا نمک کے پانی کی سنکائی اور روغن خردل کے طلا سے نہ صرف نیلگونی رفع ہوگئی بلکہ انگلیوں میں حرکت عود کر آئی۔

سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن کی سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی کے رکن ہونے کے ساتھ اس کی کلینکل ریسرچ سَب کمیٹی کے چیئرمین رہے۔ اس کے علاوہ بہت سی دیگر اہم کمیٹیوں سے بھی اُن کی وابستگی رہی۔ کسی بھی میٹنگ سے قبل اس کے ایجنڈے پر مجھ سے بحث کرتے اور پھر میٹنگ میں شریک ہوتے۔ ۲۰۰۰ء میں وہ قرول باغ سے اپنے نئے گھر [روہنی] میں منتقل ہوئے، لیکن اکثر و بیشتر یا تو وہ میرے گھر تشریف لاتے یا مجھے بلوا لیتے۔

جب اُن کا تقرر قومی اقلیتی کمیشن کے نائب صدر کی حیثیت سے ہوا تو اس کی جوائننگ کے وقت بھی میں اُن کا رفیق تھا۔ ۲۰۱۱ء میں سی سی آئی ایم کے الیکشن میں دہلی کی نمائندگی کے طور پر حکیم احمد یٰسین صاحب نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ امیدوار بنیں، ہم تمام ہی اساتذہ کا مکمل تعاون آپ کے ساتھ رہے گا، میں نے بھی غور وخوض کے بعد خود کو تیار کرلیا۔ آخر میں، اپنے مشفق، مربی ومحسن سے مشورہ کیا تو اُنہوں نے نہ صرف حکم امتناع دیا، بلکہ یہ بھی کہا کہ آئندہ آپ کسی بڑے منصب پر فائز ہونے والے ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد میرا وزارتِ صحت میں ایڈوائزر [یونانی] کے عہدہ کے لیے انٹرویو ہوا اور الحمد للہ میں اس میں کامیاب ہوا، تاہم میری جوائننگ سے ٹھیک ایک مہینہ پہلے وہ اپنی حیاتِ مستعار پوری کر کے اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ 'انا للّٰہ و اِنّا اِلیہ راجعون'۔ انتقال سے پندرہ روز قبل مجھے اپنے پاس بلوایا اور مختلف امور سے متعلق کچھ اس طرح ہدایات دینے لگے جیسے ان کو احساس ہو چلا تھا کہ وقت رخصت قریب ہے۔ اپنے بچوں کا خیال رکھنے کو کہا، تجہیز وتکفین کے بارے میں ہدایتیں دیتے ہوئے اپنی آخری آرام گاہ کی نشان دہی بھی کی۔

زندگی کے ہر مجال میں حکیم عثمانی صاحب صفِ اول میں شامل رہے۔ طبابت کی تو دستِ شفا کی ضمانت بنے۔ صحافتی ذمہ داریاں نباہتے ہوئے اُن کا بے باک قلم نشتر بن گیا۔ تدریس کو اختیار کیا تو ہر دلعزیزی کی نئی تاریخ رقم کی۔ تنظیمی وانصرامی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ریسرچ وتحقیق میں رہنما ہوئے۔ سیاست کا رخ کیا تو وہاں بھی منفرد اور موثر رہے۔ اُن کی ہمہ جہت خدمات کا بجا طور پر اعتراف بھی کیا گیا۔ ملازمت سے سبکدوشی سے چند ماہ قبل پروفیسر ایمریٹس کے اعزاز سے سرفراز ہوئے۔ غالباً پہلا موقع تھا جب طبِ یونانی کے کسی استاذ کو اس بڑے اعزاز سے نوازا گیا۔ ۱۹۹۸ء میں دہلی حکومت کے 'اسٹیٹ فزیشین ایوارڈ' سے سرفراز ہوئے، جسے اُس وقت کے وزیر اعلیٰ جناب صاحب سنگھ ورما نے تفویض کیا۔

فروری ۲۰۱۵ء سے تادم تحریر ڈائرکٹر جنرل سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی اضافی ذمہ داری بھی مرے کاندھوں پر ہے۔ استاذِ محترم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے میری تمام کاوشیں طبِ یونانی کی سربلندی کے لیے وقف ہیں۔ اُن کی دعاؤں کے طفیل رحمتِ خداوندی سے امید ہے سرخ روئی حاصل ہوگی۔ میری کامیابیوں پر مسرور ہونے اور نئی منزلوں کی رہنمائی کے لیے وہ میرے ساتھ نہیں ہیں، اس کا مجھے ہمیشہ ملال رہے گا۔

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی

☆پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن

صدرالاطباء حکیم الیاس خاں کے انتقال [۲۶ فروری ۱۹۶۳ء] کے بعد جامعہ طبیّہ، دہلی براہ راست حکیم عبدالحمید کی تحویل میں آیا۔ اگرچہ حکیم الیاس خاں نے اپنی زندگی ہی میں جامعہ طبیّہ کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے کی خاطر ادارہ ہمدرد کے حوالہ کردیا تھا اور اس کے تمام مصارف ۱۹۴۹ء سے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن برداشت کر رہا تھا، لیکن حکیم الیاس خاں کی حیات میں کالج، ان کے مجوزہ نظام اور ان کی منشا وضابطہ کے تحت چل رہا تھا۔ اساتذہ کے عزل ونصب سے لے کر کالج کے دوسرے امور میں ادارہ ہمدرد کی کوئی مداخلت نہیں تھی۔ کالج میں شبینہ کلاسوں کا نظم تھا۔ دن میں بھی اگرچہ کلاسیں ہوتی تھیں، لیکن طلبہ کی زیادہ تعداد کا تعلق شبینہ درجات سے تھا۔ جو طلبہ داخل ہوتے تھے، وہ دن میں کہیں ملازمت، کاروبار اور دوسرے غیر درسی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ایک جز وقتی ادارہ کی حیثیت تھی۔ آٹھ نو اساتذہ تھے اور کم وبیش غیر منقسم پنجاب کے اداروں جیسا اس کا حال تھا۔

براہ راست ادارہ ہمدرد کے زیر انتظام آنے کے بعد حکیم عبدالحمید نے کالج کی ترقی وتوسیع کا ایک بڑا منصوبہ تیار کیا اور کالج کو پرانی ڈگر سے ہٹ کر نئے نظم ونسق کے تحت لانے کے اہتمامات شروع کیے۔ سب سے پہلے اُنہوں نے اس کے لیے ایک تجربہ کار منتظم کی تلاش کی، جو کالج کو ملک کے دیگر ممتاز طبّی کالجوں کی صف میں کھڑا کرے اور اسے اعلیٰ معیار بخشے۔ اس کے لیے اُن کی نگہِ انتخاب برصغیر کے نامور طبّی ماہر تعلیم شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی پر پڑی۔ جو تقریباً دو برس قبل طبیّہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی پرنسپل شپ سے سبکدوش ہوئے تھے۔ شفاء الملک کے لیے اپنے مرتبہ اور مزاج کے لحاظ سے اس کی قبولیت آسان نہیں تھی۔ حکیم عبدالحمید نے اُن سے اس سلسلہ میں خط وکتابت کے علاوہ پہلے ہمدرد کے معاون متولی مولانا قاضی سجاد حسین کو لکھنؤ بھیجا، پھر حکیم محمد عبدالرزاق جو اُس زمانہ میں ہمدرد کی ملازمت میں تھے، لکھنؤ گئے اور شفاء الملک سے اس نئے ادارہ کی تعمیر وترقی کے علاوہ آصف علی روڈ پر قائم ہونے والے ہمدرد نرسنگ ہوم میں یونانی مطب کی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے اصرار کیا اور ان دونوں اداروں کے ذریعہ طبّی تعلیم اور طبّی معالجہ سے طب یونانی کے حق میں بننے والی فضا پر گفتگو کی۔ شفاء الملک نے اپنے برادر اکبر شفاء الملک حکیم عبدالمعید اور اپنے مخلص دوست ڈاکٹر ذاکر حسین سے اس سلسلہ میں مشورہ چاہا۔ ذاکر صاحب کا ان کے نام ایک خط میرے پاس محفوظ ہے، جس میں ذاکر صاحب نے اس منصب کو قبول کرنے میں دوسرے فائدوں کے ساتھ اس فائدہ کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس طرح دہلی قیام کی وجہ سے ان سے قربت اور ملاقاتوں کا سلسلہ رہے گا۔

اگست ۱۹۶۳ء میں شفاء الملک نے دہلی پہنچ کر جامعہ طبیّہ کی پرنسپل شپ کا چارج لیا۔ سب سے پہلے اقدام کے طور پر اُنہوں نے نئے اساتذہ

☆ صدر ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ

کی تقرری ضروری سمجھی۔اس وقت کالج کا کل اسٹاف حکیم محمد مبین، حکیم رام لبھایا، حکیم اندر سین سچدیو، حکیم مایا رام، حکیم جے گوپال کھنہ، حکیم ضیاء الحسن، روشن لال گپتا [سائنس ٹیچر]، مولانا عبدالدائم جلالی [عربی ومنطق، فلسفہ]، بخشی امرناتھ [لائبریری وآفس] پر مشتمل تھا۔ستمبر میں اُنہوں نے بھوپال سے مجھے طلب کیا اور میں نے تدریسی فرائض انجام دینے شروع کیے۔ دوسرا تقرر میرے ایما سے حکیم عبدالجبار خاں کا ہوا۔ چند ماہ بعد لیکچرر کی ایک اور جگہ کے لیے اُنہوں نے حکیم شکیل احمد شمسی، لکھنؤ سے مشورہ کیا۔ شکیل صاحب نے اپنے ایک شاگرد حکیم مظہر سبحان عثمانی کا نام تجویز کیا اور حکیم مظہر سبحان عثمانی جامعہ طبیّہ میں لکچرر مقرر ہوئے اور معالجات کے علاوہ فرائض مطب اُن کے سپرد کیے گئے۔اُنہوں نے بڑی کامیابی سے یہ دونوں فریضے انجام دیے۔مطب میں مریضوں کی تعداد بڑھی اور ایک اچھے استاد کی حیثیت سے اُنہوں نے درسی سلسلہ جاری کیا۔ہم تین افراد چونکہ باہر سے آئے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ہم لوگوں میں زیادہ یگانگت تھی۔ شفاء الملک نے ایک برس سے زیادہ مدت نہیں گزاری تھی کہ ۱۹۶۴ء میں وہ قلب کے شدید عارضے میں مبتلا ہوئے اور بالآخر اُنہوں نے وطن مراجعت فرمائی۔ادارہ کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کے لیے خاص طور پر یہ ایک آزمائش کا موقع تھا۔ نئے نظام میں ہم لوگ کھٹک رہے تھے اور ہمارے لیے حالات بہت ناموافق تھے۔اس نازک صورتحال نے ہمیں ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب کر دیا تھا۔اسی درمیان حکیم مظہر سبحان عثمانی پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے گئے اور ان کے خلاف طلبہ کی طرف سے زبردست اسٹرائک ہوئی۔ میں اُن کی حمایت میں سب سے پیش پیش تھا، میں نے اُن کی موافقت میں زبردست مہم چلائی اور بالآخر اسٹرائک کو ناکام بنایا۔اس اسٹرائک نے کچھ فرقہ وارانہ شکل اختیار کر لی تھی۔مگر خدا کے شکر سے اس آزمائش میں ہم لوگ پورے اُترے۔

مظہر سبحان عثمانی میرے بہت اچھے دوست تھے۔دوستی کے اس دائرہ میں حکیم شجاع الدین بھی شریک تھے۔وہ ہمدرد دواخانہ میں طبیب تھے۔اُن کی حیثیت حکیم عبدالحمید کے طبیب پیشی کی تھی۔اتفاق سے اُن دنوں ہم تینوں دہلی میں تنہا رہتے تھے اور ہمارے مثلث کو کالج اور دلی کے طبّی حلقوں میں کافی اہمیت دی جاتی تھی۔حافظ ہوٹل، بلی ماران میں تینوں اکثر دوپہر اور رات کا کھانا ساتھ کھاتے تھے۔اس کے بعد چہل قدمی کرتے ہوئے چاندنی چوک، جامع مسجد اور بعض روز دریا گنج تک نکل جاتے تھے۔کبھی کبھی نثار احمد فاروقی اور سید علی غلام سمنانی بھی شریک ہوتے تھے۔حکیم عبدالرحمٰن کا مطب بلی ماران میں شریف منزل کے نیچے ہندوستانی دواخانہ کے سامنے تھا۔ وہاں شام کی بیٹھک لازمی تھی۔ خاص طور پر رات کے کھانے سے قبل وہاں ہم لوگ جمع ہوجاتے تھے۔کبھی کبھی سلطان یار خاں وکیل، مولانا حفظ الرحمٰن کے صاحبزادہ محمد اسلم صدیقی، حکیم عبدالرحیم رحمانی، مولنا عزیز الرحمٰن جامعی بھی آجاتے تھے۔اتوار کو لازمی طور پر دہلی کی سیر کا پروگرام بنتا تھا۔کبھی قطب مینار، کبھی اوکھلا ہیڈ، کبھی ہمایوں کے مقبرہ، لودھی گارڈن، کناٹ پلیس، انڈیا گیٹ، تغلق آباد، لال قلعہ اور دہلی کی دوسری تاریخی عمارتیں ہماری منزل ہوتیں، کوئی اتوار ناغہ نہیں جاتا تھا۔راستہ میں حکیم شجاع الدین کے ساتھ نت نئی تفریحیں، چھیڑ چھاڑ، لطیفوں اور چٹکلوں کا سلسلہ رہتا تھا۔ بعد میں جامعہ طبیّہ میں حکیم جمیل احمد کا تقرر ہوا، وہ بھی اکثر ہمارے ان تفریحی پروگرام میں شریک رہتے تھے۔میرے قیام دہلی ۱۹۷۰ء تک یہ سب آخر تک جاری رہا اس کے بعد یہ رونقیں اور دوستوں کی یہ محفلیں قائم نہیں رہیں اور سب منتشر ہوگئے۔ان سے وابستہ بے شمار یادوں کا ایک سلسلہ ہے۔کیا خوشگوار دن تھے۔وہ بے تکلف مذاق، لطفِ صحبت اور ہنسی خوشی کا ماحول پھر کہیں کبھی میسر نہیں آیا۔

میں علی گڑھ آگیا۔حکیم عبدالجبار خاں طبیّہ کالج قرول باغ چلے گئے۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی کا پہلے ہندوستانی دواخانہ میں بطور طبیب انچارج اور بعد میں طبیّہ کالج قرول باغ میں بحیثیت لکچرر تقرر رہوا۔دہلی کے اکثر سفروں میں اُن سے ملاقات رہتی تھی۔کبھی طمانیت اور سکون کے اُن دنوں کا ذکر آتا تو دیر تک ہم لوگ محظوظ ہوتے اور یادوں کو تازہ کرتے تھے۔قرول باغ کے مخصوص ماحول میں وہ ایک سیاسی پارٹی میں شامل ہوگئے۔اس پارٹی کے بنیادی نظریات سے مجھے شدید اختلاف تھا۔ میں نے اُنہیں اُس سے دور رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی، لیکن وہ اس میں بہت الجھ چکے تھے اور کافی آگے جا چکے تھے۔اُن کے لیے چاہتے ہوئے بھی اب اس سے نکلنا آسان

نہیں تھا۔ وہ جب دہلی آئے تھے تو داڑھی تھی اور شیروانی پہنتے تھے۔ گہرے مذہبی خیالات کے آدمی تھے۔ میرے خیال میں مجھ سے زیادہ کسی شخص نے اُنہیں اُس جماعت اور اُس کے تحت ایک دوسرے اثر سے باز رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ دوسرا اثر ان کی صحت کے لیے سخت مضر اور بالآخر جان لیوا بھی ثابت ہوا۔

میں نے ابن سینا اکاڈمی کے قیام کی اطلاع دی تو بہت خوش ہوئے اور بڑی خوشی دلی سے اپنی کافی کتابیں اکاڈمی کو عطا کیں۔ اُن کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادہ عزیزی دانش نے جو طبیّہ کالج، علی گڑھ کے فارغ ہیں، اپنے والد سے میرے گہرے ربط و رشتہ کی بناء اُن کی باقی کتابیں نہ صرف اکاڈمی کو پیش کیں، بلکہ ایک بڑی بات یہ کہ دہلی سے علی گڑھ تک ان کی ترسیل کے اخراجات بھی برداشت کیے۔ اُن کی یہ سعادتمندی اور تعلقِ خاطر میرے لیے باعثِ مسرت ہے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی بہت ذہین، طبّاع اور معاملہ فہم تھے۔ فوراً مسئلہ کی تہہ تک پہنچ جاتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا ذوق اور مطالعہ وسیع تھا۔ صمد پور، ضلع گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ گورکھپور سے درسیات کی تکمیل کے بعد تکمیل الطب کالج میں طب کی تعلیم کے لیے داخل ہوئے تھے۔ وہاں کالج کے طلبہ میں ممتاز رہے۔ کالج کے اساتذہ میں حکیم شکیل احمد شمسی سے اُنہیں بہت تعلق تھا، یہ تعلق آخر تک برقرار رہا۔ حکیم سید محمد فاروق اور حکیم سید علی حیدر جعفری اُن کے ساتھیوں میں تھے۔

وہ ایک اچھے مقرر اور زبان داں تھے۔ ہر موضوع پر روانی سے بولتے تھے۔ تقریر کی وہ ساری خوبیاں اُن کے یہاں پائی جاتی تھیں، جن کی ایک بلند پایہ مقرر سے توقع کی جاتی ہے۔ اُن کی تقریروں کو میں نے ہمیشہ پسند کیا اور ستائش کی۔

لکھنؤ کی فضائے شعری میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا۔ اچھے خاصے شعر کہتے تھے۔ عام مشاعروں میں ضرور حصہ لیتے تھے۔ کلام محفوظ کرنے کے اہتمام کا معلوم نہیں۔ کافی غزلیں کہی تھیں۔ اگر اُن کی یاد داشتوں سے انہیں جمع کیا جا سکے تو ایک اچھا شعری مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے۔

ان کے تصنیفی کاموں میں ایک مختصر سا رسالہ 'ٹیپو سلطان کے معالجاتی و تکنیکی تجربات' ہے۔ جنوری ۱۹۷۳ء میں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کا نواں سالانہ اجلاس بنگلور میں منعقد ہوا۔ وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھیں۔ اُن کی وجہ سے یہ کانفرنس کا ایک تاریخی اجلاس تھا۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی، راقم سطور اور دوسرے احباب اُس میں شرکت کے لیے بنگلور گئے۔ میسور، سرنگا پٹنم اور بنگلور کے تاریخی مقامات کی سیر کا ہم لوگوں نے خوب لطف اُٹھایا۔ وہاں کے دوران قیام حکیم مظہر سبحان عثمانی کو ٹیپو سلطان سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اُنہوں نے ٹیپو سلطان کے تعلق سے ایک مضمون لکھنا شروع کیا۔ میں نے خاص طور پر اس کو پسند کیا اور اسے مفید اضافات کے ساتھ ایک علاحدہ رسالہ کی شکل میں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے ''مجلس تحقیقاتِ طبّی'' قائم کر کے اس کے زیر اہتمام اس رسالہ کو دسمبر 1976 میں شائع کیا۔ بعد میں اپنی سیاسی و معالجاتی مصروفیتوں کی وجہ سے وہ اس مجلس کو باقاعدہ کوئی وجود نہیں دے سکے۔ یہ اُن کے حوالہ سے ایک قابلِ قدر بات ہوتی۔ اُن میں بڑی صلاحیتیں تھیں۔ علمی و تصنیفی کاموں کی طرف اگر اُن کی توجہ رہتی تو طب کے اعلیٰ کام اُن سے انجام پا سکتے تھے۔ یہ مختصر رسالہ اُن کے علمی ذوق کا آئینہ دار ہے۔ اسے اُنہوں نے ٹیپو سلطان سے متعلق بہت سی انگریزی، فارسی اور اردو کتابوں کو پڑھ کر تالیف کیا ہے۔ اُن کے حوالوں کی فہرست سے مواد کی تلاش میں اُن کی کاوشوں کا اظہار ہوتا ہے۔

ہر انسان میں کچھ نہ کچھ کمیاں ہوتی ہیں۔ ہم سب غرقِ عصیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اُن کی کمزوریوں سے درگزر فرمائے اور اُن کے درجات بلند کرے۔

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی — 'جس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا'

☆پروفیسر عبدالحق

ریاض خیرآبادی اردو میں خمریات کے اکیلے شاعر ہیں۔ باقی برائے بیت۔ یوں غزل کی نسبت سے شراب کی سرمستی و سرشاری کا ذکر تقریباً ہر شاعر کے یہاں موجود ہے۔ مفکر شاعر اقبال بھی روایت سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اگرچہ ان کے نشاط و کیف کے احوال مختلف ہیں۔ جیسے ع

کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
پلادے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
وہ مے جس سے روشن ضمیر حیات
وہ مے جس سے ہے مستیٔ کائنات

یا 'زبورِ عجم' کی مشہور غزل:

از چشمِ ساقی مست شرابم
بے مے خرابم، بے مے خرابم

ریاض نے بھی روایتاً پاسداری کی۔ ان کے تمام تجربے تخیلی اور تصوراتی ہیں۔ وہ بھی حافظ شیرازی کی طرح موجِ مے کا تماشا لبِ ساحل سے دیکھتے رہے۔

مگر بزرگوں کے اس قول سے خوف زدہ بھی تھے۔

اگر خواہی سلامت بر کنار است

ریاض کا یہ شعر جب بھی یاد آتا ہے تو نہ جانے کیوں گورکھپور کی جامع مسجد اور اس کے اطراف، قلبِ شہر کا ہجوم اور ہنگامہ ہائے زندگی کا اضطراب ایک خلش بن کر احساس کو سراسیمہ کرتا ہے۔ شعر یہ ہے۔

خدا کے ہاتھ ہے بکنا نہ بکنا مے کا اے ساقی
برابر مسجدِ جامع کے اب ہم نے دکاں رکھ لی

ریاض گورکھپور کی گلیوں میں گزری ہوئی جوانی کو بڑی حسرتوں سے یاد کرتے ہیں۔ راقم کے تیرہ سال گورکھپور میں گزرے۔ حصولِ علم کے سوا میری حسرتوں کی پامالی کا یہ عہدِ شباب تھا۔ والدین سے دوری نے اذیتوں میں اضافہ کیا۔ ۱۹۵۵ء میں ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد تایا اشرف علی مرحوم کی خواہش پر مزید تعلیم کے لیے گورکھپور جانا پڑا۔ انہیں بہترین کارکردگی کی وجہ سے خاں صاحب کے سرکاری خطاب سے نوازا گیا تھا وہ کورٹ آف وارڈ کے اسپیشل منیجر کے عہدے سے سبک دوش ہوئے تھے۔ شہر کے رؤسا و اکابرین سے خوش گوار مراسم تھے۔ بلاقی پور میں نواب زادہ علی قدیر۔ آئی۔ پی۔ ایس کی کوٹھی میں قیام تھا۔ کچھ دنوں بعد ہم لوگ الہداد پور کے ذاتی مکان میں منتقل ہوگئے تھے۔

یہاں سے جامع مسجد بہ مشکل ایک فرلانگ کے فاصلہ پر تھی۔ وہاں عصر و مغرب کی نمازیں ادا کرنا تقریباً میرا معمول بن گیا تھا۔ جامع مسجد کے امام خود ایک حکیم حاذق اور بڑے بزرگ انسان تھے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر حکیم وصی مرحوم کا کشادہ مطب تھا۔ وہاں مریضوں اور مبلغوں کی بھیڑ رہتی کیونکہ وہ امیر جماعت اور خوش دل و گرم اختلاط انسان تھے۔ سردیوں میں نزلہ و زکام سے محفوظ رہنے کے لیے یہ میری پناہ گاہ تھی۔ ۱۹۶۱ء میں ایم اے کا طالب علم تھا۔ کبھی کبھی استاذی پروفیسر محمود الٰہی اور ڈاکٹر عبدالسلام سندیلوی بھی حکیم صاحب کے مطب میں تشریف لاتے۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب

☆پروفیسر ایمریٹس، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ہفتوں بے خواب راتیں گزارتے، علاج سے بہت کم افاقہ ہوتا۔ غالباً یہیں کسی محفل میں حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کا نام آیا۔ یہیں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا نام بھی سنا۔

۱۹۶۵ء میں دہلی آیا۔ ڈاکٹر فضل الحق مرحوم بھی گورکھپور سے آتے تھے۔ وہ مجھ سے سینئر تھے۔ انہوں نے بہت سے گورکھپوریوں سے ملاقات کرائی۔ مگر وہ عثمانی صاحب سے واقف نہ تھے۔ ناچیز نے بھی نو وارد اور غریب شہر کی طرح کئی سال یوں ہی گزارے۔ گورکھپور کے میرے ایک دوست ڈاکٹر محمد مصطفٰے صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ میں استاد تھے۔ ان کی وساطت سے حکیم عبدالجبار صاحب سے تبلیغی مرکز میں ملاقات ہوئی جو شناسائی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وہ حکیم عثمانی صاحب کے پڑوسی تھے۔ دونوں طبیہ کالج کے اقامتی مکانوں میں مقیم تھے۔

کئی برس گزرنے کے بعد ان سے ملاقات کا موقع ملا۔ میری بیوی کو انگلیوں کے جوڑوں میں درد شروع ہوا اور شدت اختیار کرنے لگا۔ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر مالویہ کا علاج شروع ہوا۔ برائے نام افاقہ ہوا۔ بعض دوستوں کے مشورہ سے حکیم عثمانی صاحب سے رجوع کیا۔ ۱۹۹۵ء کی گلابی سردیوں کا زمانہ تھا۔ مریضوں کے ہجوم میں اسپتال کے آداب سے وحشت زدہ تھا۔ میں بھی نزدیک سے عثمانی صاحب کی حکمت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ باری آئی۔ وہ بہت محبت سے ملے۔ احوال دریافت کیا۔ مریضہ کو دیکھا۔ دوائیں تجویز کیں۔ دائیں بائیں کالج کے طلبہ بھی موجود تھے۔ نسخہ نویسی کے ساتھ ان سے گفتگو بھی کرتے رہتے۔ طلبہ کا استفسار اچھا لگا۔ عثمانی صاحب سفید قمیص اور پتلون زیب تن کیے ہوئے تھے۔ انگلیوں میں پتھر جڑی ہوئی انگوٹھیوں سے سنگ دلی کا اندیشہ ہوا۔ بعد میں محسوس ہوا کہ وہ فیروزہ اور نیلم سے خارہ گدازی کا کام لیتے ہیں اور مریضوں کے دل و دماغ پر مہر محبت بھی نقش کرتے ہیں۔ گلے میں سونے کی چمکتی ہوئی زنجیر بھی، بشاشت کی علامت تھی۔ پہلی ملاقات میں نقش و نگار کی یہ صورتیں مرعوب نہ کر سکیں۔ لیکن گفتگو اور لہجے کی نرم سرگوشی نے متاثر کیا۔ بیوی کو ان کا طرز تشخیص اور اسلوب زندگی اچھا لگا۔ اس سے قبل قبلہ حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم کو بھی آصف علی روڈ کے مطب میں دکھا چکے تھے۔ حکیم عثمانی صاحب نے معجون سورنجان اور سفوف سورنجان کے ساتھ ایک روغن بھی بازار سے خریدنے کے لیے کہا تھا۔ ہم ایک ماہ بعد حاضر ہوئے۔ ان کے بائیں ایک وجیہہ قامت اور خوش پوش نوجوان حکیم صاحب کے ساتھ ہم نشین تھے۔ عثمانی صاحب نے تعارف کرایا ڈاکٹر رئیس الرحمٰن کا طرزِ تپاک اچھا لگا۔ وہ مسکراتے ہوئے گرم جوشی سے ملے اور دواؤں کے حصول میں مدد بھی کی۔ یہ کئی سال کا معمول بن گیا۔ عثمانی صاحب سے بے تکلفی اور بے باکی بھی بڑھتی گئی۔ ان کے گھر اور ان کی تقریبات میں شرکت کے لیے مدعو کیا جانے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ طبابت ان کا پیشہ ہی نہیں ان کی فطری وابستگی بھی ہے۔ وہ بارہا گفتگو میں اس کی بقا اور فروغ کے لیے بڑی دردمندی کا اظہار کرتے۔ دواساز اداروں کی مجرمانہ حکمتِ عملی اور نفع خوری پر رنج کرتے۔ خود کالج کی ملکیت پر غاصبانہ قبضے پر دل برداشتہ ہوتے۔ کالج کی کارکردگی پر تنقید کے ساتھ طلبہ کی بے توجہی سے وہ مطمئن نہ تھے۔ وہ اکثر دہلی یونیورسٹی کے طریقۂ کار پر بھی تنقید کرتے۔ خاکسار نے اساتذہ کی بعض لاپرواہیوں پر اشارہ کیا۔ انہوں نے تائید کی۔ دہلی یونیورسٹی کے امتحانات کے نگراں نے کبھی کبھی پرچہ سازی میں تاخیر کی، مجھ سے شکایت کی۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ کنٹرولر امتحان کے کہنے پر ماڈریشن مجھے کرنا پڑا۔ ایک ناگہانی صورت میں پرچہ سازی بھی کرنی پڑی۔ کیونکہ ڈاکٹر لاری صاحب موجود نہیں تھے۔ طبّی کتابوں کی فراہمی پر وہ نالاں رہتے۔ ہمدرد طبیہ کالج کا بھی الحاق دہلی یونیورسٹی سے تھا۔ پروفیسر سروپ سنگھ وائس چانسلر نے چاہا کہ ان دونوں طبیہ کالج کی کارکردگی میں بہتری آئے۔ انہوں نے ایک بار مجھے حکم دیا کہ قبلہ حکیم عبدالحمید صاحب سے ملاقات کر کے کچھ تجاویز پیش کروں۔ جسے خاکسار نے انجام دیا۔ مگر عمل درآمد کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ کیونکہ قرول باغ کا طبیہ کالج دہلی سرکار کا ادارہ تھا اور سرکاریں نہیں چاہتیں کہ طبّی اداروں یا ان سے متعلق ذیلی اداروں کا بھلا ہو۔ بلکہ طب یونانی کا پورا نظام ان کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ اسے زمین دوز کرنے کی پالیسی ہمیشہ حکمتِ عملی کا حصہ رہی ہے۔ ان تمام تکلیف دہ حالات سے عثمانی صاحب دل برداشتہ تھے۔ اغیار کی محفل میں رونق فروزی کے بہت سے اسباب تھے، شاید یہ بھی ایک سبب تھا۔ میں نے کالج میں درآمد کی جانے والی داؤں کے موثرات پر شکایت کی۔ انہوں نے بڑی سوز مندی سے اپنے غصے کا اظہار کیا۔

دہلی یونیورسٹی کی وجہ سے ان سے شکر و شکایت کی بات بھی ہوتی۔ وہ مسکراتے ہوئے سنتے اور جھیلتے۔ ناچیز بھی تابِ رخِ یار کی بے مزہ گفتگو

سے لطف لیتا۔ وہ اکثر اپنے سیاسی نظریہ کی سچائیوں کا بیان کرتے تو میں دلیل کم نظری کہہ کر ٹال دیتا۔ ان کا یہ رویہ کبھی پسند نہیں آیا۔ اگر چہ وہ قائل کرنے کی پرخلوص کوشش کرتے۔ مجھے کبھی کبھی حیرت اور ندامت محسوس ہوتی کہ ایک باشعور نباض وقت کی نبض شناسی میں اتنا فریب زدہ ہو۔ ان سے برملا کہتا بھی۔ وہ اگر چہ برا نہ مانتے، بحث کرتے اور ہم خیال بنانے کی سعی بھی کرتے۔ میں نے اقبال کا یہ خیال افروز شعر سنایا۔ وہ ہنسے اور شعر کی داد دی۔

مری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

ظاہر ہے کہ یہ ان کا ذاتی فیصلہ تھا۔ مگر ان کی ذہانت اور سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے عبرت ہوتی تھی کہ حکمت اور نباضی کے رہ روانِ شوق اس حد تک بے ننگ و نام ہوں گے۔ کئی بار انہیں باور کرانے کی کوشش کی تو وہ حجت کرتے جس میں صواب و سچائی بھی تھی اور بارِ ثبوت بھی محکم ہوتا۔ وہ فرماتے کہ موجودہ برسر اقتدار حکومت کے ظالمانہ رویہ کتنے زہرناک ہیں۔

بھولے ترے کرم جو ستم یاد آ گئے

یہ واقعہ ہے کہ ہم اور ہماری ثقافت آزادی کی صبح صادق سے ہی مطعون ہو رہی ہے۔ آمرانہ استحصال کے لیے تو تختۂ مشق ہم ہی ہیں۔ پھر یہ کیا اور وہ کیا۔ دوستی کا فریب دے کر انتقام کا سلسلہ جاری ہے۔ بہر حال وہ اپنی دلیلوں پر قائم رہے۔ ایک بار انہوں نے مجھے سخت آزمائش میں مبتلا کیا۔ اعجاز صاحب لکھنؤ کے ایم ایل اے دہلی تشریف لائے اور غالب اکیڈمی نئی دہلی میں ان کے اعزاز میں جلسہ تھا۔ وہ لکھنؤ یونیورسٹی کی اردو استاذ ڈاکٹر شیمہ رضوی کے والد بزرگ وار تھے۔ میں بھی اردو کی اسی نسبت کی وجہ سے جلسے میں حاضر ہوا۔

حکیم عثمانی صاحب نے شرارتاً مجھے بھی منبر پر بولنے کے لیے بلا لیا۔ میں شش و پنج میں مبتلا تھا وہاں ان کی سیاسی جماعت کے اعلیٰ اکابرین موجود تھے۔ میری کچھ باتیں شاید ناگوار گزریں۔ جلسے کے اختتام پر عثمانی صاحب نے مجھ سے احتساب کرنا چاہا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اپنے قبلہ کے ساتھ دامن اور بند قبا کو بھی درست رکھتا ہوں۔ وہ ناراض نہ ہوئے۔ شانے پر ہاتھ رکھ کر مسکرا کر کہنے لگے کہ وفاداری اور استواری پر قائم رہیے۔ باقی سب خاک برابر ہے۔ ان کی گفتگو سے خوشی ہوئی کہنے لگے بھائی کسی اردو والے کا اصرار تھا۔ میں اشارہ سمجھ گیا۔

ان کی شخصیت میں حسِ مزاح بھی کارفرما تھی۔ وہ مریضوں کے احوال اور مرض کی نوعیت پر گفتگو کرتے وقت شگفتہ مزاجی کا اظہار کرتے۔ جس سے مریض کو یک گونہ تشفی ہوتی اور اطمینان بھی۔ چارہ سازی کے لیے یہ بھی ایک نسخہ شفا ہے جو مرض کی شدت کو فراموش کرنے کا ہنر سکھاتا ہے۔ نجی گفتگو میں خوب ہنستے اور ہنساتے بھی۔ نوجوان بیٹے کی ناگہانی موت کے بعد وہ خاصے بجھ سے گئے تھے۔ یہ صدمہ ان کے لیے بڑا صبر آزما تھا۔ بہت دنوں تک وہ افسردہ رہے۔ صوبائی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین ہوئے۔ مکان تبدیل کر کے نئی دہلی کی سرکاری رہائش گاہ اختیار کی۔ دو ایک بار حاضر ہوا۔ محسوس ہوا کہ وہ مکان اور ماحول سے مطمئن نہیں ہیں۔ کالج سے سبک دوشی کے بعد وقت کو خوش گوار بنانے کے لیے انہوں نے نجی دواخانہ میں طبابت شروع کی۔ اب بزرگی اور بیماری کے آثار نظر آنے لگے مگر ان کی خوش مزاجی برقرار تھی۔ ذہنی طور پر آسودہ اور مزاج میں استقلال تادمِ حیات باقی تھا۔

طبابت کے ساتھ وہ تدریس سے وابستہ تھے بلکہ شیوۂ حیات وہی تھا۔ سنا ہے کہ بہت دل کش اور خیال افروز لکچر دیتے تھے۔ طرزِ کلام سے محسوس ہوتا کہ یہ اچھے استاد بھی ہوں گے۔ بعض لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ وہ جتنے اچھے طبیب تھے اتنے ہی اچھے استاد بھی۔ ان کا طریقِ تدریس منفرد اور بہت موثر ہوتا۔ نسخہ لکھتے وقت ان کی یادداشت کا اندازہ ہوتا۔ بیاض کبیر کی عبارتیں دہراتے۔ کلیات کے حوالے بھی دیتے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ طبّی مآخذ پر ان کی گہری نظر ہے۔ کبھی کبھی وہ مفردات کے خواص اور تاثیر پر بات کرتے اور انہیں الگ سے تجویز کرتے۔ ایک بار خاکسار نے ان سے نزلے وزکام کا ذکر کیا۔ انہوں نے سریشم ماہی کے استعمال پر زور دیا۔ مجھے معاً یاد آیا کہ گورکھپور کے بڑے حکیم صاحب [امام جامع مسجد] نے بھی مجھے استعمال کرایا تھا۔ جس سے مجھے بہت راحت ملی تھی۔ محترم عثمانی صاحب کچھ دیر تک اس کی خصوصیت بیان کرتے رہے۔ ایک بار علاج بالاعضاء پر گفتگو بہت ہی معنی خیز تھی۔ یہ معاون معالجین کے روبرو بحث تھی اور وجع مفاصل کے مریض کو دیکھتے وقت علم کا چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔

ان کی گفتگو بڑی شگفتہ اور دل نواز ہوتی۔ ان کی خوش پوشی میں ایک

خاص طرح کی سلیقہ مندی جھلکتی تھی۔ اکثر و بیشتر سفید پوش ہی دیکھا۔ سفاری، سفید شرٹ اور پتلون غالباً انہیں بہت پسند تھا۔ یہ ان کی قامت پر موزوں بھی لگتے تھے۔ ان کی اپنی زندگی کے منفرد معمولات تھے۔ جس میں دوسروں کو شریک کرنا انہیں پسند نہ تھا۔ ان مسائل میں کسی کو بے تکلف ہونے یا دخل دینے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ہر شخص کو اپنے طور پر زندگی گزارنے کا اختیار ہے تاوقتیکہ معاشرہ سے متصادم نہ ہوں۔ یہ ان کا فکری اعتدال تھا کہ اقدار کی نگہداشت پر ان کی مخلصانہ نظر تھی۔ ہاں فرسودہ روایتی، اسلوبِ زندگی پر وہ خندہ زن بھی ہوتے۔ اقبال کا شعر پڑھتے۔

یہ امت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی

مرحوم عثمانی صاحب میدانِ عمل کے مرد کار تھے۔ کبھی کبھی ماضی کی جفاکشی کا ذکر کرتے اور گورکھپور کی معاشی غربت کو دہراتے۔ دہلی آنے کی دلچسپ روداد بھی بیان کرتے۔ اس میں دل پرخوں کے سوز و درد کا بھی تذکرہ ہوتا۔ میں نے سنایا کہ علامہ کا قول ہے۔

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی

ہم پیشہ وہم راز کے علاوہ ان کا حلقۂ یاراں بہت وسیع نہ تھا۔ احباب یا نیاز مندوں کی مخصوص تعداد تھی جنہیں باریابی حاصل تھی۔ میں بھی خوش بختوں میں تھا۔

نازاں منم کہ ہم چو توئی قدر دانِ من

کئی محفلوں میں ہم طعام ہونے کا موقع ملا۔ دسترخوان پر ان کی خوش خوراکی نہیں دیکھی مگر خوش مذاقی سے لطف اندوز ہوتا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنی گاڑی سے مجھے گھر تک چھوڑنے آئے۔ ان کا حسن سلوک اکثر زیر بار کرتا۔ پشیمانی ہوتی مگر وہ خوش ہوتے کہ قیمتی لمحات کو رہِ یار میں نثار کر کے مسرت ہوتی ہے۔ مجھے طمانیت تھی کہ صحت وسرپرستی کے لیے ایک مخلص انسان کی معیت حاصل ہے۔ دہلی یونیورسٹی سے قرول باغ کا فاصلہ زیادہ نہ تھا، دوشنبہ کو وہاں کے بازار کی رونق اور خریداری کے لیے اہلیہ کے ساتھ جاتا تو عثمانی صاحب کے ساتھ شام کی چائے پی جاتی۔ ناچیز کچھ ماہ کے لیے دہلی یونیورسٹی کے بہت کشادہ مکان میں منتقل ہوا جو قرول باغ کے بازار میں واقع ہے پھر تو ملاقاتوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہاں سے روزانہ یونیورسٹی آنا تکلیف دہ مسئلہ بن گیا تھا اس لیے چھے ماہ بعد یونیورسٹی کیمپس آ گیا۔ فون پر رابطے کی صورت بہر حال باقی تھی۔ ان کا وطن آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ یہاں کی صبح وشام کی مصروفیات اور بے مہرئی ایام واحباب بھی حائل تھے۔ حسرتوں کے ساتھ ذکرِ گورکھپور ہوتا تو چہرے پر ایک چمک نمودار ہوتی اور شرر کی طرح خاموش ہو جاتی۔ وہاں کی خوش گواریوں کا ذکر ہوتا اور چند احباب کے ذکر سے مسرور ہوتے۔ انہیں شعر وادب سے برائے نام دلچسپی تھی۔ علامہ اقبال کا احترام کرتے ان کی دو باتوں کا ضرور ذکر کرتے اجتہادی فکر اور ملاؤں کی تنقید۔ یہ شعر سناتے:

میں جانتا ہوں انجام اس کا
جس معرکے میں ملّا ہوں غازی

وہ بذاتِ خود دو رکعت کے اماموں سے نالاں تھے۔ بعض وقت شہر کے سیاسی اماموں کا نام لے کر ہدفِ تنقید بناتے۔ ایک بار دو صاحبان کا نام لے کر بتایا کہ یہ ملک کے وزیر کی دہلیز پر دستک دینے والے ہیں۔ صرف اپنے کیسۂ زر کو بھرنے کے لیے۔ یہ وزیر ان کی پسندیدہ جماعت کے تھے جس کی حمایت کے لیے عثمانی صاحب اپنے کو وقف کر چکے تھے۔ اس نسبت پر ناچیز کی ان سے اکثر بحث ہوتی مگر ان کا معاملہ خسرو جیسا تھا۔

من قبلہ راست کردم بہ طرفِ کج کلاہی

وہ عملی زندگی میں دینی شعار یا واجبات سے زیادہ قریب نہ تھے۔ یہ بات کھٹکتی۔ میں کبھی کنایۃً کہتا تو مسکرا کر ٹال جاتے۔ زیادہ گفتگو کو راقم سعیٔ لا حاصل سمجھتا۔ مگر خلش رہتی کہ ہماری دانش وری کو کس کافر ادا کے غمزۂ خوں ریز نے ضرب لگائی ہے۔ دانش گاہوں کے اساتذہ کی ایک معقول تعداد ہے جو تہذیب وعقائد کے جاوداں اقدار پر عمل سے گریزاں ہے۔ دلوں میں محبت تو ہے مگر اظہار میں تکلف محسوس کرتے ہیں۔

راقم پروفیسر رئیس الرحمٰن کا شکر گزار ہے کہ انہوں نے تقاضے کر کے بہت شرمندہ کیا۔ انہی کے اصرار پر عثمانی صاحب سے متعلق یہ تاثرات قلم بند کیے جا سکے، ورنہ ایک کرم فرما مرحوم دوست کی یادوں کو محفوظ کرنے کی سعادت سے محروم رہتا۔ بعض ناگفتنی باتوں کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

عیبے مکن کہ در شبِ ہجراں نوشتہ ایم

●●●

پروفیسر حکیم مظہر سبحان عثمانی ـــــ ایک لائق طبیب و ایک فاضل استاذ

☆پروفیسر انیس احمد انصاری

کسی اپنے بزرگ، استاد یا اہم ملّی یا سماجی شخصیت کے بارے میں اپنے خیالات قلم بند کرنے کو میں نے اپنے آپ کو ہمیشہ بے بس پایا ہے کہ مبادا ان کی شایانِ شان تاثرات قلمبند نہ ہو پائیں اور ان کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے لیکن بعض مخلصین کے اصرار پر اپنے تاثرات تحریر کرنے کی یہ ایک ادنیٰ کوشش ہے۔

پروفیسر حکیم مظہر سبحان عثمانی طبّی دنیا کی ان نامور شخصیات میں شُمار کیے جاتے ہیں جن کے علم اور حلم سے نہ صرف ان کے شاگرد اور ساتھی اساتذہ متاثر ہوئے بلکہ ان کے تمام معاصرین جس میں موافقین اور مخالفین دونوں شامل ہیں، ان کی قدر کرتے دیکھے گئے ہیں۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب نے درس نظامیہ [عربی و فارسی] کی تعلیم کی تکمیل کے بعد تکمیل الطب کالج، لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ یہ تکمیل الطب کالج کا وہ دور تھا جب تکمیل الطب کالج، لکھنؤ طب کی تعلیم کا اہم مرکز تھا اور اس میں نابغۂ روزگار اساتذہ مثلاً شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین اور حکیم شکیل احمد شمسی جیسے اساتذہ طب کی تعلیم دے رہے تھے۔ ایسے لائق اساتذہ سے طب کو اس کے جامع اسلوب کے ساتھ مطالعہ کیا اور مطب اور نسخہ نویسی میں مہارت حاصل کی اور فن طبابت میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔

تکمیل الطب کالج، لکھنؤ سے طب کی تعلیم سے فراغت کے بعد شہر گورکھپور کے ہمدرد مطب سے اپنی طبّی مہارت کا آغاز کیا لیکن جلد ہی وہاں سے جامعہ طبیہ، دہلی کا رُخ کیا اور وہاں شعبۂ معالجات میں لیکچرر اور شفاخانہ کے انچارج مقرر ہوئے لیکن کچھ عرصہ بعد ہی مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے قائم کردہ ہندوستانی دواخانہ کے طبیب انچارج کی حیثیت سے خدمات انجام دینے پر مامور ہوئے۔ بعد ازاں ہندوستان کے ایک اہم طبّی مرکز آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ کے شعبہ معالجات میں باقاعدہ تقرری ہوگئی اور طب یونانی کی اس روح بیکراں نے طب کے ایک اہم مرکز لکھنؤ سے سفر شروع کر کے ہندوستان کے دل دہلی کے دوسرے اہم طبّی مرکز یعنی آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ دہلی میں ملازمت شروع کی اور طب کے طالب علموں کو اپنی علمی اور عملی یعنی مطب و نسخہ نویسی کی بہترین تربیت سے آراستہ کرتے رہے اور معالجات کا مطب اور نسخہ نویسی کا اسلوب ان کی شناخت بن گئی اور قریب نصف صدی تک ہندوستان کے دارالخلافہ دہلی میں یونانی کے طبیب حاذق کی شناخت بنانے میں کامیاب ہوئے اور بالآخر حکومت دہلی نے ان کو طبیب ریاست کے خطاب سے نوازا جو طب یونانی کے تئیں ان کی مخلصانہ خدمات کا اعتراف تھا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب نے اپنے آپ کو صرف معالجات کی تدریس اور مطب کی حد تک محدود نہیں رکھا بلکہ طب یونانی کو ملک میں کس طرح باوقار فن بنایا جائے اس کی بھی جدوجہد میں دیگر اکابرین طب کے

☆ سابق چیئرمین شعبۂ کلیات، سابق ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن و سابق مشیر [یونانی] وزارت صحت، حکومت ہند

ساتھ نہ صرف اپنے آپ کو شامل رکھا بلکہ طب کے مسائل کو پوری قوت کے ساتھ اربابِ حکومت کے سامنے پیش کرنے میں معاونت کرتے رہے۔ اس کا اندازہ مجھے آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں، سی سی آر یو ایم کی تحقیقی مجالس اور سی سی آئی ایم کی طبّی تدریس کے تعلق سے ہونے والی میٹنگوں میں ہوا جہاں میں نے ہمیشہ ان کو باوقار اور سنجیدہ طریقے پر طب کو درپیش مسائل کو موثر طریقے پر اٹھاتے اور بحث کرتے ہوئے دیکھا جس سے میں ذاتی طور پر ان سے بہت متاثر تھا۔ وہ طب میں تجدید اور جدید خطوط پر تحقیق کے قائل تھے لیکن اس انتباہ کے ساتھ کہ طب اپنے صحیح خدوخال اور اہم نظریات سے دستبردار نہ ہو بلکہ یہ نظریاتِ طب اپنی برتری کے ساتھ قائم اور دائم رہیں۔

جان کر منجملہ خاصانِ میخانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے طبّی دنیا میں ان کو برابر یاد کیا جاتا رہے گا کیونکہ ایسے اطباء کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جارہی ہے، میرا یہ خیال ہے کہ ہمیں اپنے اکابرین طب کی خوبیوں کو چند صفحات یا کتاب کی شکل میں شائع کرنے پر اکتفا کرنے کے بجائے ان کی کسی ایک خوبی کو اپنا کر آگے بڑھانا چاہیے۔ آج ہمیں ان کو یاد کرنے کے ساتھ یہ بھی کاوش کرنی چاہیے کہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ نئی دہلی ملک کا ایک اہم طبّی مرکز بنے اور طب یونانی نہ صرف اپنے وطن عزیز میں بلکہ بیرون ملک بھی اس کی مقبولیت میں اضافہ ہو۔ یہی ان کے تئیں سچی عقیدت ہوگی۔

جو بادہ کش ہیں پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقاء دوام لاساقی

●●●

غزل

اے عزم مکمل جو سہارا ترا پاؤں
دنیا کے اندھیرے میں نئی شمع جلاؤں

ہر چیز چمکتی ہوئی سونا نہیں ہوتی
ہر گام پہ کیسے سرِ تسلیم جھکاؤں

اظہارِ محبت کا جنوں نام نہیں ہے
کس طرح سے یہ راز زمانے کو بتاؤں

ملّاح بھی ساحل کا پتہ بھول گئے ہیں
ڈرتا ہوں کنارے پہ کہیں ڈوب نہ جاؤں

ہوں سست مگر پاؤں میں لغزش تو نہیں ہے
آہستہ خرامی کا مزہ کیوں نہ اُٹھاؤں

توہین محبت کی گوارا نہیں ورنہ
چاہوں تو ہر اک اشک سے طوفان اُٹھاؤں

شاعر ہوں مگر یہ تو ضروری نہیں مظہرؔ
ہر سلسلۂ زلف کو زنجیر بناؤں

حکیم مظہر سبحان عثمانی ـــــ خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

☆ڈاکٹر خاور ہاشمی

یادش بخیر، آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی ذمہ داری حکیم عبدالحمید مرحوم نے اس اعتماد کے ساتھ میرے سپرد کی تھی کہ میں اس تنظیم کو ان کی مرضی اور رہنمائی کے مطابق چلانے کا اہل ہوں۔ حکیم صاحب مرحوم میرے حال پر خصوصی کرم فرماتے تھے اس لیے یہ ذمہ داری میں نے قبول کرلی اور اپنی زندگی کے تقریباً پچیس سال اس کے لیے وقف کردیے۔ خدا کا شکر ہے حکیم عبدالحمیدؒ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک میری خدمات کا اعتراف کرتے رہے اور یہی میری خدمت کا صلہ تھا جو مجھے ملا۔

آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے ۱۹۰۶ء میں قائم کی تھی اور ہندوستان میں دیسی طبّوں کے تحفظ اور بقا کے لیے انگریزی سامراج کے خلاف اس پلیٹ فارم سے ایک طویل جنگ لڑی اور کامیاب ہوئے۔ طبّی دنیا اعتراف کرے یا نہ کرے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ طب یونانی کے فن اور اس کے نام پر بڑی بڑی شخصیات اور چہرے جو ہمیں آج نظر آرہے ہیں وہ مسیح الملک کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طبّی کانفرنس مسیح الملک اور ان کے بعد ان کے لائق اور تربیت یافتہ جانشینوں مثلاً حکیم الیاس خاں اور حکیم علامہ کبیر الدین کی قیادت میں تاریخی خدمات انجام دے چکی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں حکیم عبدالحمید مرحوم نے اس کی قیادت اور ذمہ داری سنبھالی اور پوری کامیابی کے ساتھ اس کارواں کو لے کر آگے بڑھتے رہے۔

راقم الحروف کو طبّی کانفرنس کی خدمت کے زمانے میں ایسی بہت سی طبّی شخصیتوں کے قریب آنے کا موقع ملا جن کی یادیں میرے ذہن میں تازہ ہیں انہیں میں ایک نام حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کا ہے۔ عثمانی صاحب نے تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے طبّی تعلیم سے فراغت کے بعد اپنی عملی زندگی کا سفر شروع کیا۔

طبّی تاریخ کا یہ ایک عجیب وغریب واقعہ ہے کہ تکمیل الطب کالج کے بانی حکیم عبدالعزیز صاحب مرحوم ومغفور اور ان کے ہم عصر مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے درمیان معاصرانہ چشمک پیدا ہوئی۔ اس کا بنیادی سبب ان دونوں بزرگوں کے درمیان کوئی ذاتی اختلاف نہیں تھا بلکہ شفاء الملک حکیم عبدالعزیز مرحوم مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے بعض سیاسی اور سماجی رجحانات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس طرح طب یونانی کے دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی کے درمیان کئی اختلافات پیدا ہوئے۔ اسے دور کرنے کے لیے مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے زبردست جدوجہد کی اور دونوں دبستانوں کو قریب لانے کے لیے لکھنؤ کے سفر کیے اور اطباء میں اتحاد فکر وعمل قائم کرنے کے لیے کامیاب اپیل کی۔ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی تاریخ میں یہ ایک انتہائی اہم واقعہ تھا جو گزشتہ صدی کی دوسری دہائی میں پیش آیا۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے ہندو مسلم اتحاد کا مشن اٹھایا۔ انہوں نے سیاسی، سماجی اور نظریاتی سطح پر اس عظیم اتحاد کے لیے جدوجہد کی۔ مسیح الملک کے اسی مشن سے متاثر ہوکر مہاتما گاندھی اور ملک کے دوسرے لیڈران کے قریب آئے یہاں تک کہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مہاتما گاندھی کے عزیز ترین اور قریب ترین ساتھیوں میں شمار ہونے لگے۔ مہاتما گاندھی کے اخبار ان حقائق کی شہادت پیش کرتے ہیں۔

☆سابق آرگنائزنگ سکریٹری، آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس

حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم ان خوش نصیب اور باصلاحیت اطباء میں تھے جو طب یونانی کے دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی دونوں سرچشموں سے سیراب ہوئے۔ تکمیل الطب کالج سے طبّی تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد حکیم مظہر سبحان عثمانی دہلی آئے اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے قریب ترین ساتھی حکیم الیاس خاں کے قائم کردہ جامعہ طبیہ، گلی قاسم جان دہلی کے تدریسی عملے میں شامل ہوئے۔ آیورویدا اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ ۱۹۴۷ء کی زد سے رفتہ رفتہ باہر آیا، کالج میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ یہی زمانہ تھا جب حکیم مظہر سبحان عثمانی جامعہ طبیہ چھوڑ کر طبیہ کالج، قرول باغ کے تدریسی اسٹاف میں شامل ہوئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی معالجات کے استاد تھے اور فارغ اوقات میں اپنا مطب کرتے تھے، ان کی تشخیص و تجویز عام طور پر بے خطا ہوتی تھی اس لیے دوران ملازمت ان کی رہائش گاہ پر مریضوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ وہ اپنے زمانے میں ایک کامیاب طبّی معالج کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے تھے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی اپنے معاصرین میں شاید تنہا طبیب تھے جنہوں نے قومی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی شخصیت کے سیماب وشی تقاضوں کی تکمیل کے لیے وہ ایک وسیع تر میدان میں اترے اور انہوں نے طبّی سیاسیات کے میدان میں قدم رکھا۔ مسیح الملک کی قائم کردہ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس شروع ہی سے ایک نیم سیاسی جماعت رہی ہے۔ آزاد ہندوستان میں ۱۹۵۲ء سے زندگی کے آخری لمحوں تک حکیم عبدالحمید صاحب اس کی قیادت کرتے رہے۔ راقم الحروف نے حکیم عبدالحمید صاحب کی خواہش پر اس کی تنظیمی ذمہ داریاں سنبھالی تھیں۔ اس زمانے میں حکیم مظہر سبحان عثمانی آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے ایک فعال اور صاحب الرائے ممبر تھے، انہیں تحریر سے زیادہ تقریر پر قدرت تھی، اسی وجہ سے حکیم عبدالحمید صاحب ان کی رائے کا احترام کرتے تھے۔ وہ زمانہ بھی راقم الحروف نے دیکھا جب طبّی دنیا کے ایک بڑے اسکالر اور دانشور پروفیسر حکیم محمد طیب مرحوم طبّی کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے لیکن ایک طرف اپنی افتادِ طبع اور دوسری طرف بعض اندرونی عناصر کی ریشہ دوانیوں کے سبب سے انہیں فیصلہ کرنے میں ہمیشہ دقت پیش آتی رہی۔ ایسے وقت میں حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم نے ہمیشہ میری رہنمائی اور دست گیری کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود پروفیسر محمد طیب بھی عثمانی صاحب کی رائے کو بلا چوں و چرا تسلیم کر لیتے تھے اور راقم الحروف کے بھی آگے بڑھنے کا راستہ ہموار ہو جاتا تھا، مختصر یہ کہ اس دور میں طیب صاحب کے بجائے حکیم مظہر سبحان عثمانی نے ہی عملاً صدارت کی ذمہ داری سنبھالی۔

آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس دراصل اطبائے ہند کا ایک پلیٹ فارم تھا جہاں پورے ملک کے اطباء جلسوں میں، میٹنگ میں، کانفرنسوں میں شرکت کے لیے آتے تھے۔ ان اطباء کو متحد رکھنے میں حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم کی مقناطیسی شخصیت ایک اہم رول ادا کرتی تھی۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کے جوہر اس موقع پر کھلتے تھے۔ نہایت ثقہ اور سنجیدہ اطباء کی محفلوں کو لالہ زار بنتے ہوئے راقم الحروف نے بارہا دیکھا ہے۔ عثمانی صاحب ایک مجلسی آدمی تھے۔ گل افشانی گفتار کے جوہر دکھاتے تھے، ان کے لیے ضروری نہیں تھا کہ پیمانہ وصہبا ان کے پیش نظر رہے لیکن حکیم مظہر سبحان عثمانی کی گل افشانی گفتار غیر مشروط ہوتی تھی۔ عثمانی صاحب بذلہ سنج بھی تھے اور نکتہ چین بھی تھے، بات بات سے خود لطف اندوز ہوتے تھے۔

عثمانی صاحب جیسا بلند اور زندگی کی توانائی سے پھرپور قہقہہ میں نے طبّی دنیا میں اور کہیں نہیں سنا۔ اس قہقہے کے پیچھے سستا ٹھٹھول یا پھکڑ پن نہیں ہوتا، ایک سنجیدگی، ایک سلیقہ ہوتا، یہ حزن و ملال کی اتھاہ گہرائیوں سے پھوٹتا ہے، زندگی کو گوارا بنانے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے لکھا ہے:

> ''قہقہوں سے قلعوں کی دیواریں شق نہیں ہوا کرتیں۔ چٹنی اور اچار لاکھ چٹخارے والا سہی لیکن ان سے بھوکے کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا، نہ سراب سے مسافر کی پیاس بجھتی ہے۔ ہاں ریگستان کے شدائد کم ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے نشیب و فراز، اندوہ و انبساط، کرب و لذت کی منزلوں سے بے نیازانہ گزر جانا بڑے حوصلے کی بات ہے''۔

عثمانی صاحب بہت دکھی آدمی تھے۔ بعض کمزور اور ناقابل اعتماد سہاروں نے ان کی زندگی کو پرآشوب بنا دیا۔ عثمانی صاحب طبیب نہ ہوتے تو شاعر ہوتے۔ ان کی طبیعت میں ایک فنکاری اور پرکاری تھی۔ ان کا ذہن لطافت پذیر اور احساس میں صناعی تھی۔ انہوں نے شعر کہے اور خوب کہے۔ زندگی کے تجربات سے گزرنے، نکھرنے کے بعد خیالات اشعار میں ڈھلنے لگے۔ شاید عثمانی صاحب کی زندگی کا یہ پہلو بہت سوں کی نظر سے اوجھل رہا ہے کیونکہ غالب کی طرح انہوں نے شاعری کو ذریعہ عزت نہیں بنایا۔ چند شعر دیکھیے

بہاریں بھی فانی خزائیں بھی فانی
خوشی معتبر ہے نہ غم معتبر ہے
مانا کہ زندگی مری ناکام ہے مگر
کوئی تو بات ہے کہ جیے جارہا ہوں میں
دیوانگی میں فرض شناسی نہیں گئی
دامان گل کے چاک سیے جارہا ہوں میں
ٹوٹے گا کب نفس کا تسلسل خبر نہیں
چلتی ہوئی ہوا کا بھروسہ نہ کیجئے

اس طرح عثمانی صاحب نے اکابر اطباء مثلاً حکیم مومن خاں مومن، حکیم اجمل خاں اور آخر میں حکیم شکیل احمد شمسی کی روایت کو زندہ رکھا۔ شاید اسی فنکاری اور پرکاری کے سبب، باہمی رشتوں میں لطف وانبساط کا رنگ بھرنے کی کوشش سے وہ معاصرانہ چشمک پیدا ہوئی جس نے بعض اوقات سنجیدگی بھی اختیار کی، گروپ بندی کی شکل میں بھی ابھری۔ اس سے کالج کے طلبہ اور تعلیمی ماحول بھی متاثر ہوا۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عثمانی صاحب کو کسی کی دل آزاری مقصود نہ تھی۔ بلکہ ''چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد'' والی بات تھی۔ وہ زندگی کے سناٹوں اور یک رنگی کو دور کرنے کے لیے ایک ہنگامہ اور چہل پہل پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ایک موقع پر ان کے ایک سینئر ساتھی جنہیں ان کا حریف اول سمجھا جاتا تھا، موجود تھے۔ راقم الحروف نے عثمانی صاحب کو اس صورتحال کی طرف توجہ دلائی تو انہوں نے ایک بھرپور قہقہہ لگا کر شعر پڑھا۔

ہنگامہ نہ ہو سرد کہ رونق ہے اسی سے
فرعون کی بستی میں ہو موسیٰ کا مکاں بھی

چنانچہ میری بات کا مکمل جواب مل گیا ''ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق''۔

طبّی سیاسیات نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ شری مدن لال کھورانہ دہلی میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے قد آور لیڈر تھے۔ وہ دہلی کے چیف منسٹر بھی رہے تھے اور اسی زمانے میں عثمانی صاحب ان کے قریب آئے۔ ملک کے سیاسی معاملات میں بھی ان کی رائے دوٹوک ہوتی تھی۔ کھورانہ صاحب کی جوہر شناس نظروں نے ان کی صلاحیتوں کو پہچانا اور انہی کی رائے پر عثمانی صاحب بھارتیہ جنتا پارٹی میں شامل ہوئے۔ صرف یہی نہیں انہیں پارٹی نے اقلیتی شعبے کی سربراہی بھی تفویض کی۔ مسٹر اٹل بہاری باجپئی کے دور میں جب بھارتیہ جنتا پارٹی کی ملی جلی سرکار قائم ہوئی تو انہیں قومی اقلیتی کمیشن کے نائب صدر کی حیثیت سے ذمہ داریاں تفویض ہوئیں، اس زمانے میں اقلیتوں کے لیے جو کام کیے گئے ان کی تفصیل ہمارے موضوع سے باہر ہے البتہ کمیشن کے نائب صدر کی حیثیت سے منجملہ دوسری سہولیات کے انہیں سرکاری رہائش گاہ بھی ملی۔ نئی دہلی میں واقع موتی باغ میں ان کی رہائش گاہ پر بھی ان کے چاہنے والوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ وقت کا تیز رفتار کارواں نہ جانے کتنے واقعات اور شخصیات کو پیچھے چھوڑتا چلا جاتا ہے اور ان شخصیات کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری ان کے جانشینوں کی ہوتی ہے۔

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی تاسیس مسیح الملک کی دوراندیشی کی دلیل ہے اور آزادی کے بعد اسے زندہ رکھنا، اس کے کاموں کو آگے بڑھانا، حکیم عبدالحمید مرحوم کا کارنامہ ہے، ان دونوں بزرگوں نے اپنی باریک بینی سے ماہ وسال کے دبیز پردوں کو چیر کر اِس موجودہ دور کو دیکھ لیا تھا جس سے آج ہم اور طب یونانی گزر رہے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ جمہوری اقتدار میں شخصی اور اجتماعی جدوجہد کے بغیر نہ علوم و فنون زندہ رہ سکتے ہیں اور نہ شخصیات وقومیں۔ اس کے لیے اتحادِ فکر ونظر پر تعمیر کردہ تنظیمیں ہی کام آتی ہیں۔ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، طبّی دنیا کی واحد تنظیم تھی جس نے طبّی مسائل کو عوام کی سطح پر بھی اٹھایا اور پھر اقتدار کے گلیاروں تک بھی پہونچایا لیکن افسوس کہ یہ تنظیم بھی، جو ہماری واحد ترجمان تھی، دم توڑ چکی ہے۔ ۲/نومبر ۲۰۱۰ء کے بعد بڑی تیزی کے ساتھ اس کا زوال شروع ہوا اور آخر کار یکم اکتوبر ۲۰۱۴ء کو اس کی موت واقع ہوئی۔ افسوس اور کرب ناک حقیقت یہ ہے کہ اس کی موت سے کوئی ایک آنکھ بھی ایسی نہیں جس سے آنسو ٹپکا ہو۔ طبّی کانفرنس کے پلیٹ فارم سے طبّی شخصیات اور کارنامے سامنے آتے تھے۔ طبّی کانفرنس کے مرجانے سے حکیم مظہر سبحان عثمانی جیسے نہ جانے کتنے طبّی اکابرین ہیں جن کی شخصی خوبیاں اور فنّی جوہر ایک مہیب تاریکی میں غرق ہوچکے ہیں۔ **'فاعتبروا یا اولی الابصار'**

●●●

طب یونانی کا انسائیکلو پیڈیا — حکیم مظہر سبحان عثمانی

☆حکیم سید غلام مہدی

حکیم مظہر سبحان عثمانی موجودہ دور کی طبّی دنیا کے ایک باکمال فرد تھے۔ وہ ایک باعلم ہستی تھے خصوصاً درس و تدریس میں انہیں کمال حاصل تھا۔ انہیں یونانی طبّی کتابوں پر عبور حاصل تھا۔ طب میں عربی اور فارسی کتابیں ان کا مرجع و مصدر تھیں وہ اپنے طلبا کو علم طب سے بہرہ ور کرتے تھے۔ راقم الحروف سے دوستی تھی بلکہ اسے اپنے علم سے بھی فیضیاب کرتے تھے۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی سے راقم الحروف سے ان کی واقفیت تھی۔ وہ گلی قاسم جان دہلی کے جامعہ طبیہ میں استاد تھے جب کہ راقم ہمدرد دواخانہ، لال کنواں دہلی میں بہ حیثیت طبیب ملازم تھا۔ ۱۹۶۰ء میں شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب طبیہ کالج علی گڑھ سے ریٹائر ہوکر وہاں کے پرنسپل ہوگئے تھے۔ اس دور میں حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب اسی کالج میں بہ حیثیت استاد مقرر تھے۔ شفاء الملک کی وجہ سے اور ان اساتذہ کے باعث اس کالج کی علمی حیثیت بڑھ گئی تھی۔ ان اساتذہ کی معاونت سے اور حکیم عبدالحمید صاحب [اس وقت ہمدرد کے متولی] کی وجہ سے وہاں مزاج کمیٹی اور اخلاط کمیٹی قائم ہوئی اور اس پر وہاں کام ہوا۔ اگست ۱۹۶۶ء میں ہم چند احباب نے کشمیر جانے کا پروگرام بنایا۔ جس میں حکیم مظہر سبحان عثمانی، حکیم سید ظل الرحمٰن، حکیم محبوب رضا صاحب وغیرہ شامل تھے۔ اس سفر کا مقصد گھومنا پھرنا تو تھا ہی، وہاں کے سرکاری طبیہ کالج میں وہاں پبلک سروس کمیشن کی جانب سے انٹرویو میں شریک ہونا بھی تھا۔ ہمیں معلوم تھا اور ہم نے دیکھا بھی کہ حکیم شکیل احمد شمسی اس انٹرویو میں طبّی اکسپرٹ کی حیثیت سے شریک تھے۔ ہمیں یقین تھا کہ حکیم مظہر سبحان عثمانی کو اس انٹرویو میں کامیابی ملے گی، کیونکہ شمسی صاحب کے مظہر سبحان عثمانی صاحب خاص شاگرد تھے اور ان کی قابلیت کے مداح بھی۔ شمسی صاحب ایک بلند مرتبہ شاعر بھی تھے اور مظہر سبحان عثمانی صاحب میں بھی یہ صفات موجود تھیں، مگر ہوا یہ کہ پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ کسی کو بھی کامیابی نہ ملی، بلکہ کچھ عرصہ بعد وہ کالج بھی ختم ہوگیا اور وہاں کے اسٹاف کو مختلف ڈسپنسریوں اور محکمۂ صحت میں ضم کردیا گیا۔ کالج کے پرنسپل جناب قیام الدین صاحب بھی کہیں اور چلے گئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ علی گڑھ طبیہ کالج کے پرنسپل ہوگئے تھے۔ اُنہوں نے ایک دن ہم سب امیدواروں کی اپنے گھر پر دعوت کی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی جی بھر کر کشمیر کی سیر کی۔ جوانی کی عمر تھی، تمام مشہور مقامات، گلمرگ، کھلن مرگ، ڈل جھیل میں شکارے میں بیٹھ کر سیر چشمہ شاہی اور دیگر مقامات دیکھے۔ کشمیر کے سفر میں سیر سپاٹا، شعر و سخن، لطافت و ظرافت کی محفلیں رہیں۔ ایک زمانہ گزر گیا مگر کشمیر کی تعریف میں فارسی کا یہ شعر اب تک یاد ہے ؎

ہر سوختہ جانی کو بہ کشمیر در آید
مرغ کباب ست بہ او بال دیر آید

کشمیر کے سفر سے واپسی کے بعد حکیم مظہر سبحان عثمانی آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرول باغ نئی دہلی میں شعبۂ معالجات سے منسلک ہوگئے اور زندگی کے آخری دور تک وہیں رہے۔ وہ وہاں معالجات کے پروفیسر ہوگئے تھے۔ کچھ عرصہ کے لیے وہ علی گڑھ میں بھی رہے مگر جلد ہی وہاں سے لوٹ آئے۔ اُن کی تقریر و تحریر کا جواب نہ تھا۔ مختلف طبیہ کالجوں میں وہ اکثر اپنے کارناموں کے لیے یاد کیے جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ برہان پور

☆سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی

[مدھیہ پردیش] میں ایک طبّی کانفرنس ہوئی، وہاں بہت سے طبّی طلبا اُن کے گرد جمع ہوگئے اور کسی طبّی موضوع پر ایک لکچر کی فرمائش کردی۔ اُنہوں نے مکمل، جامع لکچر بڑے جوش وخروش سے دیا، جو اُن کا امتیاز تھا۔ ایک بار طبیہ کالج قرول باغ میں کوئی فنکشن تھا، جس میں اس وقت وہاں کے چیف منسٹر جناب مدن لال کھورانہ مدعو تھے۔ عثمانی صاحب نے اس وقت جو لکچر دیا، اس سے چیف منسٹر صاحب بطور خاص متاثر ہوئے۔ عثمانی صاحب کا موضوع یہ تھا کہ طبیہ کالج جناب حکیم اجمل خاں صاحب نے قائم کیا تھا، لہٰذا اسے طبّی یونیورسٹی کی حیثیت دی جانی چاہیے۔ اس کے لیے عثمانی صاحب نے اپنی بھرپور کوشش بھی کی۔ وہ اُس دور میں بھارتی جنتا پارٹی سے وابستہ ہوگئے تھے، جس میں اُن کا خاص مقام تھا۔ طبّی درس وتدریس سے اُنہیں خاص دلچسپی تھی اور معالجات کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

عثمانی صاحب کی علمی لگن بے پناہ تھی۔ وہ ہر طرح کی علمی گتھیوں کو سلجھانے پر قادر تھے۔ اُنہیں اکثر طبّی کتابوں کی پیچیدگیوں پر عبور حاصل تھا۔ طبّی تحریروں اور تقریروں پر اُنہیں جو عبور حاصل تھا وہ طلبا کے لیے تو فیض رساں تھا ہی، اکثر قابل اطباء اور استاد بھی اس سے فیض حاصل کرتے تھے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب اپنے استاد حکیم شکیل احمد شمسی صاحب سے بہت متاثر تھے۔ عثمانی صاحب شکیل صاحب کے شاگرد تھے، جو تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے استاد تھے، ۱۲ نومبر ۱۹۸۵ء کو لکھنؤ میں حکیم شکیل صاحب کا انتقال ہوا۔ جنازہ میں شریک ہونے کے لیے دہلی سے حکیم محمد عبدالرزاق صاحب کے ساتھ حکم مظہر سبحان عثمانی صاحب بھی دوسرے دن بذریعہ طیارہ لکھنؤ پہنچے [راقم الحروف اس زمانے میں لکھنؤ میں تھا چنانچہ وہی انہیں لکھنؤ ایرپورٹ سے لے کر آیا]۔ اُن کے انتقال کے بعد حکیم عبدالرزاق صاحب نے اُن سے قربت رکھنے والوں سے کہہ کر مضامین لکھوائے اور کتاب 'حکیم شکیل احمد شمسی حیات وخدمات' کے عنوان سے مرتب کی۔ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس نے اُسے شائع کیا اور طبّی درسیات پر سیمینار کے وقت اسے طبیہ کالج، پونہ میں ریلیز کیا گیا۔ اس کتاب میں ایک مضمون حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کا 'تذکرۂ استاد' کے عنوان سے ہے۔ شکیل صاحب تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں استاد تھے [پھر پرنسپل ہوگئے تھے]۔ اس مضمون میں اُن کی جو صفات بتائی گئی ہیں، وہ عثمانی صاحب میں بھی موجود تھیں۔

چند سطور ملاحظہ فرمائیے۔

''ہر طالب علم کو تحصیل علم میں مختلف المراحل دور میں متعدد اساتذہ سے کسب فیض کرنا پڑتا ہے مگر ایسے اساتذہ کم ہوتے ہیں جو مدارس اور جامعات کی مقررہ معیادِ تعلیم ختم ہوجانے کے بعد بھی دمِ آخر تک چشمۂ فیض بنے رہتے ہیں۔ ایسے ہی اساتذہ اپنے تلامذہ کی علمی سطح اور فکری رجحان کو بلند سے بلند تر سطح تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی قد آور اور دلاویز شخصیت اپنے استاد حکیم شکیل احمد شمسی کی بھی تھی— حکیم صاحب صوری اور معنوی اعتبار سے اسم بامسمی تھے۔ دو کلاس میں لکچر دیتے تو طلبا کو پیچیدہ طرز استدلال سے مرعوب کرنے یا اسباق کے کڑوے گھونٹ پلانے کی بات کو حرفِ شیریں بنا کر پیش کرتے۔ نجی گفتگو میں اُن کا لہجہ نرم وشیریں، الفاظ موزوں و برمحل اور طرزِ ادا ایسی تھی جس کو سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا''۔

پھر فرماتے ہیں:

''حکیم صاحب ایک کہنہ مشق شاعر تھے ان کے اشعار کا مجموعہ 'قیدِ حیات وبندِ غم' اُن کی حیات میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوچکا تھا اور مرحوم نے اس کی ایک جلد دستخط شدہ 'حکم مظہر سبحان عثمانی کی خدمت میں' مجھے پیش کی تھی۔ راقم الحروف کو بھی شعر وسخن سے دلچسپی تھی۔ مرحوم سے یکسانیت فکر کی جھلک شعر وسخن میں بھی ہے۔ دونوں کے اشعار کی ایک جھلک پیش خدمت ہے۔

حکیم شکیل احمد شمسی:

نئی حیات نے عالم نیا سنوارا ہے
مزا یہ ہے کہ اسی زندگی نے مارا ہے

سفینہ خود ہی تلاطم پسند ہے شمسی
انہیں نفس موج خود کنارا ہے

حکیم مظہر سبحان عثمانی

جو ترے در سے دور گذری ہے
مجھے اس زندگی نے مارا ہے

اہل ہمت کو ہر جگہ ہے سکوں
جو ہے طوفاں وہی کنارا ہے

عثمانی صاحب نے اپنے اس مضمون میں بہت سی باتوں کا تذکرہ کیا ہے، میں اسے چھوڑ کر ایک علمی بحث کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ کتنے بڑے عالم تھے اور مشاہیرِ طب سے اُنہیں کتنی مناسبت تھی وہ بھی اس سے ظاہر ہوگا۔ لکھتے ہیں کہ شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی صاب نے مجھے ایک خط تحریر کیا:

''براہ کرم تحقیق فرمایئے اور مجھے مطلع کیجئے کہ 'لدود' کون سی دوا ہے۔
ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بخار آیا تھا، اُس میں یہ دوا
اُم المومنین حضرت میمونہؓ نے چٹائی تھی۔ [عبداللطیف]

تحقیق سے مجھے معلوم ہوا کہ کسی حدیث میں لفظ 'لدود' آیا تھا اور پاکستانی مترجم کو اس کی تشریح بیان کرنی تھی۔ اس کے لیے شفاء الملک سے رابطہ کیا تھا۔ میں نے اس کام کے لیے تقریباً تمام طبّی معلومات اور تمام طبّی لغات کے اوراق چھان مارے تھے۔ مگر مجھے کوئی طبّی تشریح نہیں ملی۔ ایک بار بہت سے اطباء جمع تھے اُن میں حکیم کبیر الدین بھی تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا، اُن کا جواب تھا کہ اپنے استاد سے پوچھو، چنانچہ میں نے شکیل صاحب سے پوچھا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ مشکوۃ شریف کے حاشیۂ فرنگی محلی کو دیکھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ 'لدود' کے نام سے اُس سیال دوا کو موسوم کرتے تھے، جو ناک کے ایک گوشہ میں داخل کر کے دوسرے گوشہ سے نکال دی جاتی تھی۔ اس طرح کے عمل کے لیے بالعموم قسط شیریں جیسی دوا سیال شکل میں کام میں لائی جاتی تھی۔ اس طرح کی بھی معلومات حکیم مظہر سبحان عثمانی کے علم کا ایک حصہ تھیں۔

مرحوم ایک بڑے طبیب، ایک بڑے شاعر، ایک بڑے زبان داں اور بڑی معلومات رکھنے والے تھے۔ خدا اُن پر رحمت کرے۔ موصوف نے اپنا کلام مرتب کرلیا تھا۔ جو شعری مجموعہ پر مشتمل تھا، ایک بار برائے مشورہ مجھے دکھانا چاہتے تھے، مگر اس سے قبل سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اُن کے اخلاف میں مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس کے پاس گیا ہوگا؟ اور اس کے سامنے آنے کی کیا صورت ہوگی؟۔

موصوف کے سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن سے قریب ہونے کے بعد میرا اُن سے رابطہ بڑھا۔ وہ کونسل کے سیمیناروں، ورک شاپوں، میٹنگوں اور کمیٹیوں میں شریک ہوتے رہے اور اپنی صائب رایوں اور کارآمد مشوروں سے کونسل کو نوازا اور ہر اچھے کام میں شریک ہوئے۔

●●●

غزل

درد دل کو جو بڑھا دیتے ہیں
ہم اُنھیں دل سے دعا دیتے ہیں
تیرے بگڑے ہوئے تیور اے دوست
حسن کی شان بڑھا دیتے ہیں
ایک دن تم بھی پکارو ہم کو
ہم تمھیں روز صدا دیتے ہیں
عشق کامل کی قسم! ظلم وستم
حوصلے اور بڑھا دیتے ہیں
ہم عداوت کے اندھیرے میں سدا
عشق کی شمع جلا دیتے ہیں
حسن کیا چیز ہے ہم اہلِ وفا
عشق کو عشق بنا دیتے ہیں
ہم تری یاد میں اکثر اے دوست
سارے عالم کو بھلا دیتے ہیں
مُسکراتے ہیں جب وہ اے زخمی
اور ایک تیر چلا دیتے ہیں

حسن کی ظاہری ادا، اصل میں فریب ہے
حاصل ہمیں یقین تھا، حسنِ یقین فریب ہے
واقفِ حال تھے مگر پھر بھی جدا نہ ہوسکے
کہتے ہیں جس کو دوستی کتنا حسیں فریب ہے

حکیم مظہر سبحان عثمانی اور ہمارے مراسم

☆طبیبہ ام الفضل

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے ۱۹۷۱ء میں آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ میں قدم رکھا۔ وہ معالجات کے لکچرر مقرر ہوئے اور O.P.D، IPD کے انچارج بھی۔ ان کے آنے سے طبیہ کالج کے O.P.D اور IPD میں رونق آ گئی جہاں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ O.P.D میں مریضوں کی تعداد بہت کم تھی اور فارمیسی میں ادویہ بھی بہت کم ملتی تھیں۔ IPD کی حالت اور خستہ تھی۔ وہاں نہ کوئی مریض داخل ہوتا تھا اور نہ کسی ڈاکٹر کی ڈیوٹی تھی طلبہ ہی نظر آتے تھے۔ ایسے میں حکیم مظہر عثمانی کے آجانے سے ایک ہلچل مچ گئی۔

مریضوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ دواؤں کا بھی بہتر انتظام ہوگیا۔ IPD میں مریضوں کا داخلہ ہونے لگا۔ معالج اور طالب علموں کے راؤنڈ ہونے لگے۔ وارڈس مریضوں سے بھرنے لگے۔ نرسوں کی چہل پہل شروع ہوگئی اور ہاسپٹل کی صحیح شکل نظر آنے لگی۔ یہ تھے حکیم مظہر سبحان عثمانی اور ان کی انتظامی صلاحتیں۔ اچھے استاد، اچھے معالج، حاذق حکیم، وقت کے پابند، ذمہ داری کا احساس رکھنے اور فن سے دلچسپی رکھنے والے۔ یہ خوبیاں تھیں حکیم عثمانی میں۔ جن سے میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس دوران حکیم عثمانی سے وقتاً فوقتاً ملاقات ہوتی رہی۔

کئی سال ہمدرد دوا خانہ میں کام کرتے رہنے کے بعد میرا تقرر بحیثیت ریسرچ آفیسر CCRIM&H میں ہوگیا تو میری پوسٹنگ اے اینڈ یو طبیہ کالج، قرول باغ میں ہوگئی۔ ریسرچ کے لیے مجھے کثرت طمث اور زحیر مزمن پر کام کرنا تھا۔ اس کے لیے چند ادویات کونسل سے منظور ہو کر آ گئیں۔ میں نے OPD میں بیٹھنا شروع کر دیا کیونکہ جنرل مریضوں سے ہی ریسرچ کے مریضوں کو تلاش کرنا پڑتا تھا۔

ریسرچ کے مریضوں کو I.P.D میں داخل کرنا پڑتا تھا۔ یہاں پورے ہاسپٹل کا نظام خراب تھا۔ حکیم انچارج تھوڑی دیر کے لیے آتے پھر مجھ سے یہ کہہ کر چلے جاتے کہ آپ ہمارے مریض بھی دیکھ لیں۔ فارمیسی میں جنرل ادویہ بہت کم تھیں۔

اسی طرح I.P.D میں داخلہ کا مسئلہ تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتلایا ہے کہ ان حالات میں مجھے ریسرچ میں کام کرتے ہوئے بڑی پریشانی تھی۔ لیکن حکیم عثمانی کے آجانے سے حالات بدل گئے تھے۔

کونسل سے ایک نیا پروجیکٹ برص پر طبیہ کالج میں شروع کر دیا گیا تھا جس کی وجہ سے بھی مریضوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوگیا۔

۱۹۷۴ء میں میرا تقرر بحیثیت اسسٹنٹ ڈائرکٹر ہوا اور میں کونسل کے ہیڈ کوارٹر میں منتقل ہوگئی۔ حکیم عثمانی صاحب سے پہلا تعارف اس وقت ہوا تھا جب ۱۹۶۵ء اور اس کے بعد ہمارے مکان سی/۶۲۔ نظام الدین ایسٹ میں میرے شوہر حکیم محمد عبدالرزاق صاحب سے ملنے اکثر تین نوجوان جن میں سے دو شیروانی میں ملبوس ہوتے، آیا کرتے تھے۔ دو شیروانی والے

☆سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی

حکیم سبحان مظہر عثمانی اور حکیم ظل الرحمٰن تھے جو ہمدرد طبیہ کالج، گلی قاسم جان میں پڑھاتے تھے۔ تیسرے حکیم شجاع الدین صاحب تھے جو ہمدرد دواخانہ میں کام کرتے تھے۔ اس وقت حکیم عبدالرزاق ہمدرد چھوڑ کر منسٹری آف ہیلتھ میں آ چکے تھے۔

۱۹۷۸ء میں حکومت ہند نے CCRIM&H کو ختم کر کے چار کونسل بنائی تھیں جس میں ایک سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن [CCRUM] تھی۔

۱۹۷۹ء میں میں نے ڈپٹی ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھال لیا تھا۔ ہماری کونسل کے کئی میٹنگوں اور سیمیناروں میں اکثر حکیم مظہر عثمانی کی شرکت ہوئی۔ جب بھی ان سے کسی مرض کے بارے میں یا ادویہ کے بارے میں پوچھا جاتا تو اس کا جواب بڑا جامع انداز میں دیا جاتا۔ اصول علاج پر اہمیت دیتے تھے۔ کسی نئی بیماری کا نام سن کر اس طرح سمجھاتے کہ اس کا علاج آسان معلوم ہوتا جیسے AIDS کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ اس کا علاج اصل میں علاماتی ہوا کرتا ہے اور مریض کی قوت مناعت کو بڑھانا ہوگا تاکہ مرض کا مقابلہ کر سکے۔ اس کے لیے یونانی میں بہت سی دوائیں ہیں جیسے تریاق اربعہ یا اس جیسی ادویہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا وغیرہ۔ طاعون کے متعلق پوچھا تو جواب تھا کہ کافور میں دافع حمیٰ اور دافع عفونت تاثیر ہے اس کے ساتھ مناسب ادویہ کا اضافہ کیا جائے۔

افیون کی عادت چھڑانا ہو یا Dengue Fever کے بارے میں۔ الغرض ہر مرض کے بارے میں یا علاج کے سلسلہ میں خاطر خواہ جواب دیا جاتا۔ اس سے حکیم صاحب کے مطالعہ، نئی ریسرچ سے اُن کی واقفیت اور ان کے عملی تجربہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

آخر دم تک کامیاب علاج کرتے رہے۔ اپنے مطب میں وہ آیورویدک مرکبات کا بھی استعمال کراتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان مرکبات کے نسخے جن میں زیادہ تر یونانی ادویات شامل ہیں۔ اثر پذیری میں بہتر ہیں اس لیے جہاں ضرورت محسوس کرتے ان کا استعمال کراتے تھے۔

ایک مرتبہ فون آیا کہ میں چند کم اجزاء والے نسخے عام بیماریوں کے لیے جمع کروں۔ کہا کہ یہ کام آپ اچھا کر سکتی ہیں۔ میں نے وعدہ بھی کیا اور چند نسخے جمع بھی کیے۔ حکیم عثمانی صاحب چاہتے تھے کہ اپنے گاؤں میں ایک مطب کھولیں جہاں غریب اور نادار لوگوں کا مفت علاج کیا جا سکے۔ غالباً قلب کی بیماری کی وجہ سے یہ کام رہ گیا۔

حکیم عثمانی صاحب، حکیم سید اشتیاق صاحب، حکیم مرزا صاحب وغیرہ اکثر عید کے دن پر ہمارے گھر نظام الدین تشریف لاتے۔ کبھی کبھی ان کی بیگمات بھی ساتھ ہوتیں رات کا کھانا ہمارے یہاں ہوتا۔ ان کی لڑکیوں کی شادی میں ہم لوگ مدعو تھے ہمارے بچوں کی شادی میں وہ شامل ہوتے۔

کسی بیماری کے سلسلے میں یا گھر کے کسی فرد کی بیماری کے سلسلے میں کوئی مشورہ کرنا ہوتا تو میں حکیم محمد طیب صاحب، علی گڑھ یا حکیم عثمانی صاحب سے فون پر رابطہ قائم کرتی۔ ان لوگوں سے مشورہ کر کے مجھے بڑی تسلی ملتی۔ ان دونوں کے چلے جانے کے بعد بہت بڑا خلاء پیدا ہو گیا ہے اور یہ میرا ذاتی بڑا نقصان ہے۔

حکیم عثمانی کی موت کی خبر مجھے حیدرآباد کے دوران قیام ملی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا۔ ان کی بیگم سے فون پر بات کر کے تسلی دی۔ پھر میں نے حکیم غوث الدین صاحب کو فون پر حکیم صاحب کی موت کی اطلاع دی اور کہا کہ یہ خبر حیدرآباد کے اخباروں میں شائع کروائیں۔

کیا خوب انسان تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ [آمین]

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی — ایک گنج گراں مایہ

☆حکیم محمد خالد صدیقی

سی سی آر یو ایم میں میرے عہد کے کاموں کے بارے میں نہ تو میری خواہش یہ ہے کہ اس کی مدح سرائی ہو، نہ ہی میرا دعویٰ ہے کہ میرا ہر فیصلہ درست اور صحیح ہی تھا، بلکہ اس کی توقیت کرنا ناقدین فن کا کام ہے، اس سلسلہ میں وہ کوئی بھی رائے قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ تاہم مجھے اس بات پر اطمینان ضرور ہے کہ میں نے جو بھی کیا وہ کونسل کی بہتری کے لیے تھا، ہاں اگر بعض عزائم کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا پایا تو مجھے اس کا ملال ہے لیکن مجھے توقع ہے کہ جب میرے زمانۂ انصرام کے کاموں کا دیانت دارانہ تجزیہ کیا جائے گا تو 'جہان طب' جیسے تحقیقی جریدے کے اجرا اور اس کی علمی و فنی خدمات کا بھی اعتراف ضرور ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد طبّی صحافت میں ایک خوش گوار تبدیلی کا آغاز ہوا۔ اس کے ذریعہ بزرگ قلم کاروں کی نگارشات سامنے آئیں، ساتھ ہی نئے لکھنے والوں کی ایک پود تیار ہوئی، 'جہان طب' کے ذریعہ ایک بڑا کام یہ بھی انجام پایا کہ بعض اہم اداروں اور کچھ اہم شخصیتوں کے تذکرے دستاویزی صورت میں محفوظ ہوگئے۔ کونسل کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر رئیس الرحمٰن نے حکیم مظہر سبحان عثمانی کی شخصیت پر 'جہان طب' کا ایک خصوصی شمارہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، خدا کرے یہ ایک بابرکت سلسلہ کی بنیاد ثابت ہو اور اس سے 'جہان طب' کی توقیر میں بھی مزید اضافہ ہوگا۔

ڈاکٹر رئیس الرحمٰن نے جب ان کی شخصیت پر کچھ لکھنے کے لیے کہا تو میں نے سوچا کہ کہاں سے ان کے بارے میں باتیں شروع کی جائیں۔ اس وقت ان سے تعلق کے بہت سے واقعات یاد آرہے ہیں، یہ جریدہ جو حکیم مظہر سبحان عثمانی کی شخصیت پر خصوصی نمبر شائع کرنے جارہا ہے، ۱۹۹۹ء میں، جب یہ شروع ہوا تھا تو اس کی مجلس مشاورت کے اراکین میں حکیم مظہر سبحان عثمانی کا نام بھی شامل تھا جو ان کی وفات تک باقی رہا۔ بعض دیگر نام وقت کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہوتے رہے لیکن عثمانی صاحب مرحوم سے جہان طب کا ہمیشہ ایک خاص تعلق رہا۔ انہوں نے اس کے لیے مضامین بھی تحریر کیے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی ہمارے عہد کی طبّی دانشوری کا ایک نمایاں چہرہ تھے، ان کی شخصیت نہایت پروقار اور پرشکوہ تھی، ان کی ظاہری وجاہت پر مزاجی تمکنت خوب بھاتی تھی، اُس پر پُراعتماد لب ولہجہ ان کے رعب داب میں اضافہ کا موجب تھا۔

میرے لیے ان کی ذات ایک مشفق ومہرباں کی تھی۔ ان سے میری آشنائی اس وقت سے ہے جب میں طبّی دنیا کا حصہ بھی نہیں بنا تھا، بلکہ ابھی اس کا قصد ہی کر رہا تھا۔ میرے ہم وطن حکیم رئیس احمد صاحب [معروف طبیب] میرے والد کے خاص احباب میں تھے۔ جامعہ طبیہ دہلی میں میرے داخلے کا مشورہ انہیں کا تھا، ان کے ساتھ حکیم عبدالحمید صاحب کی بھی خواہش تھی کہ میں جامعہ طبیہ میں تعلیم حاصل کروں۔ یہاں داخلہ کے لیے جب میں والد صاحب کے ساتھ آیا تو ہمارا پہلا قیام حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کے دولت کدے پر تھا، پھر انہیں کے ساتھ ہم نے کالج پرنسپل حکیم گرودت سنگھ

☆سابق ڈائرکٹر جنرل، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی

الگ کے دفتر میں جا کر داخلہ کی رسم پوری کی تھی، گویا میرے طبّی سفر کا آغاز ان کی سرپرستی میں ہوا۔ وہ تا عمر اسی طرح سرپرستی فرماتے رہے، میں نے ہمیشہ ان کے وجود کو ایک سایۂ شفقت کی طرح محسوس کیا۔ ۲۳ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو جب میں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان انڈین میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی [CCRIMH] سے وابستہ ہوا تو میری پہلی پوسٹنگ قرول باغ طبیہ کالج میں واقع کلینکل ریسرچ یونٹ میں ہوئی، اس زمانہ میں وہ یہاں لکچرر تھے، اس طرح یہاں بھی مجھے ان کی شفقتیں حاصل رہیں۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی شخصیت کے کئی رنگ تھے اور وہ ہر رنگ میں نمایاں تھے۔ بطور استاذ ان کے تدریسی انداز کو سراہا گیا، بحیثیت طبیب ان کی حذاقت کا چرچا رہا۔ باوجودیکہ وہ کم گو تھے، مگر ایک ادیب اور شاعر کے روپ میں ان کے بانکپن کا اعتراف کیا گیا۔ طبّی سیاست کے ایک قائد کی حیثیت سے وہ ہر مسئلہ کے عقدہ کشا رہے۔ قومی سیاست میں انہوں نے ایک منفرد راہ نکالی اور اس میں بھی ان کے وجود کو محسوس کیا گیا۔

حکیم صاحب بہت کچھ ہونے کے باوجود بنیادی طور پر ایک استاذ تھے، یہاں ان کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ مصادر پر ان کی گہری نگاہ تھی اور کلیات جو طب فہمی کی اساس ہے، اس پر ان کی مضبوط گرفت تھی۔ یہی اوصاف مطب و معالجہ میں بھی ان کی کامیابی کے ضامن بنے، ان کے مطب پر خاص طور پر ایسے مریضوں کا مرجوعہ رہتا تھا جو علاج کر کر کے مایوس ہو چکے ہوتے تھے۔ ان کے مطب کی ایک اور خاص بات یہ تھی کہ گرچہ ان کی ذہنی اور فکری پرورش لکھنؤ کی طبّی درسگاہ تکمیل الطب میں ہوئی تھی لیکن ان کے مطب و معالجہ میں دلی اسکول کے اثرات غالب تھے، اسی لیے وہ تنگ نظری سے دور رہے اور ان کا دریچۂ ذہن اخذ و استفادے کی ہر امکانی آمد کے لیے کھلا رہا۔

عمدہ قلمی صلاحیت کے لیے جن لوازموں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب عثمانی صاحب کے اندر موجود تھے، انہیں فن کی گہری بصیرت تھی، زبان پر ملکہ بھی حاصل تھا اور تخلیقی جوہر بھی رکھتے تھے۔ تصنیف و تالیف کے لیے یہی اہلیتی اوصاف سمجھے جاتے ہیں، جو ان کے اندر وافر مقدار میں تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے علمی مجال کو میدان عمل نہیں بنایا، تاہم 'مشتے نمونہ از خروارے' کے طور پر ایک مختصر تالیف 'ٹیپو سلطان کے کلینکی مشاہدات' اور کچھ مضامین یادگار چھوڑے ہیں، جس سے ان کی عمدہ تصنیفی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، ساتھ ہی ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر کیوں ان کی ترجیحات میں مطب و معالجہ ہی رہا اور تصنیف و تالیف پر ان کی توجہ کم رہی حالانکہ وہ اس سلسلے میں اپنے معاصرین سے بہترین کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ لیکن غور کرنے پر ان کا موقف ہی صحیح معلوم ہوتا ہے اور لگتا ہے کہ جو انہوں نے کیا وہ زیادہ ضروری تھا اور طبّی برادری کو بھی یہی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ آج کل جس طرح کے تصنیفی کام ہو رہے ہیں وہ کم ہی ہوں تو بہتر ہے۔

میں نے ان کی شاعری کا رنگ بھی دیکھا ہے۔ انہوں نے کم کہا مگر خوب کہا۔ حکیم عبدالحمید کے یوم ولادت پر غالب اکیڈمی میں منعقد ایک تقریب میں وہ علالت اور شدید نقاہت کے باوجود تشریف لائے، ان کے صاحبزادہ حکیم دانش ریحان عثمانی سلمہٗ نے انہیں سہارا دے کر اسٹیج تک پہنچایا، ان کی حالت ہرگز ایسی نہیں تھی کہ وہ کھڑے ہو کر کلام پیش کرتے، مگر ہم نے دیکھا کہ اس پیرانہ سالی میں بھی ان کے اندر کا شاعر جوان تھا۔ شاید ان کے جوش و خروش کی وجہ یہ تھی کہ یہ تقریب جس شخصیت کی یاد میں ہو رہی تھی وہ انہیں بے حد محبوب تھی۔ یہی معاملہ حکیم عبدالحمید کا بھی تھا، وہ بھی عثمانی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔

جب کوئی طب کا مسئلہ سامنے آتا اور وہ لاینحل ہوتا تو میں، حکیم اقبال مرحوم کے ہمراہ عثمانی صاحب کے دولت کدہ پر حاضر ہو جاتا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ چائے کی پیالی ختم ہونے سے پہلے انہوں نے اس مسئلہ کا حل نہ پیش کر دیا ہو، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنے صائب الرائے تھے۔

عثمانی صاحب طبّی کانفرنس کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ حکیم عبدالحمید صاحب کانفرنس کے معاملات میں ان سے ضرور مشورہ کرتے تھے، بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں وہ عبدالحمید صاحب کے خاص معتمدین میں تھے۔ عثمانی صاحب کے اندر کمال کا جوہر خطابت تھا، وہ جہاں بھی ہوتے میر مجلس معلوم ہوتے۔

انہوں نے قومی سیاست میں بھی حصہ لیا لیکن ذرا جداگانہ انداز میں، جن سنگھ اور بھارتیہ جنتا پارٹی [بی جے پی] سے ہندوستانی مسلمانوں نے ہمیشہ فاصلہ رکھنے کی کوشش کی ہے، لیکن حکیم صاحب کا موقف اس کے برعکس تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اس طرز عمل سے دوریاں مزید

بڑھیں گی، اس رویے سے مسلمانوں کا نقصان تو ہوسکتا ہے لیکن کسی فائدے کی توقع نہیں کی جاسکتی، لہذا انہوں نے نہ صرف بی جے پی کی رکنیت اختیار کی بلکہ پارٹی کے معاملات میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ بی جے پی اور مسلمانوں کو اس پارٹی سے قریب لانے میں ان کی کوششیں رنگ لائیں نیز بی جے پی نے اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں کے بعض مسائل کے حل میں فراخدلی کا ثبوت دیا۔ عثمانی صاحب نے یہاں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا اور ہمیشہ قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھے گئے، انہیں پارٹی کے اعلیٰ رہنماؤں کا اعتبار حاصل تھا، مدن لال کھورانہ [سابق وزیر اعلیٰ، دہلی] اور وجے کمار ملہوترہ وغیرہ سے ان کے برابری کے مراسم تھے۔ سابق وزیر اعظم شری اٹل بہاری باجپئی سے ان کے تعلقات ایسے تھے کہ وہ عثمانی صاحب سے گھنٹوں بے تکلفانہ باتیں کرتے تھے۔ بغیر کسی احتیاط کے وہ ان سے حساس موضوعات پر بھی کھل کر بات کرتے، ایسے بعض موقعوں کا میں خود شاہد ہوں۔

عثمانی صاحب کے سیاسی اثر و رسوخ کا فائدہ یونانی طب کو بھی پہنچا ہے۔ آئی ایس ایم کے ڈائرکٹوریٹ کے قیام میں ان کے یہ اثرات بہت کام آئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے کالج کو جب بھی ان کی ضرورت محسوس ہوئی، وہ ہمیشہ سامنے کھڑے نظر آئے۔

ان کی ذات سے مستفید ہونے والے اداروں میں یونانی کونسل کا نام بھی شامل ہے، حکیم عبدالرزاق صاحب کے عہد اہتمام ہی سے اس سے ان کی وابستگی ہوگئی تھی۔ یہ سلسلہ میری ڈائرکٹرشپ کے زمانہ میں بھی قائم رہا، میرے بعد بھی وہ بدستور اس کی رہنمائی کرتے رہے۔ وہ کونسل کی سبھی بڑی کمیٹیوں کے ممبر رہے ہیں اور ہمیشہ اپنی ذات سے اسے فیض پہنچاتے رہے ہیں۔

طبّی دنیا میں گزشتہ کئی دہائیوں سے ایسے چہروں کی کمی محسوس کی جارہی ہے، جن کی طرف نگاہیں پر امید ہوکر اٹھ سکیں۔ عثمانی صاحب ایسے معدودے چند لوگوں میں تھے، جن کی خاص طور پر مشکل گھڑی میں یاد آتی تھی۔ ۱۵/جنوری ۲۰۱۳ء کو وہ بھی رخصت ہوگئے، ان کے جاتے ہی حکیم محمد طیب صاحب، پدم شری حکیم سیف الدین صاحب اور حکیم اقبال صاحب ایک ایک کرکے الوداع کہہ گئے، ان بزرگوں کی جدائی کے بعد اب تو ایک خوفناک سناٹے کا احساس ہورہا ہے۔

●●●

غزل

سہارا چاہئے کوئی بشر کو
بڑھا دیجے ذرا دردِ جگر کو
خطاءِ دید ہے تسلیم لیکن
میں آخر کیا کروں اپنی نظر کو
ہماری تو شب غم ہے مسلسل
سحر ہم نے نہیں سمجھا سحر کو
میں ہر پردے میں تجھ کو دیکھ لوں گا
وفا نے روشنی دی ہے نظر کو
تن مجبور ہے بے تابِ روح
مسافر ڈھونڈتا ہے اپنے گھر کو
میں کن نظروں سے تم کو دیکھتا ہوں
ذرا پہچان لو میری نظر کو
تمھارے بعد وہ تنہائیاں ہیں
مجھے گھر اور میں تکتا ہوں گھر کو
یہ محفل روشنی شمع تک ہے
نہ ہوگا کوئی پروانہ سحر کو
بہت ہے اک جھلک جلوے کی مظہرؔ
سہارا چاہئے ذوقِ نظر کو

نہ خوفِ قفس ہے نہ بجلی کا ڈر ہے
سلامت ابھی ہمت بال وپَر ہے
ہر اک داغِ دل اس طرح جلوہ گر ہے
میری شامِ غم بھی جواب سحر ہے

حکیم مظہر سبحان عثمانی — کچھ یادیں کچھ باتیں

☆ پروفیسر سید شاکر جمیل

حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب مرحوم [جو عام طور پر حکیم عثمانی کے نام سے مشہور تھے] طب کی اُن چند نمایاں اور ممتاز شخصیات میں سے ایک تھے جو گزشتہ نصف صدی کے عرصے میں طبّی افق پر ضیاء بار رہیں۔ حکیم صاحب کی شخصیت کے متعدد پہلو ہیں جن پر بات کی جاسکتی ہے۔ ایک طبیب، استاد طب، سماجی کارکن، سیاسی رہنما اور ان سب سے بڑھ کر ایک انسان، ایک پڑوسی اور ایک دوست۔

راقم سطور کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے اپنے طبّی کیریئر کی ابتداء حکیم صاحب کے زیر نگرانی ۱۹۷۸ء میں کی۔ اس زمانے میں انڈور میں مریضوں کے علاج معالجے اور آؤٹ ڈور میں تشخیص و تجویز دونوں میں ہی حکیم صاحب کی سرپرستی حاصل رہی۔ او۔ پی۔ ڈی میں نسخہ نویسی [جس کا وہ املا کراتے تھے] کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہوا۔ مطب سیکھنے کا یہ طریقہ جواب مفقود ہوتا جارہا ہے بڑا کارآمد ہے۔ اس زمانے کو میں اپنے دور طالب علمی کے ''زمانہ ثانی'' سے تعبیر کرتا ہوں گو کہ حقیقی معنوں میں تو ہمیشہ طالب علم ہی رہوں گا۔

میری رہائش، اس زمانے میں، طبیہ کالج قرول باغ کے کیمپس میں تھی۔ حکیم صاحب سے ذاتی ملاقاتوں اور تبادلۂ خیال کے مواقع کثرت سے میسر آتے۔ یوں بھی پڑوسیوں سے تعلقات رکھنے کا اس زمانے میں رواج تھا۔ ذاتی ملاقاتوں سے جہاں ایک جانب فنّی استفادے کا موقع ملا وہیں دوسری جانب میں ان کی بذلہ سنجی، خوش گفتاری، حاضر جوابی، چٹکیاں لینے اور دوسروں کی چٹکیوں کو خوش دلی سے برداشت کرنے سے بھی محظوظ ہوا۔

حاضر دماغی اور حاضر جوابی میں وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ اکثر کسی علمی گفتگو کے دوران بھی ذو معنیٰ الفاظ کا استعمال کر کے محفل کو زعفران زار بنانے کا فن انہیں خوب آتا تھا۔

حکیم عثمانی صاحب تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل اور شفاء الملک حکیم شکیل احمد شمسی کے شاگرد تھے۔ مطب میں انہیں کا انداز اختیار کرتے، طب یونانی کے اس زمانے میں دو بڑے اسکول تھے۔ دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ، دونوں کے انداز [Trend] میں نمایاں فرق تھا۔ فنّی اعتبار سے دونوں کی خصوصیات [خوبیاں اور خامیاں] جدا تھیں۔ لکھنؤ اسکول میں مرکبات کے استعمال کے باوجود مفردات کے استعمال پر زور دیا جاتا تھا۔ حکیم صاحب اسی اسکول سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے نہایت ایمانداری کے ساتھ اعتراف ہے کہ مفردات کا مطب میں نے حکیم صاحب سے ہی سیکھا اور نسخوں میں مریض کے احوال، مرض کی ماہیت اور خفت و شدت کے اعتبار سے مفردات میں حذف و اضافہ کرنے کی صلاحیت جس پر حکیم صاحب کو خاص ملکہ حاصل تھا، ابھی انہیں کی بدولت حاصل ہوئی۔

طبیہ کالج قرول باغ کے اسپتال میں، اس زمانے میں، ہندوستانی دواخانہ کی تیار کردہ مرکب ادویہ فراہم کی جاتی تھیں۔ بعض وجوہ سے یہ فراہمی غیر مکمل اور تاخیر سے ہوتی تھی۔ بازار میں بھی یہ ادویہ آسانی سے دستیاب نہ ہوتی تھیں۔ حکیم صاحب ایک پریکٹکل حکیم تھے۔ انہوں نے بعض ایسی ادویہ جو کم قیمت ہوں، آسانی سے دستیاب ہوں اور جن کا سفوف بنایا جاسکتا ہو، پر مشتمل کئی نسخے ترتیب دیئے اور انہیں تیار کروا کر اسپتال کی ڈسپنسری میں رکھوایا۔ سفوف اسطوخودوس، سفوف کاکڑا سینگی،

☆ سابق ڈائرکٹر جنرل، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی

سفوف سعال، سفوف اصل السوس، سفوف پودینہ، سفوف پیچش، سفوف ضیق النفس و دیگر بہت سے اسی قسم کے نسخہ جات ہیں۔ یہ نسخے بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ راقم سطور کے ۱۹۸۴ء میں جامعہ ہمدرد جوائن کرنے کے بعد اور ۱۹۹۴ء میں ایم۔ ڈی پروگرام میں کلینکل اسٹڈی کے لیے ان میں سے چند نسخوں کا انتخاب کیا گیا اور اسٹڈی مکمل ہونے کے بعد تحقیقی جریدوں میں مقالے بھی شائع ہوئے۔

حکیم صاحب کے مطب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ یونانی مرکبات کے ساتھ آیورویدک مرکبات [جو بنیادی طور پر یونانی کے ہیں لیکن تجارتی مقاصد کے لیے آیورویدک کے نام سے تیار کر لیے گئے] بھی استعمال کرتے تھے۔ بعض اوقات ان مرکبات کا تقابل و موازنہ بھی کرتے۔ ان کے مطب کی ایک بڑی خوبی مریضوں کی نفسیاتی تسکین اور Counselling تھی۔ جدید تحقیقات سے بھی نتائج برآمد ہوئے ہیں کہ مریضوں کی صحت یابی میں صحیح تشخیص و تجویز کے ساتھ نفسیاتی تسکین کا اہم کردار ہوتا ہے۔ غالباً انہیں وجوہ سے ان کے ذاتی مطب کا مرجوعہ زبردست تھا۔

معالجاتی تحقیق بلکہ کسی بھی قسم کی تحقیق میں سب سے زیادہ اہم تحقیق کے موضوع کا انتخاب اور اس سے متعلق منصوبہ بندی ہے۔ بدقسمتی سے بعض لوگ کلینکل ٹرائل کی عمل درآمدی کو اصل تحقیق سمجھ لیتے ہیں۔ حکیم عثمانی مرحوم تحقیق کے جدید اصولوں اور قدیم معلومات کی ہم آہنگی کے قائل تھے اور موضوعات تحقیق کی شناخت میں وہ بہت نمایاں تھے۔ اس اعتبار سے طبّی تحقیق میں اور میرے تحقیقی کاموں کے حوالے سے وہ میرے اولین Boss تھے۔ وہ جانتے تھے کہ Sensitive اور Sensible لوگوں سے کیسے کام لیا جاتا ہے۔ جسمانی مشقت، دماغی محنت اور دانشورانہ جہد کے فرق کو وہ بخوبی سمجھتے تھے۔ میرے استاذ اور جامعہ ہمدرد میں سابق ڈین و پرنسپل حکیم جمیل صاحب میں بھی یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ غالباً اسی لیے یہ انداز میری شخصیت کا بھی ایک حصہ بن چکا ہے۔

حکیم صاحب کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو ان کی سیاسی زندگی سے متعلق ہے۔ وہ آخر تک بی جے پی، گئے وقت کی جن سنگھ، سے وابستہ رہے۔ بی جے پی سے ان کی وابستگی ایک عجوبہ لگتی ہے۔ غالباً اس وقت کے طبیہ کالج کے حالات، آپس کی کشاکش اور کسی حد تک حق تلفی اور زیادتی نے شاید انہیں اس اقدام کے لیے مجبور کیا تھا۔ وہ ایک بہادر اور جری آدمی تھے۔ مخالفین کی تعداد کتنی ہے اور میرے ساتھ کتنے لوگ ہیں، اس کی پرواہ کیے بغیر اپنے موقف پر نہ صرف قائم رہتے بلکہ مخالفین کو چیلنج بھی کرتے تھے۔ اپنا راستہ خود نکالنے میں یقین رکھتے تھے۔ ذیل میں یہ بات قابل ذکر بھی ہے اور ان کی عالی ظرفی کی عکاس بھی اس کہ اپنے ساتھیوں کو اپنے موقف پر آنے [بالفاظ دیگر اپنے گروپ میں شامل ہونے] کے لیے کبھی مجبور نہیں کرتے تھے۔ دہلی یونیورسٹی کی ٹیچرس ایسوسی ایشن، اکیڈمک کونسل اور ایگزیکٹو کونسل کے انتخابات میں راقم الحروف اور ان کا اختلاف رہتا تھا لیکن بڑکپن کا ثبوت دیتے ہوئے ذاتی تعلقات اور شعبہ جاتی معاملات میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے دیتے تھے۔

راقم السطور کو حکیم صاحب مرحوم سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل نہ ہوا [گو کہ وہ میرے صحیح معنوں میں استاذ کامل تھے] مگر ان سے اور ان کے شاگردوں سے سنا کہ وہ کلاس روم میں نوٹس لے کر جانے اور املا کرانے کو غلط سمجھتے تھے۔

حکیم صاحب ایک اچھے مقرر بھی تھے۔ طبّی جلسوں میں ان کی تقریر توجہ اور اہمیت سے سنی جاتی تھی۔

حکیم صاحب کے انتقال کے بعد ان کے صاحب زادے دانش عثمانی اور سابق ڈائریکٹر جنرل، سی سی آر یو ایم، ڈاکٹر محمد خالد صدیقی صاحب نے مرحوم کی اس خواہش سے مطلع کیا کہ نماز جنازہ میں پڑھاؤں۔ میں جذباتی ہو گیا کہ نہ تو عالم ہوں اور نہ کوئی اہم شخصیت پھر یہ ذمہ داری کیوں، لیکن خواہش بلکہ حکم کی تعمیل کی۔

اس مختصر سی تحریر میں حکیم صاحب کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ شاید ممکن نہ ہو۔ ان کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا جائے گا جس میں ان کے علمی اور طبّی کارناموں کی تفصیل ہوگی۔ یہ چند باتیں ذاتی تعلق کی داستان ہیں۔

تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

●●●

محسن طب — حکیم مظہر سبحان عثمانی

☆حکیم خالد محمود صدیقی

زندگی کے مختلف محاذوں پر خود کو سالار کی حیثیت سے فائز کر پانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ چند ہی افراد ہوتے ہیں جو سماج و معاشرے کے سمندر میں لہر بہ لہر سینہ سپر ہوتے ہیں اور اس میں اٹھنے والے تھپیڑوں کو اپنی جواں مردی سے زیر کرتے رہتے ہیں۔ خال خال ہی ایسی شخصیتیں جنم لیتی ہیں جن کے یہاں فکر و شعور کی جولان گاہیں ہمہ وقت برسر پیکار ہوتی ہیں اور جو اپنی حرف شناسی کو علم و عرفان عطا کر کے قلم و قرطاس کے علمبردار قرار پاتے ہیں۔ ایسے اشخاص بڑی مشکلوں سے دستیاب ہوتے ہیں جن کی ذات آفاقیت کا مرقع ہو، جو اپنے انداز و اطوار میں بے نظیر ہوں، جن کے کارنامے عدیم المثال ہوں اور جو ارباب حل و عقد کے لیے معتبر حوالہ ہوں۔ شاذ ہی ایسی آوازیں سماعت سے ٹکراتی ہیں جو اپنے اندر فکری و علمی تمازت رکھتی ہوں، جن کی روانی سے بادِ صبا کے جھونکوں کا لمس حاصل ہوتا ہو اور جن کا ٹھہراؤ باغ عدن سے ٹھہر ٹھہر کر آنے والی نشیلی ہواؤں کا فسانہ سناتا ہو۔ ایسے افراد انگلیوں پر شمار کیے جا سکتے ہیں جن کی مختلف الالوانی میں اس قدر یکسانیت ہو کہ یہ فیصلہ دشوار ہو جائے کہ ان کی ذات کے کینوس پر بکھرے رنگوں میں کون سا رنگ سب سے زیادہ پر معنی ہے حالانکہ انفرادی طور پر اگر دیکھا جائے تو اس میں موجود رنگِ واحد بھی اپنے اندر معانی کا جہان رکھتا ہو۔

ایسے ہی چند عظیم المرتبت افراد میں آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کے پروفیسر، معروف سیاسی رہنما، نامور یونانی معالج، مخلص و مشفق مدرس، استاذ الحکماء حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کی ذات بھی شامل ہے۔ زیست کے کتنے ہی محاذ ہیں جس میں آپ نے خود کو 'سرخیل' کے طور پر ثابت کیا ہے۔ آپ کی ذات کو مختلف زاویوں سے اعتبار حاصل ہے۔ آپ کی شخصیت کے بیشتر پہلو اتنے روشن و تاباں ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کی ذات اخوت و محبت، خلوص و مہر اور سادہ لوحی و رواداری کا ایسا شبنمی پیکر تھی کہ اس کی چھاؤں سے گل و لالہ ٹھنڈک کسب کریں، گفتگو ایسی کہ ہونٹوں سے خوشبو کی تراوش کا اشتباہ ہو۔ ہر بات میں ایسا رنگ اور ایسی ترنگ کہ ارادت کو جی چاہے۔ بذلہ سنجی اور خوش مزاجی ایسی کہ ملاقاتی کی طبیعت لالہ زار ہو جائے اور مدتوں تک اس کی حلاوت دار خلش کو اپنے سینے میں محسوس کرے۔ آپ کی قہقہہ بار ہنسی آپ کے غیاب میں بھی کانوں میں گھنٹیاں بجاتی رہتی۔ آپ کی گرمجوشی اور حاضر جوابیوں کے طفیل سنجیدہ محفلیں بھی زندہ دلی کا مرقع ہو جاتیں۔ جوانوں کے لیے آبشار محبت، بزرگوں کے لیے پیکر امتثال و اتباع، شخصیت میں ایسی جاذبیت و کشش کہ سبھی آپ کے شیدائی، سبھی آپ کی پیروی پر رضامند اور سبھی آپ کے عقیدت مند۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کی شخصیت کا ایک اور روشن پہلو بحیثیت

☆ ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی

انسان ساز اور آدم گر کے تھا۔ بقول شاعر ؎

یوں تو پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سلیقے سے تراشا جائے

حکیم صاحب یقینی طور پر افراد سازی کے ہنر سے آشنا تھے اور پھر آپ کے خلوص اور کردار کی صداقت پتھروں کو پگھلانے میں اہم کردار ادا کرتی تھی۔ درس و تدریس کے توسط سے آپ طلباء کے ذہنوں میں علم و آگہی کا خزینہ بھر دیتے۔ فن کے تئیں شاگردوں میں اعتماد پیدا کرنا آپ کی اولیں ترجیح تھی۔ ہر ایک کی صلاحیت کو بھانپ کر حسب لیاقت ان کی نشو نما اور تربیت کا خیال رکھتے۔ طلباء ہمیشہ آپ کے انداز تدریس کے گرویدہ، حسن تدریس کی دلربائی پر فریفتہ اور آپ کے اظہار بیان پر ریشہ خطمی رہتے۔ آپ کا اسلوبِ تدریس اتنا دلنشیں تھا کہ طلباء 'گوہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے' کا آئینہ نظر آتے۔ درس و تدریس کے علاوہ علاج معالجہ میں بھی آپ کو شہرت و کمال حاصل تھا۔ بقراطی نہج پر علاج کو فوقیت دیتے لیکن کبھی کبھی حسب ضرورت مرکب دوائیں بھی تجویز کرتے۔ طبی حذاقت کا یہ عالم تھا کہ ہمہ وقت مریضوں میں گھرے رہتے اور دائیں بائیں ہمیشہ شاگردوں کا ہجوم رہتا۔

حکیم صاحب سے مجھے براہ راست شاگردی کا تو شرف حاصل نہیں تھا لیکن ان سے مجھے کسب فیض کے مواقع ضرور ملے تھے۔ جب میں نے سی سی آر یو ایم کو جوائن کیا اور پوسٹنگ قرول باغ طبیہ کالج میں ہوئی تو حکیم صاحب کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ چونکہ میں بھی طبیہ کالج کیمپس میں مقیم تھا۔ لہذا ان سے بارہا ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہا۔ ان کی محفلوں میں بیٹھنے کی سعادت مجھے حاصل رہی ہے۔

طبّی تحقیق کے مسائل کو اگر سمجھنا ہوتا تو میں بلا تکلف ان کے پاس چلا جاتا۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے ملتے اور تمام تفصیلات فراہم کرتے، آپ کی تدریس کے چرچے سنے ہی تھے، ملاقات اور صحبتوں سے فیض اٹھانے کے بعد اس کی صداقت آشکارا ہوئی۔

آپ کے مطب پر ہمہ وقت مجمع لگا رہتا تھا جس کا میں نے طبیہ کالج کیمپس کے قیام کے دوران اکثر مشاہدہ کیا۔ کونسل کے کلینکل ریسرچ کے لائحہ عمل کو مرتب کرنے اور معالجاتی تحقیق کو روبہ عمل لانے کی ذمہ داری میرے ہی سپرد تھی جس کے سلسلے میں عثمانی صاحب سے میری اکثر ملاقاتیں رہتیں۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کی زبان کی طرح آپ کے قلم کو بھی خدا نے ایک جولانی عطا کی تھی۔ درس و تدریس اور علاج و معالجہ کے علاوہ آپ نے تصنیف و تالیف میں بھی اپنے جواہر پارے چھوڑے ہیں۔ آپ کی تحریروں میں عجب رنگ کی وارفتگی پائی جاتی ہے، جودت طبع، زبان و بیان کی دلکشی اور مضامین کا تنوع آپ کو دیگر قلمکاروں سے ممتاز و ممیّز کرتا ہے۔ آپ کے رشحات قلم کمیاب ضرور ہیں مگر نایاب نہیں۔ آپ کی مشہور کتاب 'ٹیپو سلطان کے معالجات' دعوے کی دلیل ہے جو فی زمانہ اپنے موضوع پر لکھی گئی واحد کتاب ہے۔

راقم کو کونسل کی تصنیفی سرگرمیوں کے سلسلے میں اکثر ان سے تبادلۂ خیال کا موقع ملتا رہا جس سے ان کی بے پناہ تخلیقی و علمی صلاحیت کا اندازہ ہوتا تھا۔

طب اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے، بالخصوص ہندوستانی پس منظر میں یونانی طب اور شعر و شاعری میں جس قدر ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ قابل قدر ہے۔ غالباً اسی ہم آہنگی کا اثر تھا جس نے مرحوم حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کو بھی اپنے اکابرین و معاصرین کی پیروی پر آمادہ کیا اور اپنے استاذ حکیم شکیل احمد شمسی صاحب سے کسبِ سخن کیا۔ زندگی کے تجربات اور نامساعد حالات نے ان کے شعری شعور میں مزید رنگ آمیزیاں کیں اور پھر افکار و خیالات نے موزونیت کا لبادہ اوڑھ کر غزل کی سرخ و سپید شال پر زخمی اور مظہر کے تخلص سے گل کاریاں کیں۔

چونکہ راقم کے والد صاحب کو شاعری سے خاصہ شغف تھا اور اپنے ذوق کی تسکین کے لیے شاعری کرتے تھے۔ ان کی اسی دلچسپی سے مجھ کو بھی شعر و سخن کی ادنیٰ دسترس حاصل ہوئی۔ طبیہ کالج کیمپس میں قیام کے دوران اکثر ان کی شام کی محفلوں میں حاضر ہونے کا شرف رہا ہے۔ ان کے ادبی ذوق سے مستفیض ہونے کا موقع ملا وہ اپنا کلام بمشکل سناتے تھے۔ میں بھی اپنے کچھ اشعار ان کے گوش گزار کر دیتا، آپ حوصلہ افزائی فرماتے۔

آپ کی زبان اردو کی شیرینی سے عبارت تھی، بہت کم لوگوں کو علم ہوگا کہ وہ دہلی پبلک لائبریری کے ممبر بھی رہے ہیں اور اس دوران اردو

اور طبی کتب کی فراہمی کے لیے آپ کوشاں رہے۔ وہ اردو کے اہل دانش حلقے میں معروف تھے۔ آپ اتر پردیش اردو اکیڈمی کے ممبر بھی رہے۔

عثمانی صاحب کی شعری تخلیقات عموماً ضمیر متکلم پر منحصر ہوتیں۔ آپ اذیتِ احساس کے زیر اثر آتے اور وارداتِ قلبی کو سخن پیکر عطا کر کے مطمئن ہو جاتے۔ آپ کے یہاں جگ بیتی نہیں بلکہ آپ بیتی موجزن ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ آپ کے بیشتر رفقاء آپ کی سخن گستری سے ناآشنا تھے۔ باوجودیکہ آپ کی زنبیلِ شعر میں سیکڑوں نادر و نایاب کلام موجود تھے لیکن شاید یہ آپ کی کسر نفسی ہی تھی جس کے سبب اخیر عمر تک آپ کا مجموعہ کلام منظر عام پر نہیں آ سکا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کی ذات کا ایک اہم جزء ان کی خطابانہ شان بھی تھی۔ زبان کی شیرینی، انداز بیان کی خوش سلیقگی، الفاظ کی نشست و برخاست، زبان کی سلاست اور گفتگو کی روانی آبشاروں کو شرمسار کرتی ہوئی نظر آتی تھی۔ آپ اپنی بات اتنے سلجھے ہوئے انداز میں اور اتنے سلیقے سے رکھتے کہ سامعین کے دلوں میں راست اثر کرتی اور وہ ان کے سحر میں مبتلا ہو جاتے۔

حکیم مرحوم کے سینے میں ایک ایسا دل دھڑک رہا تھا جو ہمہ وقت طب یونانی کے فروغ کی خاطر پریشان رہتا۔ انھیں طب کی تدریس سے لگاؤ تھا، جہاں انھیں علاج و معالجہ سے شغف تھا وہیں انہیں اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ اس فن کا فروغ اسی صورت میں ممکن ہے جب اسے سیاسی سرپرستی فراہم کی جائے۔

ہندوستان کی طب کی سب سے مشہور تنظیم آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی سرگرمیوں سے شروع سے وابستہ تھے، حکیم عثمانی صاحب کانفرنس کی صوبہ دہلی کی یونٹ کے سینئر وائس پریسڈنٹ اور بعد میں صدر رہے۔ مجھے بھی ان کے زیر سرپرستی طبّی تحریک کی خدمت کا موقع ملا تھا۔ طبّی کانفرنس کے تقریباً ہر اجلاس میں آپ موجود ہوتے، آپ کی تقریریں بہت زوردار ہوتی تھیں۔ آپ کی تقریر سے اصحاب اقتدار متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے جس سے طبّی مسائل کے حل میں بہت مدد ملتی تھی۔ طب کے بیشتر کارنامے اسی تحریک کے مرہون منت ہیں۔

کانفرنس کے روح رواں حکیم عبدالحمید آپ پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ حکیم عبدالحمید صاحب نے کونسل کے بانی ڈائرکٹر حکیم عبدالرزاق اور حکیم عثمانی صاحب کے ذریعہ اس طبّی تحریک کو بام عروج تک پہونچایا۔

اس کی خاطر انھوں نے سیاسی میدان میں بھرپور حصہ لیا اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے اُس وقت کے صفِ اول کے رہنماؤں، اٹل بہاری واجپئی، لال کرشن ایڈوانی، سکندر بخت، مدن لال کھورانہ، شری اوم پرکاش کوہلی اور وجئے کمار ملہوترا وغیرہ سے اپنے سیاسی مراسم استوار کیے اور طب کو اپنے تعلقات سے فیض پہونچایا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کی علمی لیاقت، بالغ نظری، معاملہ فہمی، نکتہ رسی اور اصابت رائے سے جہاں دیگر اداروں نے کسب فیض کیا وہیں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، دہلی نے بھی جا بجا ان کے احسان اٹھائے ہیں۔ خواہ وہ کونسل کی گورننگ باڈی کی ممبر شپ ہو، سائنٹفک ایڈوازری کمیٹی کی ممبر شپ ہو یا کلینیکل ریسرچ سب کمیٹی کی چیئرمین شپ، آپ نے ہر لحاظ سے کونسل کی رہنمائی کی۔ جس انداز سے آپ نے کونسل کی تقویم و فعالیت میں اپنی مخلصانہ و مربیانہ کارگزاریاں پیش کی ہیں وہ یقینی طور پر آپ کا ہی حصہ ہے۔ پھر سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، دہلی کے بانی ڈائرکٹر سے لمبی رفاقت اور ان سے دیرینہ رسم و راہ نے بھی انھیں کونسل کے معاملات سے جڑے رہنے پر آمادہ رکھا۔ بعد ازاں حکیم محمد خالد صدیقی صاحب کے زمانے میں بھی کونسل سے آپ کی وابستگی میں وہی قلبی لگاؤ قائم رہا اور عمر کے آخری حصے تک آپ نے کونسل سے اپنی ہمدردیاں قائم رکھیں۔

کونسل کی گورننگ باڈی کے جب وہ ممبر تھے تو انہوں نے کونسل کے مسائل کو نہایت ہی پرزور انداز میں اٹھایا۔ سائنٹفک کمیٹی کی ممبر شپ کے دوران کونسل کے معالجاتی تحقیق کے پروگرام کا تفصیلی معائنہ فرماتے اور یونانی امتیازات اور تحقیق میں یونانی اصولِ علاج پر خاص زور دیتے اور انہیں مرتب بھی کرتے۔ کلینکل ریسرچ سب کمیٹی کے وہ صدر بھی رہے۔ کونسل کی کِٹ میڈیسن کے ارتقاء میں ان کا خاص کردار رہا ہے، نسخوں کی ترتیب میں زیادہ تر حکیم طیب صاحب کے ساتھ ساتھ کونسل نے اس ضمن میں آپ سے خصوصی فیض اٹھایا۔ ان نسخوں کو دیکھنے سے ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے اور ان پر تجرباتی تحقیق سے بھی۔ یہ نسخے کم اجزاء پر مشتمل

ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی زود اثر ہوتے تھے اور ساتھ ہی ارزاں بھی۔ میں کونسل کے صدر دفتر سے وابستہ تھا۔ کونسل کے معالجاتی پروگرام کی ترتیب، تنفیذ اور نگرانی میرے ہی ذمہ تھی۔ اس ضمن میں میٹنگوں کے انعقاد، ایجنڈے کی تیاری اور میٹنگ کے نتائج کو قابل عمل بنانے کے سلسلے میں میری ہمیشہ ان سے لمبی ملاقات اور ٹیلی فون سے گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ ان کی علمی لیاقت، فنّی حذاقت اور طب کی سرپرستی سے میں ہمیشہ متاثر رہا۔ کلینکل ریسرچ پروگرام میں کونسل ہمیشہ آپ کے مشوروں سے مستفیض ہوتی رہی۔ طبیہ کالج میں کونسل کی یونٹ میں جب تحقیقی پروجیکٹ شروع ہوا تو طبیہ کالج اسپتال اپنی کسمپرسی کے دور سے گزر رہا تھا۔ وہاں پر داخل مریضوں کی تعداد نہ کے برابر تھی۔ حکیم عثمانی صاحب نے جب انچارج اسپتال کا عہدہ سنبھالا تو ہسپتال میں مریضوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ تحقیق کے لیے مطلوب مریض دستیاب ہونے لگے اور اس طرح سے یہ پروجیکٹ اپنی تکمیل کے مرحلہ کو پورا کر سکا۔

مرض برص کی تحقیق اور اس میں کونسل کی حصولیابیاں ناقابل فراموش ہیں۔ برص کے کلینکل پروگرام کے بہت سے نسخے عثمانی صاحب کے عنایت کردہ تھے۔ حکیم محمد خالد صدیقی کے عہد میں کونسل کی سیاسی سرپرستی کرتے رہے۔ وہ اپنے رسوخ اور ناخن تدبیر سے کونسل کے مسائل کو حل کر دیتے تھے۔

یقینی طور پر حکیم مظہر سبحان عثمانی کی رحلت سے طبی دنیا میں ایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے۔ ہمیں مدبر کائنات کی کارسازیوں سے ان کے بہترین متبادل کی توقع ہے۔ آج حکیم صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن انھوں نے علم و عمل کی ایسی شمعیں جلائی ہیں جن کی تنویر و تاثیر ہر دور میں محسوس جائے گی۔

ہاتھ اس نے چھڑا لیا ہے مگر
انگلی انگلی مہک رہی ہے ابھی

●●●

غزل

جسے تیرے غم نے سنوارا نہیں ہے
نہیں ہے وہ آنسو ہمارا نہیں ہے
کٹے زندگی دوسروں کے کرم پہ
ہمیں ایسا جینا گوارا نہیں ہے
بتاؤ ہمیں اب تمھیں یہ بتاؤ
کہاں ہم نے تم کو پکارا نہیں ہے
کہیں سایۂ گل میں تم سو نہ جانا
یہ طوفان ہے طوفاں، کنارا نہیں ہے
بہاریں بھی گلشن میں آئی ہیں لیکن
ابھی تک گلوں کو نکھارا نہیں ہے
وہاں سب کو اپنا بنانا ہے مظہرؔ
جہاں آج کوئی ہمارا نہیں ہے

میں تنہا نہیں ہوں رہِ زندگی میں
میری ہمتِ دل میری ہم سفر ہے
بہاریں بھی فانی، خزائیں بھی فانی
خوشی معتبر ہے نہ غم معتبر ہے
شب غم کی تاریکیوں سے لڑوں گا
کہ جب تک سلامت یقینِ سفر ہے
نظر کا اُٹھانا بھی مشکل ہے مظہرؔ
ہر اک گام پہ امتحانِ نظر ہے

حکیم مظہر سبحان عثمانی — تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے ایک مایۂ ناز فرزند

☆حکیم وسیم احمد اعظمی

ہندوستان میں طبِ یونانی کے دو دبستان ہیں، دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ، ان دونوں دبستانوں کا سلسلہ اوپر جا کر ایک ہی طبیب پر منتہی ہوتا ہے۔ ایشیاء میں طب کی نظریاتی بقاء اور اس کے فروغ میں اِن دبستانوں کی خدمات بہت اہم ہیں۔ جب ہم ان دبستانوں کی فکریات کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہیں تو دبستانِ لکھنؤ میں بقراطی فکر کے عناصر زیادہ تازگی اور فنی حرارت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس دبستان کے پیروکاروں میں عصری تناظر میں فن کے بقاء کے تئیں دانشوری اور دور اندیشی زیادہ ہے۔ رواداریٔ محض کے لیے فن کے مبادیات سے صرفِ نظر کرنا اِس دبستان والوں کے یہاں گناہِ عظیم ہے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی [ولادت: ۳۱/ جولائی ۱۹۳۸ء — وفات: ۱۵/ جنوری ۲۰۱۳ء] بھی دبستانِ لکھنؤ کے نمائندہ اطبّاء میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اُن کا مطب بقراطی فکر پر مبنی تھا، اُن کے نسخہ میں مزاجِ مرض اور مزاجِ مریض کے ساتھ ہی درجۂ مرض پر بھی خاص توجہ ہوتی تھی اور جہتِ نسخہ واضح ہوتی تھی اور یہی وصف اِس دبستان کا امتیاز اور افتخار تھا۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی کے اساتذہ میں شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین لکھنوی [وفات: ۲۹/ اپریل ۱۹۷۱ء] اور حکیم شکیل احمد شمسی [وفات: ۱۲/ نومبر ۱۹۸۵ء] دو ایسے نام ہیں، جن سے وہ بہت متأثر تھے۔ اول الذکر سے اُنہوں نے مطب اور نسخہ نویسی کے رموز سیکھے اور آخر الذکر سے فنی آگہی کے ساتھ عصری وجدان، دونوں ہی باکمال استاذ اور حاذق طبیب ہونے کے ساتھ اچھے معلم، مصنف، مقرر اور سماجی رہنما تھے، اِن کے نقوش حکیم مظہر سبحان عثمانی کی شخصیت کی تعمیر میں بہت گہرے تھے۔ شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین لکھنوی اور حکیم شکیل احمد شمسی کی حق گوئی اور اظہارِ خیال کی بیباکی کا ایک وافر حصّہ حکیم مظہر سبحان عثمانی کو ملا تھا۔ دنیا جانتی ہے ان کے کچھ سائڈ افکٹس بھی ہوتے ہیں، جن سے حکیم مظہر سبحان عثمانی کو اپنی زندگی میں بارہا واسطہ پڑا تھا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کو مطب و معالجہ کے ساتھ دوا سازی سے بھی بڑی مناسبت تھی، اُنہوں نے ۱۹۵۹ء میں تکمیل الطب کالج، لکھنؤ سے فراغت کے بعد ۱۹۶۰ء میں گورکھپور میں ہمدرد سے مطب کا آغاز کیا۔ وہ ۱۹۶۴ء میں چلے گئے اور جامعہ طبیّہ دہلی میں اُستاذ اور اس کے اسپتال کے انچارج مقرر ہوئے، ۱۹۶۹ء میں ہندوستانی دواخانہ کے انچارج کی ذمہ داریاں سنبھالیں، ۱۹۷۰ء میں آیورویدک اینڈ یونانی طبیّہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کے شعبۂ معالجات میں لکچرر ہوئے اور اضافی ذمہ داری کے طور پر اس کالج کے اسپتال کے یونانی شعبہ کی سربراہی بھی تفویض ہوئی۔

اخوت و مودت:

حکیم مظہر سبحان عثمانی بلند مرتبہ انسان تھے۔ وہ شفقت، محبت اور خلوص کے پیکر تھے، یقیناً اُن کے یہاں کچھ فروگزاشتیں بھی تھیں کہ انہوں نے بعض ناتواں اور ناقابلِ اعتماد سہاروں سے اپنی زندگی کو پُرآشوب بنا لیا تھا، لیکن اس طرح کی چیزوں کو بشری لاحقے کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ بنی نوعِ انسان کے ساتھ بحیثیت مجموعی اُن کا جو معاملہ تھا، وہ باہمی اخوت و محبت اور انسانی رواداری پر مبنی تھا۔ اُن کے معاصر اور رفیق کار حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی

☆ڈپٹی ڈائرکٹر، سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ

اُن کی داخلی اور باطنی صفات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''طبیعت میں بالکل کھلے دل کے آدمی، نہ کسی سے رقابت نہ عداوت، شاطر چالوں سے بے نیاز، عصبیت سے دور، سب سے محبت، سب سے خلوص، سب سے پیار، اگر کوئی بدظن ہے تو ہوا کرے، ان کی طبیعت پر میل نہ آئے گا، ایک مسکراہٹ سب کا جواب''۔[۱]

حکیم مظہر سبحان عثمانی کے مزاج میں گرو ہی تصادم نہیں تھا، نظریاتی اختلافات کی گنجائش ضرور تھی، لیکن جو کچھ تھا، سامنے کا تھا، پسِ پشت کوئی معاملہ نہ ہوتا تھا، جب کہ وہ جس ماحول میں جی رہے تھے وہاں 'پشتہا پشت' کی روایت تھی۔ اُنہوں نے اپنی زندگی میں جو کامیابیاں حاصل کیں، اس میں اُن کی سادہ لوحانہ بیباکی کو بڑا دخل تھا، اُن کے یہاں مصلحت کا کاروبار نہیں تھا، جو بھی ہے صاف ہے، واضح ہے اور کھلا ہوا ہے۔

ڈاکٹر خاور ہاشمی، جو حکیم مظہر سبحان عثمانی کے قریبی رہے ہیں اور طبّی امور میں اُن سے مشورے لیتے رہے ہیں، وہ اُن کی شخصیت اور مزاجی کیفیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''طبِ یونانی کے طویل سفر میں اُنہوں نے ہر قدم پر اپنے وجود کا احساس دلایا۔ اطبّاء کی ہر محفل میں وہ جانِ محفل بن کر رہے، اُن کی ذہانت، حاضر دماغی، حاضر جوابی، بے باکی اور جرأتِ رندانہ طبّی دنیا کو حرکت و عمل کا درس دیتی رہی۔ وہ نہایت صاحب الرائے، زود حس اور نکتہ سنج تھے، چند الفاظ سنتے ہی وہ معاملے کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔ زبان و بیان پر قدرت، ذکاوتِ حس، طباعی کی وجہ سے اُنہیں شہرت، عزت اور ہمیشہ صفحۂ اول [کذا] میں جگہ ملتی رہی۔ قیادت، سیاست اور طبابت اُن کی زندگی کے محور تھے۔''[۲]

خوش مزاجی و بذلہ سنجی:

حکیم مظہر سبحان عثمانی میں خوش مزاجی اور بذلہ سنجی بہت زیادہ تھی، اُن کی بذلہ سنجی کی زَد میں آنے والا مدت تک اس کی ٹیس دار حلاوت محسوس کرتا تھا، طبّی دنیا میں اُن کا بلند اور زندگی کی توانائیوں سے بھرپور قہقہہ مشہور تھا، لیکن اس میں بھی ایک طرح کی سنجیدگی اور سلیقہ ہوتا تھا۔ اُن کے بعض مصاحب ان قہقہوں کو غمِ زندگی سے اُن کی فرار کی کوشش قرار دیتے تھے۔ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس ایک ایسا پلیٹ فارم ہے، جس سے ملک کی ہر ریاست کے اطبّاء وابستہ ہیں، اس کی کانفرنسیں اُن میں زندگی اور گرم جوشی بھرنے کا اچھا موقع فراہم کرتی ہیں۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی ان میں اپنی بھرپور موجودگی درج کراتے اور معاصر اطبّاء کے ساتھ، علی گڑھ کی اصطلاح میں 'اُکٹی وٹی' میں اُنہیں بہت لطف آتا تھا اور اس کے لیے جس ذہانت اور سلیقہ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ حکیم مظہر سبحان عثمانی میں بدرجۂ اتم تھی۔

علاج معالجہ:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کو بحیثیت طبیب بلند مرتبہ حاصل تھا۔ اُنہوں نے اس شعبۂ میں طب کے دبستانِ لکھنؤ کی بھرپور نمائندگی کی تھی، گورکھپور، علی گڑھ اور دہلی میں اپنے مطب میں بقراطی نہج پر مطب کیا اور ایک زمانہ آپ کی حذاقت سے فیض یاب ہوا۔ حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی کے بقول حکیم مظہر سبحان عثمانی:

''بحیثیت طبیب ملک کے دارالسلطنت میں نیک نام ہیں۔ دلّی کی سیاست اور طبابت دونوں پر اُن کا قبضہ، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی یاد تازہ کر دیتا ہے''۔[۳]

مجھے حکیم مظہر سبحان عثمانی کی خدمت میں سہ ماہی 'جہانِ طب' اور دوسرے معاملوں میں بارہا حاضری کا موقع ملا، لیکن میں اُن سے جب بھی اُن کے درِ دولت پر ملا، مریضوں میں گھرا پایا، وہ دہلی اسکول کی رعایت سے مرکب دوائیں بھی لکھ دیا کرتے تھے، لیکن اُن کا اصل تشخص اور امتیاز مفرد دواؤں کے ذریعہ معالجہ میں ہی تھا، مریض بھی اسی حوالہ سے اُن کے پاس آتے تھے۔ امراضِ مزمنہ کے مریضوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہوتی تھی۔

کوی راج برھم دت شرما سابق پرنسپل آیوویدک اینڈ یونانی طبیّہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کی اس تحریر سے بھی میرے قول کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''طبیّہ کالج ہسپتال میں اُن کے پاس مریضوں کی بھاری تعداد کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے کہ آج سے بہت پہلے کے روایتی طرز کے حکیموں کے مطب میں مریضوں کا ہجوم ہے۔''[۴]

لکھنؤ طبّی اسکول کا امتیاز علاج بالمفرد تھا، لیکن اب صورتِ حال کچھ اور ہے، اس بارے میں حکیم مظہر سبحان عثمانی لکھتے ہیں:

''تکمیل الطب کالج میں فن نسخہ نویسی اور اصول مطب کو خاص اہمیت دی جاتی تھی، مگر بدقسمتی کہ آج اس فن پر کوئی توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔''[۵]

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے ساری زندگی مطب و معالجہ میں گزاری اور سچائی بھی یہی ہے کہ درس و تدریس کے بعد ان کی پہلی پسند علاج معالجہ ہی

تھا، اس میں معالج کا مریض سے براہ راست تعلق ہوتا ہے اور وہ اپنی حذاقت اور فنی مہارت سے مریض کی شفاء کے امکانات تلاشتا ہے اور شفایابی کے بعد جو خوشی مریض کو ہوتی ہے کچھ ایسی ہی خوشی معالج کو بھی ہوتی ہے اور اس طرح کی خوشیاں اور شادابیاں حکیم مظہر سبحان عثمانی کا مقدر تھیں۔

تصنیف وتالیف:

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے گرچہ زیادہ کچھ نہیں لکھا ہے، لیکن جتنا اور جس قدر بھی لکھا ہے اُس میں موضوع کی ندرت کے ساتھ تحقیق کی شان اور اندازِ بیان کی شادابی اور تازگی ہے۔ میرے مطالعہ میں اُن کی چند تحریریں اور اُن کی کتاب 'ٹیپو سلطان کے معالجات وتکنیکی تجربات' سلسلۂ مطبوعات مجلس تحقیقاتِ طبّی دہلی، مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی، دسمبر ۱۹۷۶ء کی فوٹو کاپی ہے، جو ازرہِ لطف وکرم عزیزی ڈاکٹر وسیم احمد، لکچرر شعبۂ کلیات، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور و نے عنایت کی ہے۔

واضح رہے کہ میں نے سہ ماہی 'جہانِ طب' نئی دہلی کے خصوصی شمارہ 'تکمیل الطب کالج نمبر' کی اشاعت جولائی - دسمبر ۲۰۰۲ء میں شامل مضمون 'تکمیل الطب کالج، لکھنؤ کے صاحبِ تصنیف اطبّاء' میں اس کتاب کا سنہِ اشاعت 'غالباً ۱۹۶۶ء' لکھا تھا، جو ایک علمی تسامح پر مبنی تھا، اس کی بڑی وجہ یہ کہ اُس مضمون کے لکھے جانے کے مرحلہ میں یہ کتاب میرے مطالعے میں نہیں تھی اور اُس وقت میری معلومات حکیم سید غلام مہدی رازؔ کے اس تبصرے پر تھی، جو کتابِ مذکور پر پندرہ روزہ ہمدرد، دہلی کی کسی اشاعت میں شامل تھا اور حکیم سید غلام مہدی رازؔ نے اپنی یادداشت کے بقدر مجھے اس کا سنہ اشاعت بتایا تھا۔ البتہ حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی کی ایک غیر مطبوعہ تحریر کے حوالہ سے جہانِ طب کے 'تکمیل الطب نمبر' میں اس کتاب کا تعارف کرایا تھا، قارئین کے لیے یہاں اُس کا اِعادہ کیا جارہا ہے:

> ''حکیم عثمانی مستقل کتابیں لکھنے کے عادی نہیں ہیں، لیکن جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کی جودتِ طبع آسمان پر پرواز کرنے لگتی ہے، اس کی بہترین مثال ان کی کتاب ٹیپو سلطان کے معالجات ہے، ٹیپو سلطان میں ایک طبیب کی تلاش ایک محقق ہی کرسکتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بات کو سطحی نظر سے دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو نہایت عمیق اور دقیق نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس میں کوئی نئی بات تلاش کر لیتے ہیں''۔[۶]

اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس کتاب کی فوٹو کاپی زیر مطالعہ ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے محتویات درج ذیل ہیں:

۱- مؤلف کے بارے میں
۲- انتساب
۳- تعارف: کویراج برھم دت شرما
۴- پیش لفظ: علی کوثر چاندپوری
۵- حرفِ آغاز
۶- سلاطین ہند کا علمی وطبّی ذوق
۷- اٹھارہویں صدی کے حالات
۸- ٹیپو سلطان کی مذہبی عقیدت
۹- جامع العلوم
۱۰- ٹیپو سلطان کا علمی ذوق
۱۱- فتح المجاہدین [کتاب]
۱۲- علاج مارگزیدہ
۱۳- سگِ دیوانہ کے کاٹ کھانے کا علاج
۱۴- خط بنام سید محمد قلعہ دار سرنگا پٹم
۱۵- خط بنام محمد غیاث خاں سفیر سلطنت خداداد
۱۶- خط بنام چشتی یار خاں
۱۷- ٹیپو سلطان کی تعلیم
۱۸- تحقیق وریسرچ کی حقیقی تڑپ
۱۹- علمی انحطاط کے اسباب
۲۰- خط بنام خواجہ اعتمادی
۲۱- کتابیات
۲۲- مجلس تحقیقاتِ علمی کے اغراض ومقاصد

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے اس کتاب کا 'انتساب' حکیم عبدالحمیدؒ دہلوی کے نام اِن لفظوں میں کیا ہے:

> ''عہدِ حاضر کے بیدار مغز مفکر عالی قدر جناب حکیم عبدالحمید صاحب دام اقبالہ [چیرمین ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن، دہلی] کے نام! جن کی خدماتِ جلیلہ کے بارِ احسان سے فنِ طب کبھی بھی سبک دوش نہیں ہوسکتا۔
>
> میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ شرفِ قبول
> پھول کچھ میں نے چنے ہیں اُن کے دامن کے لیے
>
> نیازمند
> مظہر سبحان عثمانی

اس کتاب کے تعارف میں کویراج برھم دت شرما نے حکیم مظہر سبحان عثمانی

کی شخصیت کا جن لفظوں میں تعارف کرایا ہے، اس سے حکیم صاحب کی بلند قامتی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، لکھتے ہیں:

''حکیم عثمانی صاحب کے بارے میں کچھ لوگوں نے مجھ سے [جن میں ہمدرد کے جامعہ طبیہ دہلی کے ذمہ دار حضرات بھی شامل تھے] غیر معمولی تعریف کی تھی۔ ۱۹۷۰ء میں جب وہ [حکیم عثمانی] ہندوستانی دواخانہ سے منتقل ہو کر کالج آئے اور لیکچرار معالجات کے ساتھ ہسپتال کے یونانی ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ کی ذمہ داریاں بھی انہیں سونپی گئیں، تو واقعی اُنہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا سکہ کچھ اس طرح بٹھایا کہ اس کے مقابلہ میں وہ تمام تعریفیں کم معلوم ہوئیں جو کہ اس سے پیشتر میرے گوش گزار ہوئی تھیں۔ آج کل کے نوجوانوں میں بحیثیت لکچرر، معالج اور صاحبِ قلم، ان کی خداداد صلاحیت اور ذہانت کا میرے اوپر نہایت خوشگوار اثر ہے۔''[۷]

اس کتاب کے پیش لفظ میں کوثر چاند پوری نے بھی اُن کی دانشوری کا اعتراف کیا ہے اور ایک اچھوتے موضوع پر تحقیق و کاوش سے قابلِ اعتماد مواد جمع کرنے کی بات کی ہے، لکھتے ہیں:

''کتاب مختصر ہے، مگر اِس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ موضوع میں جدت ہے۔ اس میں ٹیپو سلطان کے ذوقِ جستجو اور فنِ طب کے بہت سے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔''[۸]

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی اِس کتاب کے معرضِ وجود میں آنے کی روداد یہ ہے اُنہیں جنوری ۱۹۷۳ء میں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنگلور میں شرکت کا موقع ملا، اس مناسبت سے اُنہوں نے والی میسور ٹیپو سلطان کے علمی و طبّی ذوق کے حوالے سے ایک مضمون کانفرنس میں پڑھا، جسے بہت پسند کیا گیا۔ اس سفر میں میسور اور سرنگا پٹم کے سلطانی آثار دیکھنے کے بعد اُنہیں اپنے اس مضمون کو مزید وسعت دے کر کتابی شکل میں شائع کرنے کا خیال آیا، لیکن بعض دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اس کام کے لیے وقت نہیں نکال پائے، اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''میرا یہ مضمون جب اربابِ نظر کے مطالعہ سے گزرا تو اُنہوں نے اپنی غیر معمولی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کا مشورہ دیا، مگر افسوس کہ سلطان ٹیپو کی علمی شخصیت جس ہمہ گیری کی متقاضی تھی، نہ اس کا وقت ملا نہ وسائل و ذرائع مہیا ہو سکے نیز اہم مواد ایسی زبانوں میں ہیں، جن سے میں واقف نہیں ہوں، اس لیے بہتر یہی معلوم ہوا کہ 'سکونِ فردا' کے مزید انتظار کے بجائے جو کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے، شائع کیا جائے۔''[۹]

اس طرح والی میسور سلطان ٹیپو کے احوال اور علمی آثار پر ایک معتبر تحریر اردو طبّی ادب کو ملی۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کا ایک مضمون سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی کے زیرِ اہتمام شائع کتاب 'حکیم محمد کبیر الدین: حیات اور کارنامے' میں 'حنینِ ہندی: زبدۃ الحکماء علامہ حکیم محمد کبیر الدین' کے نام سے شامل ہے۔ اِس مضمون کے عنوان سے ہی حکیم محمد کبیر الدین کی شخصیت کا سب سے بڑا اور روشن پہلو سامنے آجاتا ہے۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی نے حکیم محمد کبیر الدین کو 'حنینِ ہندی' قرار دے کر ترجمہ و تالیف کی ایک شاندار تاریخ کی طرف اشارہ کیا ہے اور جو اُن کے کثیر المطالعہ ہونے کی غمازی کرتا ہے۔ عباسیوں کے بیت الحکمت میں ابوزید حنین بن اسحٰق العبادی [وفات: ۸۷۲ء] نے ترجمہ، تلخیص، تالیف اور تصنیف کے حوالے سے جو کام کیا ہے، اسی روایت کی پاسداری اردو زبان اور طبِ یونانی کے ہندوستانی مزاج اور ماحول میں حکیم محمد کبیر الدین نے کی ہے۔ اسی تناظر میں حکیم مظہر سبحان عثمانی لکھتے ہیں:

''قدیم و جدید نظریاتِ طب کے تعلق سے علامہ کا تقابلی مطالعہ بہت ہی وسیع و عمیق تھا۔ عربی، فارسی اور اردو لسانیات پر اُن کو قدرتِ کاملہ حاصل تھی، لاطینی زبان بھی جانتے تھے۔''[۱۰]

حکیم محمد کبیر الدین کی طبّی خدمات کے بارے میں چند اہلِ قلم اپنی معاندانہ سوچ سے مجبور، بعض کم مطالعہ ذہنوں میں تشکیک کے عناصر بھرنے میں سرگرداں ہیں، ایسی ہی سوچ رکھنے والوں پر ضربِ کاری لگاتے ہوئے حکیم مظہر سبحان عثمانی لکھتے ہیں:

''بعض لوگ یہ کہہ کر کہ وہ [علامہ حکیم محمد کبیر الدین] چند یونانی کتب کے مترجم تھے، اُن کے علمی قد کو چھوٹا کرنے کی مکروہ کوشش کرتے نظر آئیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر علامہ کی تخلیقی کاوشوں کو حذف کر دیا جائے تو یونانی طب کا اردو سرمایۂ ادب تہی دامن ہو جائے گا۔''[۱۱]

اسی حوالہ سے مزید لکھتے ہیں:

''اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ابھی تک علامہ کی طبّی خدمات کی اہمیت کا کما حقہٗ جائزہ نہیں لیا گیا۔''[۱۲]

حکیم مظہر سبحان عثمانی کے مراسمِ طبِ یونانی کی بیسویں صدی عیسوی کی ایک عبقری شخصیت حکیم محمد عبد الرزاق [وفات: ۸/اپریل ۱۹۹۲ء] بانی ڈائرکٹر سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی سے بڑے گہرے

تھے، حکیم عثمانی اُن کی کونسل کی متعدد کمیٹیوں کے رُکن تھے اور حکیم محمد عبدالرزاق اُن کے مشوروں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ حکیم محمد عبدالرزاق کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں حکیم عثمانی لکھتے ہیں:

''حکیم عبد الرزاق صاحب مرحوم کی ساری زندگی اور ان کی جدوجہد، ان کے کارنامے، ان کے شب وروز کا سفر، اُن کا حضر، ایک مسلسل رواں دواں زندگی کے مانند تھا، اُنہوں نے زندگی کے آخری لمحہ تک فنِ طبِ یونانی کی بقاء اور ترویج کے لیے صرف کیا۔ دراصل اُن کی پوری زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو نہ صرف اس زندگی کا، جو طالب علمی کے دور کے بعد کی زندگی ہے، بلکہ اس زندگی کا، جو دورانِ تعلیم ان کی زندگی تھی، تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ شروع ہی سے ایک کشمکش پسند طبیعت اور خصوصیات کے مالک تھے۔''[۱۳]

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے اپنے اس مضمون میں طب یونانی کے حوالہ سے ملک اور بیرونِ ملک میں حکیم محمد عبدالرزاق مرحوم کی خدمات کا بڑے وسیع تناظر جائزہ لیا ہے۔ جو حکیم صاحب سے اُن کے تعلق کے ساتھ طبِ یونانی کی صورتِ حال کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں طبِ یونانی کی جو بادِ صبا چل رہی ہے اور جو تدریس وتحقیق کا ماحول ہے اور اربابِ حل وعقد تک جو رسائی ہے، وہ حکیم محمد عبدالرزاق مرحوم اور اُن کے رفقاء کی سعی وجہد کا نتیجہ ہے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے 'حکیم اجمل خاں کا قومی تصور اور انقلابی کردار' کے عنوان سے آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کے ۹۱-۱۹۹۱ء کے سالانہ میگزین میں ایک مضمون لکھا ہے، جو حکیم عثمانی کے لب ولہجہ اور فکر کا عکاس اور ان کی شخصیت کی تفہیم میں معاون ہے، لکھا ہے:

''مسیح الملک حکیم اجمل خاں اگرچہ ایک روایتی طرز کے انسان تھے، مگر اُن کا ذہن انقلابی تھا۔ وہ اطبّاء کے ذہن میں، جہاں نہ کوئی روزن تھا نہ دروازہ، جو ایک گنبدِ بے در بنا ہوا تھا، نئی فضا اور نئی ہوا کی تازگی پیدا کرنا چاہتے تھے، معلومات کو سمیٹ کر نتائج کو اخذ کرنا اور تحقیق وتلاش سے ذہن منور کرنا اُن کا علمی موقف تھا۔ طبّیہ کالج کی درسیات میں مفید اضافات ہوں یا اس کے شعبۂ ریسرچ کے مقاصد، مجلس تحقیقاتِ طبّی کی غرض وغایت ہو یا نصابی اصلاحات کی مساعی ہوں یا یونانی دواسازی کی صنعت کو سائنٹفک راہ پر لانے کے لیے ہندوستانی دواخانہ کی تشکیل، ہر جگہ اُن کا نقطۂ نظر انقلابی نظر آئے گا۔ وہ علمی جمود اور فنی تعصب کے سخت مخالف تھے اور اسے طبِ یونانی کی موت کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔''[۱۴]

حکیم مظہر سبحان عثمانی اپنے مضامین کا عنوان بڑا جامع، واضح اور بولتا ہوا رکھتے تھے، عنوان پڑھ کر مضمون کی معنویت کا پتہ چل جاتا تھا، مثلاً 'مجاہد طب: حکیم محمد عبدالرزاق' مرتبہ ام الفضل وسید غلام مہدی میں شامل مضمون کا عنوان 'حکیم محمد عبدالرزاق۔۔ایک مقناطیسی شخصیت' رکھا تھا، اسی طرح آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کے سالانہ میگزین ۸۸-۱۹۸۷ء میں شامل خالص تکنیکی مضمون کا عنوان تھا 'یونانی طب میں استفراغ اور تنقیہ کی اہمیت، جس سے مبحث بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ اور حکیم عبدالحمیدؒ کے بارے میں 'الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے' کے عنوان سے حکیم محمد خالد صدیقی کی مرتب کردہ کتاب 'پیکرِ فکر وعمل۔ حکیم عبدالحمید' میں شامل مضمون حکیم عثمانی کے شاداب فکر اور شاداب قلم کی گواہی دیتا ہے۔

تصنیف وتالیف کا شغل عمیق مطالعہ اور ارتکازِ فکر کا متقاضی اور بڑا صبر آزما کام ہے۔ اس میں عجلت، علمی تساہلی اور تن آسانی کا گزر نہیں ہے، اس شغل کے ساتھ کوئی دوسرا کل وقتی کام نہیں کیا جا سکتا۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو حکیم مظہر سبحان عثمانی کی شخصیت میں مختلف الالوانی تھی اور تصنیف وتالیف جیسے کام کے لیے اُن کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اسی لیے اُنہوں نے مضامین لکھنے تک خود کو محدود رکھا اور اس طرح طبّی ادب کو ایک معتبر صاحبِ قلم ملنے سے رہ گیا۔

طب کے دبستانِ لکھنؤ کی ترجمانی:

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے اپنی ساری زندگی طبِ کے دبستانِ لکھنؤ کی ترجمانی میں گزاری۔ اُنہوں لکھنؤ میں جن اکابر فن کا زمانہ پایا تھا، اُن میں طب کی بقراطی بصیرت تھی۔ اس دبستانِ طب کے نمائندہ ادارہ تکمیل الطب کالج کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تکمیل الطب کالج طبِ یونانی کی طبیب سازی کی ایک تعلیمی درس گاہ ہی نہیں، بلکہ یونانی طبیب کی کردار سازی کی ایک عظیم تخلیق گاہ بھی رہی ہے۔ برِصغیر کا یہ ممتاز طبّی ادارہ کسی زمانہ میں ایک طبّی تحریک کا درجہ رکھتا تھا۔ تکمیل الطب کالج کے بانی حکیم عبدالعزیز اور اکابرین [کذا] جن میں شفاء الملک حکیم عبدالحمید، شفاء الملک حکیم عبدالرشید، شفاء الملک حکیم عبدالمعید، شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی، استاذی حکیم شکیل احمد شمسی جیسے نامور فرزندانِ طب، طب یونانی کے اسی خدوخال کی بقاء کے لیے ہمیشہ حساس اور کوشاں رہے۔''[۱۵]

لکھنؤ اور دہلی کے طبّی دبستانوں کا قضیہ اگرچہ بہت پرانا تھا، لیکن

۱۹۰۶ء میں حکیم محمد اجمل خاں کے ذریعہ قائم 'آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبّی کانفرنس' کے قیام کے بعد کسی قدر شدت کے ساتھ سامنے آیا۔ کانفرنس کے دہلی اجلاس منعقدہ ۲۷۔۲۶ نومبر ۱۹۱۰ء کے بعد اس میں اور بھی شدت آگئی، اب معاملہ فنی شناخت کے ساتھ اغمازِ حقیقت اور تحریفِ نظریات کا بھی ہوگیا تھا۔ کانفرنس کی تائید اور تردید میں جلسوں، تقریروں اور مضامین کا گویا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ طبّی اور غیر طبّی اخبارات اور رسائل بھی بظاہر دو خیموں میں منقسم نظر آرہے تھے اور ہر خیمہ اپنے ہم خیال کی ترجمانی کرتا نظر آرہا تھا۔ ایک تیسرا خیمہ بھی تھا، جو تائیدی اور تردیدی، دونوں طرح کے مضامین شائع کر کے اپنی صحافتی ذمہ داریاں نبھا رہا تھا۔ رفیق الاطبّا لاہور، مجلّہ طبّیہ دہلی اور اخبار دیش اُپکارک لاہور، کانفرنس کے خاص آرگن اور ترجمان تھے۔ رسالہ حکمت لاہور، اخبار کرزن گزٹ دہلی اور آل انڈیا شیعہ گزٹ لکھنؤ، میں کانفرنس کی مخالفت میں مضامین چھپتے تھے۔ اخبار نیر اعظم مرادآباد، پیسہ اخبار، لاہور، اخبار وکیل، امرتسر، اودھ اخبار لکھنؤ، تفریح لکھنؤ، الپنچ بانکی پور، صحیفہ بجنور اور اخبارِ مشرق گورکھپور میں دونوں خیموں کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی [وفات: ۱۳—۱۴ نومبر ۱۹۷۰ء کی درمیانی شب] کی دبستانی صحبت اُٹھائی تھی، انہوں نے دبستانِ دہلی کے نمائندہ حکیم بی این شرما کے ایک مضمون بعنوان ''شدھ کا تصور: طب اور سائنس میں'' کا جواب اُنہوں نے 'طب میں شدھ کا تصور اور اس کا پس منظر' کے عنوان سے پندرہ روزہ مسیحا، بمبئی کے یکم دسمبر ۱۹۶۴ء کے شمارے میں دیا تھا۔ شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین اور حکیم شکیل احمد شمسی سے اکتسابِ فیض کیا تھا، اسی لیے اُن کے مزاج میں دبستانِ لکھنؤ کی علمی وفنی بصیرت کا وجدان تھا اور اُنہوں نے طب کے دبستانِ دہلی کے قلب میں بیٹھ کر دبستانِ لکھنؤ کی ترجمانی اور وکالت کی۔

سہ ماہی 'جہانِ طب' نئی دہلی کے 'تکمیل الطب کالج نمبر' کے لیے اپنے پیغام میں لکھتے ہیں:

> ''انیسویں صدی کا نصف آخر جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط مکمل ہوا تو تہذیبی اور علمی تصادم کا ایک چیلنج بھی سامنے آیا، جس کا مقابلہ اربابِ مدرسہ تکمیل الطب نے بکمال بصیرت وہوشمندی کیا، ان حضرات نے قدم قدم پر ان خطرات کو محسوس کیا، جو انگریزی طب کے افکار وابلیات کے سامنے ہندوستانی طریقۂ علاج کو درپیش ہوا۔''[۱۶]

وقت اور حالات نے بھی دبستانِ لکھنؤ کی طبّی دانشوری کی توثیق کردی کہ یونانی طب ایک الگ نظامِ علاج ہے، آیورویدک الگ اور ایلوپیتھی، ان دونوں سے بھی الگ۔ اوّل الذکر دونوں کے اپنے کلیات اور مبادیات ہیں، جن پر ان کی اساس ہے۔ ان کو رواداری کے مصلحتی اور وقتی تقاضے کی بھینٹ چڑھانا فنی دیانت اور طبّی اخلاقیات کے منافی ہے۔

درس وتدریس:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی عمر کا بڑا حصہ درس وتدریس میں گزرا ہے، وہ اِس کو ایک مقدس فریضہ تصور کرتے تھے اور اس کا اہتمام بھی کچھ اسی انداز سے کرتے تھے۔ میں نے اپنے ایک مضمون 'تکمیل الطب کالج کے صاحبِ تصنیف اطبّاء' مطبوعہ 'جہانِ طب' نئی دہلی میں ان کے تدریسی انداز کے بارے میں لکھا ہے:

> ''قدیم طبّی ادبِ عالیہ اور عصری طبّی ادب، دونوں پر اُن کی نظر ہے، اس لیے قدیم طبّی مسلمات، عصری آگہی کے تناظر میں جس منطقی توجیہ اور استدلال کے ساتھ بیان کرتے ہیں، وہ اُن کے تلامذہ اور معاصرین کے لیے جس قدر پُر کیف ہوتا ہے، اسی قدر خود حکیم عثمانی کے لیے سرور آگیں بھی۔'' [۱۷]

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی آواز بڑی پاٹ دار اور واضح تھی، کلاس روم میں ٹہل ٹہل کر پڑھانے کا اُن کا انداز طلبہ میں اعتماد اور ذہنی اور فکری ارتکاز کا موجب ہوتا تھا، اُن کے کئی شاگردوں نے مجھے بتایا کہ وہ طبّی مباحث کو اس طور سمجھاتے کہ گویا گھول کے پلا دیتے۔ اُن کا درس طلبہ میں فن کے تئیں اعتماد پیدا کرتا تھا اور جب وہ عملی میدان میں قدم رکھتے تھے تو حکیم عثمانی کا پڑھایا ہوا سبق رہنمائی کرتا تھا۔ یہ سچائی بھی ہے کہ جس کسی پر طب کے مبادیات اور کلیات واضح ہوں گے، اس کا درس بھی پُر اعتماد ہوگا اور دوسروں میں بھی اعتماد پیدا کرے گا، اور یقیناً حکیم مظہر سبحان عثمانی کو یہ اعتماد، امتیاز اور اختصاص حاصل تھا۔

تقریر وخطابت:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کو اللہ تعالیٰ نے جن سعادتوں سے نوازا تھا، اُن میں سے ایک اُن کے لہجے کی عذوبت اور تکلم کی موسیقیت تھی۔ جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی خودنوشت 'یادوں کی بارات' میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے بارے

میں غالباً کچھ ایسا لکھا تھا کہ 'وہ [پنڈت جواہر لعل نہرو] اپنے رنگ کی لطافت، لہجے کی عذوبت اور تکلم کی موسیقیت کے اعتبار سے ایسے انسان تھے، جو اس کرۂ ارض پر صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں'۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ سرخ و سپید رنگت، دراز قامتی، طالع کی درخشانی اور صوتی آہنگ کے ساتھ جب وہ عوامی جلسوں اور سائنٹفک کانفرنسوں میں خطاب کرتے تھے تو سُننے والوں میں ایک طرح کی سُرور آگیں کیفیت پیدا ہو جاتی، وہ اُن کی سحر بیانی کے اثرات سے ذرا سنبھلتے تو اُن کی فنی موشگافیوں کے حصار میں آجاتے۔ لیکن یہ سب کچھ اُسی کے ساتھ ہوتا، جو فہم و فراست کا کچھ حصہ رکھتا بھی ہو۔ اُنہیں تقریر میں جو غیر معمولی مہارت حاصل تھی، غالباً علومِ شرقیہ کی دین تھی کہ وہ اپنے موقف کو بڑی وضاحت، صراحت اور بیباکی سے رکھتے تھے۔ حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی کے بقول:

> ''فن تقریر میں اس قدر حاوی ہیں کہ ملک کی فعال سیاست میں ان کا ایک مقام ہے اور بحیثیت طبیب ملک کے دار السلطنت میں نیک نام ہیں۔ دلی کی سیاست اور طبابت دونوں پر ان کا قبضہ ہے، مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی یاد تازہ کر دیتا ہے''۔[۱۸]

اُن کی تحریروں کی صوتیات کے تجزیہ کرنے سے اُن میں بھی خطابت کی شان پائی جاتی ہے۔

صحافت و مزاح:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کے مزاج کو صحافت سے یک گونہ مناسبت تھی، اُنہوں نے درسِ نظامیہ کی تکمیل کا جو دور پایا تھا، اُس میں دیواری رسالوں کا بڑا رواج تھا۔ دینی مدارس کے طلباء اپنی صوبائی انجمنوں اور اقامتی ہالوں کی طرف سے یہ خطّی رسالے ایسی جگہ دیواروں پر آویزاں کرتے، جہاں سے طلباء، اساتذہ اور عام لوگوں کا گزر ہوتا، ان رسالوں میں دینی مضامین کے علاوہ شعر و ادب اور طنز و مزاح کی بھی جگہ ہوتی تھی۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی کے صحافیانہ مزاج کو لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں حکیم شکیل احمد شمسی اور اُس وقت کے تکمیل الطب کالج کے ماحول میں اور بھی جِلا ملی کہ اس وقت کے لکھنؤ سے متعدد علمی، ادبی اور طبّی رسالے اور جریدے شائع ہو رہے تھے۔ ماہنامہ تکمیل الطب کو بند ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں بیتے تھے، اس کے ایڈیٹر حکیم شکیل احمد شمسی خود حکیم مظہر سبحان عثمانی کے استاذ، مربی اور آئیڈیل تھے، حکیم صابر رضا ادیبؔ کے 'الطبیب' کا غلغلہ ابھی ذہنوں میں تازہ تھا۔

لکھنؤ کے طبّی ماحول اور حکیم شکیل احمد شمسی کی صحبت کا ہی اثر تھا کہ حکیم مظہر سبحان عثمانی نے تکمیل الطب کالج سے ایک طبّی رسالہ 'پرواز' کے نام سے نکالا تھا، اس کام میں ان کے خاص معاون حکیم شبیب رضوی تھے، جو بعد میں سری نگر [جموں و کشمیر] گورنمنٹ ڈسپنسری میں ملازم ہوئے۔ حکیم شبیب رضوی کا نام میں نے حکیم سید غلام مہدی رازؔ سے بار ہا سُنا تھا، ایک بار اُن سے دہلی میں حکیم رازؔ صاحب کے دولت کدہ پر ملاقات بھی ہوئی تھی۔ بہر حال اس رسالہ نے طلبہ تکمیل الطب کالج کی بھرپور ذہن سازی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

لکھنؤ سے شائع ہونے والے علمی و سیاسی پندرہ روزہ 'برادری' سے حکیم مظہر سبحان عثمانی کی سرگرم عملی وابستگی بھی اسی ماحول کی دین تھی۔ یہ پندرہ روزہ عالمی انسانی برادری کا ترجمان اور ملّی اخوت و مساوات کا علمبردار تھا، اس کے مدیر اعلیٰ حافظ عبد الحفیظ صدیقی اور شریک مدیر حکیم مظہر سبحان عثمانی تھے، اس کا اداریہ حکیم مظہر سبحان عثمانی کے قلم سے ہوتا تھا۔ حکیم عثمانی نے ایک موقع پر راقمِ حروف کو بتایا تھا کہ وہ ماہنامہ تجلّی، دیوبند کے مُلّا ابن العرب مکّی کے کالم 'مسجد سے میخانے تک' کے طرز پر 'امرود بخت شاہجی' کے قلمی نام سے 'کعبہ سے بت خانے تک' کے عنوان سے ایک مزاحیہ کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ جس کو مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا عامر عثمانی نے بھی پسند فرمایا تھا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کا طبّی صحافت سے رشتہ تکمیل الطب کالج، لکھنؤ سے فراغت کے بعد بھی منسلک تھا، وہ بریلی سے حکیم مولوی اعجاز احمد خاں جذبیؔ تکمیلی کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ 'دکھ سُکھ' کی مجلس ادارت میں شامل تھے، یہ رسالہ حکیم شکیل احمد شمسی کی سرپرستی میں نکلتا تھا، اس رسالہ کا مزاج طب کے دبستانِ لکھنؤ کا تشکیل کردہ تھا، جس کا اظہار بھی ہوتا رہتا تھا، اس کی ادارت میں حکیم عثمانی کے علاوہ حکیم مولوی عبد الجلیل، حکیم سید ظل الرحمٰن اور حکیم اے جے پرویز تکمیلی شامل تھے۔ میں نے اس رسالہ کے ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۵ء کے بیشتر شمارے جامعہ ہمدرد، نئی دہلی کی حکیم محمد سعید سنٹرل لائبریری میں دیکھے تھے اور ان کی تفصیلات اپنی کتاب 'اردو طبّی رسائل و جرائد: برِصغیر ہندو پاک میں، میں بھی درج کی ہیں۔

شعر و شاعری:

حکیم مظہر سبحان عثمانی شعر و شاعری سے بھی غیر معمولی شغف تھا، رحمیؔ

اور مظہرؔ تخلص کرتے تھے، حکیم شکیل احمد شمسی کی سرپرستی میں اُن کی شاعری کو اور بھی جِلا ملی تھی۔ تحصیلِ طب کے بعد حکیم عثمانی جب گورکھپور آئے تو وہاں کی علمی، ادبی سرگرمیوں اور شعر و سخن کی محفلوں کے روحِ رواں بن گئے اور گورکھپور کی ایک ادبی تنظیم 'مرکز ادب' کے نائب صدر منتخب ہوئے، یہاں اُن سے تعلق رکھنے والوں میں ایم کوٹھیاوی راہیؔ اور ہندیؔ گورکھپوری کے نام اختصاص کے ساتھ لائقِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر خاور ہاشمی کو حکیم مظہر سبحان عثمانی کی شخصیت میں اُن کے شاعر ہونے کا شدت سے احساس تھا، لکھتے ہیں:

> ''عثمانی صاحب طبیب نہ ہوتے تو شاعر ہوتے۔ اُن کی طبیعت میں ایک فنکاری اور پُرکاری تھی۔ اُن کا ذہن لطافت پذیر، حساس اور صناع تھا۔ اُنہوں نے شاعری کی زندگی کے تجربات سے گزرنے اور نکھرنے کے بعد اُن کے اشعار اور جذبات اشعار میں ڈھلنے لگے تھے۔ [کذا] عثمانی صاحب کی زندگی کا یہ پہلو بہت سوں کی نظر سے اوجھل رہا ہے، کیونکہ غالبؔ کی طرح اُنہوں نے شاعری کو ذریعۂ عزت نہیں بنایا۔'' [۱۹]

حکیم غلام مہدی رازؔ سے حکیم مظہر سبحان عثمانی کے طبّی اور ادبی شعری مراسم تھے، وہ اُن کی شعری کائنات سے واقف تھے اور اس کی بڑی قدر کرتے تھے، لکھتے ہیں:

> ''عثمانی صاحب ایک اچھے شاعر تھے۔ وہ اپنا مجموعۂ کلام شائع کرنا چاہتے تھے اور راقم الحروف سے اپنے اِس خیال کا اظہار بھی کیا تھا۔ ممکن ہے راقم الحروف اس سلسلے میں اُن کی معاونت کرتا، مگر یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا اور ایک قابلِ قدر شعری سرمائے سے محروم ہوگئے۔'' [۲۰]

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی ادبی زندگی پر بھی حکیم شکیل احمد شمسیؔ کے اثرات واضح تھے اور وہ لکھنؤ کے زمانۂ قیام میں شعر کہنے لگے تھے اور اس میں بھی اُن کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ استاذِ محترم کی پیروی ہو۔ چنانچہ جب اُنہیں حکیم شمسیؔ کا مجموعۂ کلام 'قیدِ حیات و بندِ غم' ملا، تو اسی لب و لہجہ کی متعدد غزلیں کہی تھیں۔

ملکی سیاست:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کا سیاست کی طرف رجحان اُن کے زمانۂ طالب علمی سے تھا، لکھنؤ میں بھی اُن کی سرگرمیاں طلبہ میں قائدانہ نوعیت کی تھیں، پہلے وہ طبّی سیاست میں دلچسپی لیتے تھے، بعد میں ملکی سیاست میں بھی سرگرم ہوگئے، اس کے پسِ پردہ حق گوئی اور بیباکی کے ردِعمل کا نفسیاتی تحفظ بھی تھا۔ آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ میں ملازمت کے دوران وہ جن حالات سے گزرے تھے، اس کے لیے کسی سیاسی جماعت سے وابستگی کو اُنہوں نے خود پر لازم کرلیا تھا، اسی لیے اُنہوں نے ۱۹۶۶ء میں جن سنگھ [اب بی جے پی] کی ممبر شپ اختیار کرلی تھی۔ اسی وابستگی کی وجہ سے وہ ۱۹۹۴ء میں شری اوم پرکاش کوہلی کے دورِ صدارت میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے اور سارے ملک میں بالعموم اور دہلی میں بالخصوص اس پارٹی کی تشہیر کے لیے بہت کام کیے۔ چونکہ وہ بڑے اچھے مقرر تھے، اس لیے بھارتیہ جنتا پارٹی کے اُس وقت کے صفِ اول کے رہنماؤں، اٹل بہاری واجپئی، لال کرشن ایڈوانی، سکندر بخت، مدن لال کھورانہ، شری اوم پرکاش کوہلی اور وجئے کمار ملہوترا سے بہت اچھے اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے جس دور میں جن سنگھ کی رکنیت اختیار کی تھی، اُس دور میں اُن کے طبقے کا کوئی فرد اس پارٹی سے وابستگی کی سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لیکن حکیم عثمانی کے مزاج میں بیباکی اور تفرد کے عناصر زیادہ تھے اور جس چیز کو وہ بہتر سمجھتے، وہی کرتے تھے، اس سے قطعِ نظر کہ لوگ کیا کہیں گے، زمانہ کیا کہے گا؟ اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ اسی طور گزرا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی سے اُن کی بشدت وابستگی کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ ۱۹۹۵ء میں دہلی پردیس بی جے پی کے نائب صدر، ۱۹۹۶ء میں بی جے پی اقلیتی مورچہ کے قومی جنرل سکریٹری اور ۱۹۹۷ء میں قومی صدر مقرر ہوئے۔ علاوہ ازیں ۱۹۹۸ء میں اسمبلی اور لوک سبھا کی بی جے پی کی الیکشن کمپیئن کمیٹی کے رکن نامزد ہوئے۔ ۲۰۰۳ء میں قومی اقلیتی کمیشن کے وائس چیئرمین مقرر ہوئے اور اس منصب پر ۲۰۰۶ء تک فائز رہے۔ جب وہ اس کمیشن کے وائس چیئرمین تھے تو اس عرصہ میں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی کے کاموں سے اُن کے آفس نیشنل کمیشن فار مائنارٹیز، لوک نائک بھون، نئی دہلی میں بارہا حاضری کا موقع ملا اور اُن کی خُرد نوازی کی حلاوت سے سرشار ہوا۔

ایک تجویز:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی تحریروں میں طبّی مبادیات اپنے جملہ کوائف اور تمام تر آداب کے ساتھ موجود ہیں، اُنہوں نے جس موضوع پر

بھی قلم اُٹھایا ہے، اس کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ اُن کی یہ تحریریں کمیت کے اعتبار سے بہت زیادہ نہیں ہیں، میرا خیال ہے کہ بیس پچیس مضامین ہی ہوں گے، لیکن ان میں کیفیت، توانائی اور حرارت ہے۔ ان کے یہ مضامین اِدھر اُدھر منتشر ہیں، کچھ تو شخصیات اور حیات اور خدمات کے جائزے پر مبنی کتابوں اور رسالوں میں ہیں اور زیادہ تر آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کے سالانہ میگزینوں میں۔ اگر انہیں تلاش کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے تو یقیناً یہ طبّی ادب میں ایک اہم اضافہ ہوگا اور اُن کی یہ منتشر تحریریں بھی محفوظ ہو جائیں گی۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی ایک معتبر شاعر بھی تھے، اُن کا شعری سرمایہ بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن جو بھی اور جس قدر بھی ہے، پڑھنے لائق ہے، اگر اُنہیں بھی شائع کر دیا جائے تو حکیم عثمانی کی زندگی کی مختلف الالوانی کا ایک اور لون [رنگ] سے اہلِ نظر روشناس ہوں گے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے ایک ایسے فرزند رہے ہیں، جن پر صرف تکمیل الطب کالج کو ہی نہیں بلکہ طب میں بقراطی نظریات کیہر حامی اور موید کو ناز ہے۔ اُن کی شخصی اور علمی جہات میں بڑی مختلف الالوانی تھی، جس کی توقیت بہت آسان نہیں ہے، لیکن یہ بات تو بڑے اعتماد سے کہی جا سکتی ہے کہ اُن کی شخصیت کا ہر پہلو بڑا شاداب اور جاذبِ نظر رہا ہے۔

حوالہ جات

۱- سہ ماہی جہانِ طب، تکمیل الطب کالج کے صاحبِ تصنیف اطبّاء، حکیم وسیم احمد اعظمی، تکمیل الطب کالج نمبر، جلد۴، شمارہ۲، ۱، ص ۲۹۸

۲- ماہنامہ ہمدرد، جلد ۵۶، شمارہ۲، ص۳

۳- سہ ماہی جہانِ طب، تکمیل الطب کالج کے صاحبِ تصنیف اطبّاء، حکیم وسیم احمد اعظمی، تکمیل الطب کالج نمبر، ۴، شمارہ۲، ۱، ص ۱

۴- تعارف، ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات: ص ۷

۵- سہ ماہی جہانِ طب، تکمیل الطب کالج نمبر، جلد۴، شمارہ۲، ۱، ص ۱

۶- ایضاً: ص ۲۹۹

۷- تعارف: ٹیپو سلطان کے کے معالجات و تکنیکی تجربات: ص ۷

۸- ایضاً: پیش لفظ: ص ۱۰

۹- ایضاً: حرفِ آغاز: ص ۱۱

۱۰- ایضاً: حکیم محمد کبیر الدین: حیات اور کارنامے، ص ۱۴

۱۱- ایضاً: ص ۱۴

۱۲- ایضاً: ص ۱۴

۱۳- مجاہدِ طب: حکیم محمد عبدالرزاق، ص ۵۷

۱۴- 'آشیانہ' سالانہ میگزین، آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی، ۹۱-۱۹۹۰ء، ص ۶-۵

۱۵- سہ ماہی جہانِ طب، تکمیل الطب کالج نمبر جلد۴، شمارہ۲، ۱، ص ۱

۱۶- ایضاً: ص ۱

۱۷- ایضاً: ص ۲۹۸

۱۸- ایضاً: ص ۲۹۸

۱۹- ماہنامہ ہمدرد، جلد ۵۶، شمارہ۲، ص ۳

۲۰- ایضاً: ماہنامہ ہمدرد، جلد ۵۶، شمارہ۲، ص ۵

کتابیات

۱- احمد، حماد [۲۰۱۳ء] ماہنامہ ہمدرد، ہمدرد دواخانہ، دہلی

۲- احمد، سہیل [۲۰۱۳ء]، پروسیڈنگ آف نیشنل سمینار آن ایمرجنگ ٹرینڈس اِن دی ڈیولپمنٹ آف یونانی سسٹم آف میڈیسن، اسٹیٹ تکمیل الطب کالج اینڈ ہاسپٹل، لکھنؤ، مطبع ارون پروفیسنل سروس، چوک، لکھنؤ

۳- ام الفضل، مہدی، حکیم غلام [۲۰۱۰ء] مجاہدِ طب: حکیم محمد عبدالرزاق، ناشر: حکیم محمد عبدالرزاق ریسرچ فاؤنڈیشن فار یونانی میڈیسن، حیدر آباد، طابع: ریکمو پریس، پرائیویٹ لیمیٹڈ، نئی دہلی

۴- خاں، محمد طارق [۹۱-۱۹۹۰ء] آشیانہ، سالانہ میگزین، آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی

۵- صدیقی، حکیم محمد خالد، مہدی، حکیم غلام، خاں، مہر عالم [۱۹۹۵ء]، حکیم محمد کبیر الدین: حیات اور کارنامے، ناشر سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی طابع ونایک گرافکس، نئی دہلی

۶- صدیقی، حکیم محمد خالد] جون۔ اگست ۱۹۹۹ء] ٹیپو سلطان کا علمی وطبّی ذوق، حکیم مظہر سبحان عثمانی، جہانِ طب، جلد، شمارہ ۱، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

۷- صدیقی، حکیم محمد خالد [۲۰۰۲ء]، تکمیل الطب کالج کے صاحبِ تصنیف اطبّاء، حکیم وسیم احمد اعظمی، تکمیل الطب کالج نمبر، سہ ماہی جہانِ طب، نئی دہلی

۸- ظل الرحمٰن، حکیم سید [۲۰۰۹ء اشاعتِ دوم]، تذکرہ خاندانِ عزیزی، انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس، علی گڑھ

۹- عبدالرزاق، حکیم محمد [۱۹۸۷ء]، حکیم شکیل احمد شمسی: شخصیت اور خدمات، ناشر آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، دہلی، طابع بھارت آفسیٹ، دہلی

۱۰- عثمانی، حکیم مظہر سبحان [دسمبر ۱۹۷۶ء]، ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات، الجمعیۃ پریس، دہلی

●●●

کاغذ کا غذ دھول

☆ایم۔اے۔فاروقی

باوجود کئی نسبتوں کے حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب سے میری صرف تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ یہ ملاقاتیں بھی بڑی مختصر تھیں، میں نے ان کا نام اور ان کی شہرت ضرور سنی تھی، مگر صورت آشنا نہ تھا۔ میں مردم بیزار، ایک مخصوص حلقے میں مقید، بڑے اور مشہور لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ وحشت محسوس کرتا تھا، ان کی دید کا کوئی خاص اشتیاق بھی نہ تھا، مگر کچھ ایسی تمہید بنی کہ ان کے درِ دولت کدہ کو دستک دینے پر مجبور ہو گیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۹۹۶ء میں مجھے خفقان کا عارضہ لاحق ہوا، اعلیٰ علاج کے لیے ایمس دہلی کے شعبۂ امراض قلب میں گیا۔ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر راحت محسوس ہوئی کہ ''مرگ انبوہ جشنے دارد'' ایسا لگا کہ ساری دنیا سمٹ کر ایک ہال میں آ گئی ہے۔ صدر شعبہ ڈاکٹر بہل کے نام بنارس ہندو یونیورسٹی کے ایک ممتاز ڈاکٹر کا خط لایا تھا، ڈاکٹر بہل کی خصوصی توجہ سے جانچ کے سارے مراحل جلد ہی طے ہو گئے، مگر اس وقت سخت ناامیدی ہوئی جب ڈاکٹر صاحب نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ آپ کو دل کی کوئی بیماری نہیں ہے۔ بہت مایوس ہوا، ساری محنت اکارت گئی، ڈاکٹر کو نالائق قرار دیا، سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ ان لوگوں کو کیا جواب دوں گا، جن کی ہمدردیاں پیشگی وصول کر چکا تھا اور جنھوں نے از راہ ترحم بخیریت واپس آنے کی دعائیں دی تھیں۔ عزیزی دانش میاں، جو مجھے اسی طرح عزیز ہیں جس طرح میرے صاحبزادے احمد سعید، حکیم عثمانی صاحب کو عزیز تھے، وہ کہنے لگے: ''ابو ایک بار پاپا کو بھی دکھلا دیجیے، یونانی طریقۂ علاج امراض قلب میں بڑا ایڈوانس ہے'' میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے حامی بھر لی اگرچہ مجھے یونانی دواؤں پر زیادہ بھروسہ نہیں تھا نہ واقفیت ہی تھی۔

عثمانی صاحب سے یہ پہلی ملاقات محض ایک معالج اور مریض کی ملاقات تھی، لیکن اس کی یادیں آج بھی میری یادداشت میں فاسفورس کی طرح چمک رہی ہیں۔ میں نے تصور میں ان کا پیکر روایتی حکیموں جیسا تراشا تھا یعنی لحیم جسم، ایک عدد شرعی اور مقطع داڑھی، کالی شیروانی اس سے میچ کرتی ہوئی رامپوری ٹوپی، چوڑی مہری کا پاجامہ مگر ان کو دیکھ کر میرا تراشیدہ پیکر فضا میں بکھر گیا، گوری رنگت، چھریرا بدن، سرو قد، چمکدار آنکھیں، پیشانی ذہانت کی غماز، چہرہ کتابی، لبوں پر رینگتی ہوئی مسکراہٹ، تیکھے نقش و نگار، سفید باریک کرتا پاجامہ زیب تن کیے ہوئے، ان کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ضرور تھی، جس سے میں خاصا مرعوب ہو گیا اور سلام تک کرنا بھول گیا۔ حکیم جی نے پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا اور بڑی اپنائیت سے کہا:

''آیئے مولانا! تشریف رکھئے، پہلے آپ کے دل کی خیریت معلوم کر لوں''۔

نبض پر انگلیاں رکھیں پھر سینہ اور پشت کو ٹھونکا بجایا۔ میں نے عرض کیا:

''حکیم صاحب رپورٹس بھی تو دیکھ لیں''۔

شان استغنائی سے گویا ہوئے:

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ماشاءاللہ آپ کا دل آپ سے زیادہ

☆ استاذ، جامعہ سلفیہ، وارانسی

تندرست ہے، خوش رہیے اور بچوں کو پریشان کرنا ترک کر دیجیے''۔

میرے چہرے پر ناپسندیدگی اور رنج کے آثار ہویدا تھے۔ فوراً بھانپ گئے اور فرمایا: ''خفقان کی وجہ دل نہیں بلکہ دماغ ہے، افکار و خیالات کو دور رکھیے اور تناؤ سے بچیے، میں کچھ دوائیں لکھ دیتا ہوں مستقل کھاتے رہیے، آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی''۔ حکیم صاحب نے یادگار ضیافت کے ساتھ رخصت کیا۔

عثمانی صاحب مجھے حکیم سے زیادہ شاعر لگے، انہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے کیف بھوپالی یاد آ گئے اس وقت تو دونوں میں قدر مشترک نہ دریافت کر سکا، مگر کچھ عرصہ بعد وجہ شبہ کا انکشاف ہو گیا۔ حکیم جی سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں تھا، وہ میرے بزرگ اور عمر میں بہت بڑے تھے اس لیے دوست بھی نہیں کہہ سکتا ہوں، نہ ہم مشرب اور ہم پیشہ تھے کہ ان سے قربت اور نزدیکیوں کے واقعات میرے شعور کے خزانے میں محفوظ ہوں، بس بیکراں خلوص و محبت کا ایسا مستحکم رشتہ قائم تھا جس کی بنیاد بے غرضی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں کے گھرانے شیر و شکر تھے اور دکھ سکھ میں ایک دوسرے کے شریک تھے کہ آج تک قریب سے جاننے والے یہی سمجھتے ہیں کہ ہم لوگوں میں نزدیکی قرابت داری ہے۔ یہ میری بدقسمتی اور لاابالی پن تھا کہ عثمانی صاحب کی محبتوں اور شفقتوں کے باوجود پہلی ملاقات کے بعد کئی سالوں تک ان کی دید سے محروم رہا، یہ دوسری بات ہے کہ میرے بچوں نے ان کے گھر کو اپنا گھر بنا لیا تھا، حکیم صاحب میرے گھر کے ہر فرد کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے۔ دنیا والوں کے لیے وہ ہندستان کے چند بڑے معالجین [طب یونانی] میں سے ایک تھے، اچھے مقرر تھے، سیاست میں نام کما رہے تھے، شاعر بھی تھے، معلم تھے، ان کی شخصیت کے نہ جانے کتنے پہلو تھے مگر میرے لیے وہ صرف عثمانی صاحب تھے، جو بڑے بھائی کی طرح مجھ سے اور میرے گھر والوں سے محبت کرتے تھے۔ میں ان کی خصوصی توجہ اور ان کی بھیجی ہوئی دواؤں سے فیض اٹھاتا تھا، یہ ان کا دست اعجاز تھا کہ میں طب یونانی کی مسیحائی کا معترف ہی نہیں بلکہ معتقد ہو گیا۔ طب یونانی پر عقیدے کے غلو سے بعض اوقات نقصان بھی پہنچا مگر اس میں طب یونانی کا قصور نہ تھا، یہ میری حماقت تھی، میٹھے شربت اور حلوہ جات نے بلڈ شوگر کا لیول بڑھا دیا، حکیم صاحب نے سخت پیغام بھیجا ''نیم حکیم خطرہ جان نیم ملا خطرۂ ایمان''۔ حکیم کے مشورے کے بغیر دوا نہ استعمال کرو ورنہ معمول کے ماکولات اور مشروبات سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جائے گا، اطعمہ و اشربہ میں اعتدال ملحوظ رکھو کہ مزاج معتدل رہے اور اخلاط میں بے ترتیبی نہ پیدا ہو'' حکیم صاحب کی اس تاکید کے بعد میں نے حبوب و سفوف پر اکتفا کرنا مناسب سمجھا۔

عثمانی صاحب سے دوسری ملاقات عزیزی دانش میاں کی شادی میں ہوئی، آپ کا اصرار تھا کہ شادی کے دو دن قبل مع اہل خانہ پہنچ جاؤں، وہ میرے بزرگ تھے، ان کی شفقت اور خلوص کے سامنے بے بس ہو گیا اور اہل خانہ کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک دن پہلے پہنچ گیا، میرے اہل خانہ پہلے ہی پہنچ چکے تھے، شادی کا گھر تھا، ان کے اعزہ و اقربا سب ہی جمع تھے۔ حکیم صاحب نے میری ہر سہولت کا دھیان رکھا، میرے اہل خانہ کے لیے ایک کمرہ وقف کر دیا، میں تین دن تک ان کے گھر میں رہا، کئی بار ان کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا، شروع میں وہ بزرگی کا کمبل اوڑھے رہے اور میں بھی خوردی کی چادر سے باہر نہ نکل سکا۔ انہوں نے کمبل ذرا سرکایا تو ان کی شخصیت کی گرہیں خود بخود کھلنے لگیں، یہ تو پہلے سے معلوم تھا کہ وہ حکمت کی دنیا میں تہلکہ مچانے کے ساتھ سیاسی اکھاڑے کے منجھے ہوئے اور تجربہ کار پہلوان بھی ہیں۔ مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ادب کا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور شاعری سے بھی شغف فرماتے ہیں۔ میں نے دیکھا ان کے کمرے کے شوکیس میں کتابیں سلیقے سے سجی ہوئی ہیں، کتابیں دیکھ کر میں خود پر قابو نہیں رکھ پاتا ہوں، ان کی غیر موجودگی میں ان کا ذخیرۂ کتب کھنگال ڈالا، اسلامیات، ادبیات، تاریخ اور طب پر معیاری اور منتخب کتابیں موجود تھیں، قرآن پاک کی ایک تفسیر پر نظر پڑی، معلوم ہوا کہ عثمانی صاحب نے اسے پاکستان سے منگوایا ہے، میں حکیم صاحب کے ذوق مطالعہ کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

حکیم صاحب کو نہ جانے کیسے یہ خوش گمانی ہوئی کہ میں اردو ادب سے خاصی دلچسپی رکھتا ہوں۔ ایک کاغذ پر اپنی دو غزلیں لکھ کر میرے پاس بھجوائیں اور حکم دیا کہ مولانا سے کہہ دو اس پر اپنی رائے دیں، میں شعر فہمی اور سخن شناسی سے کورا، شاعری سے کوئی مس نہیں، کیا رائے دیتا، داد و تحسین کا ایک گلدستہ بھجوا دیا۔ حکیم صاحب خوش ہو گئے، ان کی وفات کے بعد ان

کے قلم سے لکھی ہوئی بارہ غزلیں ملیں۔ بڑے اہتمام کے ساتھ حکیم صاحب نے ایک ڈائری میں نوٹ کی تھیں، غزلیں بغیر تاریخ کی تھیں۔ یہ اندازہ ہوگیا کہ آپ آخری عمر میں اپنا مجموعۂ کلام ترتیب دینے میں سنجیدہ ہوگئے تھے، ڈائری کے پہلے صفحہ پر جلی حروف میں ''سوز دروں'' لکھا ہوا ہے مگر زندگی نے وفا نہ کی۔

دوران گفتگو ایک بار میں نے آپ کی شاعری کے بارے میں پوچھ لیا، آپ نے بتلایا: ''شاعری کا آغاز تو عنفوان شباب ہی میں کر دیا تھا، اس زمانے میں مجروح سلطان پوری کی شاعری کا چرچا تھا، ان سے متاثر ہوکر ''زخمی'' تخلص رکھا، مگر ہنگامہ خیز زندگی نے شعر وسخن کا کم ہی موقع دیا، تفنن طبع کے طور پر کبھی کچھ کہہ لیتا ہوں''۔ افسوس کہ حکیم صاحب نے اپنے کلام کو محفوظ نہیں رکھا، دھیان اس وقت آیا جب رخت سفر باندھ رہے تھے۔ حکیم صاحب کا بچپن گورکھپور کے دیہی علاقے میں گزرا تھا، ان کے کلام میں وہی سادگی اور پرکاری نظر آتی ہے جو دیہی علاقوں کی خصوصیت ہے۔ عربی زبان کے مشہور شاعر متنبّی کا شعر ہے۔

حسن الحضارة مجلوب بتطرية

و فی البداوة حسن غیر مجلوب

''شہر کا حسن میک اپ کا مرہون منت ہوتا ہے اور دیہات کا حسن خالص ہوتا ہے''۔

حکیم صاحب کے اشعار میں بھی سذاجت، آمد، سلاست، روانی، حسن سبک اور حسن خالص کی آب وتاب نظر آتی ہے، عزم وحوصلے کے ستارے جگمگاتے ہیں، تخلیقی بصیرت کی جھلک نظر آتی ہیں، وہ روایات کے پابند ہیں، انہوں نے اپنی کوئی الگ راہ تو نہیں نکالی، مگر بدلتے ہوئے ادبی رویوں سے بے خبر بھی نہیں ہیں۔ ان کے چند اشعار برائے نمونہ درج ہیں۔

حسن کی ظاہری ادا، اصل میں فریب ہے
حاصل ہمیں یقیں تھا، حسن یقیں فریب ہے
واقف حال تھے مگر پھر بھی جدا نہ ہوسکے
کہتے ہیں جس کو دوستی کتنا حسیں فریب ہے
[مظہر]

—

اے عزم مکمل جو سہارا ترا پاؤں
دنیا کے اندھیرے میں نئی شمع جلاؤں

—

نہیں پائیں گے اپنی منزل وہ مظہر
جو غیروں کے نقش قدم دیکھتے ہیں

—

بہاریں بھی فانی، خزائیں بھی فانی
خوشی معتبر ہے نہ غم معتبر ہے

—

شب غم کی تاریکیوں سے لڑوں گا
کہ جب تک سلامت یقین سفر ہے

—

حکیم عثمانی صاحب گو ناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے، جس میدان میں قدم رکھا، اپنی شناخت بنالی، ہنگامہ خیزیاں انہیں عزیز تھیں، محاذ آرائیوں سے کبھی نہیں گھبرائے، متضاد ذوق کے حامل تھے، شوخی، طباعی، بذلہ سنجی، حس مزاح وہبی اور خداداد تھی۔ تعلیمی سفر کا آغاز مدرسوں سے کیا مگر ان کی حبس زدہ، گھٹن آلود فضا کبھی راس نہیں آئی، میں نے دریافت کیا: ''حکیم صاحب آپ نے متعدد مدارس میں تعلیم حاصل کی ہے، آپ نے کس مدرسہ سے فراغت لی ہے؟'' ہنس کر کہنے لگے: مدارس کے بارے میں کیا بتلاؤں؟ ایک مدرسہ میں داخلہ لیا تو ایسی وحشت محسوس ہوئی کہ رسی تڑا کر بھاگا، اس مدرسہ میں اخبار پڑھنا بھی جرم عظیم تھا۔ مدارس کے سفر کا آخری پڑاؤ مدرسہ کنز العلوم فیض آباد تھا۔ دو چار ہاتھ بام رہ گیا تو یہاں بھی کمند ٹوٹ گئی، اصول فقہ کے ایک مسئلہ میں استاذ محترم سے الجھ گیا، وہ اس قدر ناراض ہوئے کہ فارغ التحصیل ہونے سے قبل ہی مجھے فارغ کر دیا۔

حکیم عثمانی صاحب نادرۂ روزگار نہ سہی مگر گوہر کمیاب ضرور تھے۔ شذوذ، نوادرات اور تفردات سے اپنی زندگی کو رنگین بنانے کے شیدائی تھے، نئی راہوں کی تلاش میں دائم رہتے تھے۔ طبیہ کالج لکھنؤ کی کھلی فضا میں ان کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہوا۔ ادبی ذوق کو جلا ملی، ان کی خطابت کا جوہر

سامنے آیا۔ طبیب بننے کے بعد کئی کشتیوں پر بیک وقت قدم رکھا، کبھی ڈگمگائے، کبھی پھسلے مگر پتوار ہاتھ سے نہ چھوڑا بالآخر توازن برقرار رکھنے میں کامیاب ہوئے۔ خطابت کے شعبے میں اپنا سکہ جمایا۔ حکمت کے ساتھ قلم بھی اٹھالیا۔ صحافت کے میدان میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ لکھنؤ سے ''برادری'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار عبدالحفیظ صدیقی کی ادارت میں ۱۹۵۷ء سے نکلنا شروع ہوا، اس اخبار کا مقصد خالص انسانیت کو فروغ دینا تھا۔ عثمانی صاحب غالباً ۱۹۶۰ء میں اس اخبار کے جوائنٹ ایڈیٹر بن گئے، اداریہ آپ ہی لکھتے تھے۔ میں نے ''برادری'' کے دو شماروں میں آپ کے اداریے پڑھے، قلم کیا تھا نوک سنان تھا، حالات حاضرہ اور سیاست پر گہری نظر تھی۔ وہ ایک طرف جن سنگھیوں کی خبر لیتے تھے دوسری طرف کانگریسیوں کی پالیسیوں کے بھی نکتہ چیں تھے، آپ کے اداریے تجربہ کار صحافی کی طرح پختہ اور گہری فکر کے غماز ہوا کرتے تھے۔

حکیم صاحب نے اپنی حس مزاح اور اور بذلہ سنجی کے سہارے طنزیہ مضامین کا سلسلہ شروع کیا، مولانا عامر عثمانی رحمۃ اللہ کے تتبع میں اس سلسلے کا نام ''حرم سے مے خانے تک'' رکھا، آپ کے طنزیہ اور سیاسی مضامین کو اردو قارئین کے حلقے میں اچھی خاصی پذیرائی ملی حتی کہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عثمانی نے آپ کی حوصلہ افزائی فرمائی، ملا امرود بخت شاہجی کے قلمی نام نے آپ کی شہرت ادبی دنیا تک پہنچادی۔ میں یہاں پندرہ روزہ برادری سے آپ کے ایک طنزیہ مضمون کی چند سطریں بطور نمونہ پیش کرنے پر مجبور ہوں، دیکھیں آپ کے قلم کا جادو کیسے سر چڑھ کر بولتا ہے۔

'قابل رحم جنوں'

الفت میں ہر ایک شے الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

''جی ہاں! مجنوں نظر آتی ہے، لیلیٰ نظر آتا ہے، شمع نظر آتا ہے، پروانہ نظر آتی ہے، شیریں نظر آتا ہے، فرہاد نظر آتی ہیں..... الفت کیا ہوئی جیسے عقل و ہوش کا مکمل اسقاط ہوگیا..... اس شعر کے متعلق میرا خیال یہ تھا کہ اس میں اردو ادب کا قیمہ بڑی سعادت مندی کے ساتھ بنا کے رکھ دیا گیا ہے، مگر جب صوفی شکم علی والا واقعہ درپیش ہوا تو خدا رحم کرے اس شعر کے تولد فرمانے والے شاعر پہ، اس کی سمجھ پر اشک آنے لگا..... ہوا یوں کہ صوفی صاحب کے پیر و مرشد خواجہ زلف دراز جب ان کی چہیتی بیگم گل بہار جہاں کو بستر و چارپائی سمیت بسبب اپنی کرامت کے فرار ہوگئے تو صوفی صاحب کے دل و دماغ پر بہت ہی ڈبل قسم کا صدمہ حملہ آور ہوا اور محبوب بیوی کی سابقہ محبت بسبب ان کی جدائی کے جنون کی شکل اختیار کرگئی..... بیوی کی جدائی کا قلق اور صدمہ بایں جا رسید کہ صوفی صاحب بے چارے دیوانے سے ہوگئے، پہلے تو ان کی دیوانگی کا منظر صرف گھر والوں کے لیے مخصوص تھا یعنی کہ صوفی صاحب پر آدھی رات کے وقت فریب عالم خواب میں ایک خاص قسم کا دورہ پڑا کرتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ وہ اچانک چارپائی پر سے ایک جست لگا کر زمین پر آجاتے اور میری گل بہار، میری گل بہار کے ''نیند اچاٹ'' نعروں کے ساتھ گھر کے ہر چار سمت دوڑ لگایا کرتے تھے۔ اگر حالت اسی حد تک رہتی تو خیر غنیمت تھی، مگر ترقی یہاں تک ہوئی کہ ان پر یہ دورہ حالت بیداری میں بھی پڑنے لگا اور عام شاہراہ پر چلنے پھرنے والے لوگ صوفی صاحب کی نظر سے بچنے کی کوشش کرنے لگے اور وہ منظر تو بڑا ہی ٹریجڈی نما اور دل خراش تھا، جب صوفی صاحب ایمن آباد نخاس روڈ پر اپنے ماموں سے لپٹ گئے اور کسی طرح چھوڑنے کا نام نہ لیتے تھے۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ یہ آپ کی بیگم گل بہار جہاں نہیں بلکہ آپ کے رشتہ کے ماموں چودھری خفقان صاحب ہیں مگر وہ صوفی شکم علی کہاں جو آسانی سے مان جاتے ، ہے، ہے، ہے، یہی وہ الفت ہے جس کی رو سے چودھری خفقان مسماۃ گل بہار جہاں نظر آتی ہیں..... یہ الفت بھی کیا شے ہے کیا کیا گل کھلاتی ہیں''۔ [سالنامہ پندرہ روزہ برادری، لکھنؤ، مجریہ یکم و ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء]

متذکرہ بالا اقتباس دراصل اس پوسٹ مارٹم کی تمہید ہے جو عثمانی صاحب نے ممبر پارلیمنٹ پی، سی، بروا کے ایک شرانگیز بیان کا کیا تھا۔ بروا نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے حکومت ہند سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ حکومت حجاز سے ہندوؤں کو کعبہ مکرمہ میں پوجا پاٹھ کرنے کی اجازت دلائے کیونکہ کعبہ میں شیولنگ [نعوذ باللہ] نصب ہے۔

عثمانی صاحب کی نگارشات کی چند اور جھلکیاں دیکھیں، جن میں ان کا صحافتی تیور، لعوق ادب، دیدہ وری، دواسی اور سیاسی بصیرت نمایاں ہے۔

جبل پور اور ساگر کے فسادات کے بارے میں ایک اداریہ کے آخر میں رقم طراز ہیں:

''مسلمانوں کو ہندوستان چھوڑ دینے کی دھمکی دینے والے یہ

مہاسبھائی، جن سنگھی، راشٹریہ سیوکی، آریہ سماجی، شیوائی، دیانندی، شردھانندی، ٹنڈنی، سمپورنانی اور کاٹجوئی مسلمانوں کو صرف اورنگ زیب، بابر اور شاہجہاں کے روپ میں دیکھتے آئے ہیں۔ یہ ابھی بلال، صہیب، عمار اور سمیہ کے کردار سے آشنا نہیں ہیں، آج یہی زندگیاں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں۔ ہم تاج محل، قطب مینار اور لال قلعہ کی پیشانی پر اپنی عظمت و عروج کی داستانیں نہیں پڑھتے، آج ہماری نظریں عرب کے اس تپتے ہوئے ریگستان پر مرکوز ہیں، جہاں ہمیں برہنہ جسم کر کے تڑپایا گیا ہے، جس سے ہم نے مصیبتوں میں ثابت قدم رہنا سیکھا ہے۔ ہم اپنے لیے صبر و ثبات کی قوت کا اکتساب ان پہاڑی ٹیلوں سے کرتے ہیں، جہاں ہمارے اسلاف کے سینوں کو آفتاب کی نکیلی کرنوں سے زخمی کیا گیا ہے، ہماری مظلومی اور ستم رسیدگی کی تاریخ کا ایک ورق ''شعب ابی طالب اور ''دارارقم'' ہے۔ ہم اندلس پر روئے ہیں، بلقان اور طرابلس پر اشک باری کی ہے، فلسطین اور الجزائر کا المیہ دیکھا ہے، مبارک پور ہو یا بھوپال اور سیتا مڑھی، فیروز آباد ہو کہ جبل پور اور ساگر ہر جگہ اور ہر وقت ''خوگر جور'' اپنا تیر آزمائیں اور ہم اپنا جگر - دیکھنا چاہیے کہ ان کے ترکش کے تیر ختم ہوتے ہیں یا ہمارے ہاتھوں سے صبر و تحمل کا دامن چھٹتا ہے''۔

[پندرہ روزہ، برادری، لکھنؤ، مجریہ ۱۵/ مارچ ۱۹۶۱ء عیدالفطر نمبر]

آزادی کے بعد بھی مسلمانوں نے کانگریس کا دامن نہیں چھوڑا۔ جمہوریت کے قصر کو تعمیر ہوئے اڑسٹھ سال گزر گئے۔ آج یہ محسوس ہو رہا ہے کہ ان سالوں میں کانگریس نے مسلمانوں کو ٹھگنے اور فریب دینے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔ چوّن سال قبل عثمانی صاحب کی دوررس نگاہوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا، آپ ہندوستانی مسلمانوں کو بیدار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اوروں کے لیے کانگریس کا انتخابی نشان ''دو بیلوں کی جوڑی'' ہے، مگر مسلمانوں کے لیے نہرو۔ جب الیکشن آتا ہے تو مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ کانگریس کو مت دیکھو، نہرو کو دیکھو!! اور پھر راگ الاپنے والے الاپنے لگتے ہیں ''نہرو تمہارا کس قدر ہم درد ہے، تمہارا کتنا خیال رکھتا ہے''۔ ہمیں کہنے دیجیے کہ نہرو کی شخصیت مسلمانوں کے لیے مارفیا کا انجکشن بنا دی گئی ہے، مسلمانوں کو اس ''افیون زدہ'' زندگی سے نکلنا ہوگا اور اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے کے لیے دریوزہ گری اور کاسہ گدائی سے دست کش ہو کر ایک واضح نصب العین کے ماتحت جدوجہد کرنا ہوگا۔ اسی میں ہماری فلاح ہے اور ملک کی بہتری۔

[پندرہ روزہ برادری لکھنؤ مجریہ ۱۵/ مارچ ۱۹۶۱ء]

آزادی کی جدوجہد میں جمعیۃ العلماء کا کردار تحریک آزادی کا روشن باب ہے، مگر آزادی کے بعد یہ جماعت کانگریس کا ضمیمہ بن کر رہ گئی۔ مسلکی تعصب اور گروہ بندی کے بھنور میں ایسی پھنسی کہ آج تک نہ نکل سکی۔ اس جماعت سے مسلمانوں کی جو امیدیں وابستہ تھیں خاک میں مل گئیں۔ بزرگوں کی ثناخوانی، دیگر مسلم جماعتوں پر انگشت نمائی، قیادت کی بے جا ہوس اور علاحدگی پسندی کے رجحانات نے اسے ایک محدود مذہبی جماعت بنا دیا، اس کا سیاسی نصب العین صحرائے ماضی میں کھو گیا۔ عثمانی صاحب جمعیۃ العلماء کی اس روش پر شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آزادی کے قبل جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ جتنی روشن تھی، آزادی کے بعد اتنی ہی تاریک ہوگئی، اگر حادثہ ۱۹۴۷ء کی چند روزہ جدوجہد کو حذف کر دیا جائے تو اس پورے چودہ سالہ دور میں جمعیۃ کا وجود اس ضعیف صد سالہ کا مثل بن جاتا ہے، جو اپنے دور شباب کے اندوختہ پر بڑھاپے کی زندگی گزار رہا ہو۔ تقسیم ملک کے بعد مسلم لیگ اپنا بوریا بستر باندھ کر پاکستان کی راہ لے چکی تھی۔ اس پورے برصغیر ہند کی مسلم سیاست کے افق پر صرف جمعیۃ العلما کا علم لہرا سکتا تھا اور اس بات کا واضح امکان موجود تھا کہ منقسم ہندوستان کے ۴½ کروڑ مسلمانوں کی سیاسی قیادت بلا شرکت غیرے جمعیۃ العلما کو حاصل ہو جائے مگر جمعیۃ کے پاس اپنا کوئی نصب العین تھا اور نہ طریق سیاست، جو کچھ تھا وہ کانگریس سے مستعار۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمعیۃ العلماء نے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کا وہ نادر موقع کھو دیا، جو اس کی واحد حریف مسلم لیگ کے فرار ہو جانے سے حاصل ہوا تھا۔

[پندرہ روزہ برادری لکھنؤ مجریہ ۱۵/ مارچ ۱۹۶۱ء]

پندرہ روزہ 'برادری' سے انسلاک حکیم عثمانی صاحب کی علمی اور صحافتی زندگی کا عہد زریں تھا، ان کے قلم کی فسوں سازیاں حلقہ علم و ادب کو اپنا اسیر بنا رہی تھیں، امید ہو چلی تھی کہ ان کی سیاسی بصیرت اور رہوار خامہ قوم و ملت کے منتشر شیرازہ کو یکجا کرنے میں مہمیز کا کام کرے گا۔ ابھی تو ان کی اٹھان تھی، طلوع شمس نے نگاہوں کو خیرہ بھی نہیں کیا تھا، اس کی تمازت رخساروں

کوگرما بھی نہ سکی تھی کہ نہ جانے کیا ہوا کہ یہ نیر درخشاں گہنا گیا۔ 'برادری' کے لکھنے والے معمولی لوگ نہیں تھے۔ مولانا ابوالحسن علی میاں، عبدالحفیظ صدیقی، مولانا ابوالمجاہد زاہد اور شبنم سبحانی جیسے منجھے ہوئے قلمکار تھے۔ عثمانی صاحب بھی انہیں میں سے ایک تھے، برادری کے شماروں کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کا اسے ہر طرح کا تعاون حاصل تھا۔ عثمانی صاحب کا رجحان بھی اسی جماعت کی طرف تھا۔ روزنامہ دعوت کے سابق ایڈیٹر اور ہندوستان کے مشہور صحافی جناب مسلم صاحب، عبدالحفیظ صدیقی کے نام اپنے ایک مکتوب میں عثمانی صاحب کا ذکر کرتے ہیں خط کا متن درجہ ذیل ہے:

۲/نومبر ۱۹۶۱ء

برادرم السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''پندرہ روزہ 'برادری' کا تازہ شمارہ برائے تبصرہ موصول ہوا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ برادری پر دعوت میں تبصرہ ہو چکا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ 'برادری' کی اشاعت کی رفتار کیا ہے، خدا کرے یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو اور آپ حضرات کی محنتیں کامیاب ہو رہی ہوں، لیکن اگر کوئی دشواری پیش آ رہی ہو تو پھر ایک صورت یہ ہے کہ پبلسٹی پر زیادہ توجہ صرف کی جائے۔ آپ اپنا اشتہار مرتب کر کے دعوت میں بھیج دیجئے، انشاء اللہ اسے ۲،۳ بار دے دیا جائے گا۔ اسی اشاعت میں مظہر سبحان صاحب کی شکایت بھی نظر سے گزری۔ ممکن ہے کہ لکھنؤ میں آپ کو ایسا تجربہ پیش آیا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ دوسری جگہوں پر بھی ایسی صورت پیش آتی ہو، لیکن یہ سب فکر و عمل کی ناپختگی کی دلیل ہے۔ بہرحال اس قسم کی کمزوریوں کا علاج اخباری شکوہ سے نہیں بلکہ ذاتی ملاقاتوں میں توجہ دلانے سے ہوگا یہ رفقا تو پھر بھی اپنے ہیں، ہم تو سمجھتے ہیں کہ سوز اور دردمندی سے پرائے بھی اپنے بن جاتے ہیں۔''

امید ہے کہ آپ بعافیت ہوں گے

کارلائقہ سے یاد فرمائیے

والسلام

خاکسار

محمد مسلم

عثمانی صاحب کی صحافتی توانائیاں رفتار پکڑ رہی تھیں اور ان کی فکر کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا کہ اچانک انہوں نے اپنی شاہراہ ہی بدل دی اور خود کو سیاست اور تدریس طب تک محدود کر دیا۔ ان کے افکار بھی بدل گئے اور دنیا بھی بدل گئی۔ سیاست کا چسکہ ویسے بھی علمی صلاحیتوں کو دیمک کی طرح کھا جاتا ہے۔ میری ان سے جب ملاقات ہوئی تو ان کے پاس بتانے کو صرف یہی رہ گیا کہ میرے افکار و خیالات جاننا ہو تو برادری کے شمارے پڑھو۔ یہ شمارے کہاں تلاش کریں وہ یہ نہ بتا سکے۔

میں ان سے دوسری ملاقات کا ذکر کر رہا تھا، نہ جانے کہاں بہک گیا۔ ہاں تو جناب عثمانی صاحب نے اپنے لاڈلے بیٹے کا ولیمہ ایسا زبردست کیا کہ وہ بھی یادگار بن کر رہ گیا۔ نیتاؤں اور سیاسی رہنماؤں کا جمگھٹا تھا، جن کی تصویریں صرف اخبار اور ٹی وی پر دیکھی تھیں وہ سراپا کھڑے تھے۔ بیسیوں اقسام کے کھانے تھے۔ کھانے کا انتظام پرگتی میدان میں تھا۔ ٹہل ٹہل کر لذت کام و دہن سے محظوظ ہوا۔ عثمانی صاحب کی خوشی دیدنی تھی، ان کی بذلہ سنجی بھی شباب پر تھی، کسی نے پوچھا کہ حکیم صاحب آپ تو بی جے پی کے بانیان میں سے ہیں، حیرت ہے کہ آپ کو وزارت کا کوئی قلمدان نہیں ملا'' مسکرا کر کہنے لگے: ''شباب تھا تو دوسری بیوی کی تمنا کس کو تھی، اب اس بڑھتی عمر میں شادی کی تمنا کون کرے؟'' آپ کے اس معنی خیز جواب پر ساتھ میں کھڑے لوگوں نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا اور اگل بغل کھڑے ہوئے شہنواز اور نقوی کے چہرے مرجھا گئے۔ رخصت ہونے لگا تو اپنی سرکاری گاڑی سے اسٹیشن تک وداع کرنے آئے، میں نے بہت اصرار کیا کہ زحمت نہ کریں، میں آٹو رکشہ لے لوں گا، مگر مانے نہیں کہنے لگے: ''سرکار کی گاڑی ہے کچھ آپ بھی فیض اٹھا لیں''۔

تیسری اور آخری ملاقات بڑی مختصر رہی۔ رمضان کا مہینہ تھا، میں اہلیہ کے علاج کی غرض سے دلی آیا تھا۔ حکیم صاحب کو پتہ چلا تو افطار کی دعوت دے ڈالی۔ آپ نے بڑا اہتمام کیا، افطار میں میرے صاحبزادے اور ڈاکٹر دانش ریحان بھی موجود تھے۔ مغرب بعد حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی، ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ تھی، جو آپ کی شخصیت کا ایک جز تھی۔ حکیم عثمانی صاحب کی شخصیت کے بارے میں یہی کہہ سکتا ہوں ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی

☆ پروفیسر سید مشکور احمد

جان کر منجملہ خاصان میخانہ مجھے
مدّتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب مرحوم اس شخصیت کا نام ہے جو ہر اعتبار سے ایک مکمل انسان، بے حد خوش مزاج، محبّ طب، روشن خیال، ہمدرد اور دردمند انسان تھے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خوبیاں ان کی شخصیت کا حصہ تھیں مثلاً وہ خوش پوش، خوش اخلاق، خوش کلام، خوش دل اور ملنسار انسان تھے۔ وہ بذات خود محفل کی جان تھے اپنی گفتگو سے لوگوں کو مسحور کرنے کی صلاحیت ان میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ جہاں بیٹھ جاتے لوگوں کی توجہ اپنی طرف مرکوز کر لیتے، نہایت بذلہ سنج، حاضر جواب اور مجلسی انسان تھے، محفل میں آپسی گفتگو سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مرحوم باغ و بہار شخصیت کے مالک اور ایک دردمند انسان تھے۔ علمی اور فنّی گفتگو اس طرح کرتے کہ مخاطب متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے تھے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی یکم جولائی ۱۹۳۸ء کو موضع صمد پور، گورکھپور، یوپی کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے، اپنی ابتدائی تعلیم والدین کے سایۂ عاطفت میں حاصل کی اس کے بعد ثانوی تعلیم گورکھپور اور دینی تعلیم اعظم گڑھ کے مشہور و معروف دینی مدرسے میں حاصل کی اس کے بعد ۱۹۵۹ء طب کی تعلیم تکمیل الطب کالج، لکھنؤ سے حاصل کی۔ اس وقت حکیم شکیل احمد شمسی صاحب مرحوم پرنسپل ہوا کرتے تھے وہ اپنے فن کے ماہر اور ایک قابل استاذ تھے۔ عثمانی صاحب ان کے عزیز اور بہت ہی چہیتے شاگرد تھے۔ ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر عثمانی صاحب نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ طبابت کے رموز شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین سے حاصل کیے۔ طب کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد حکیم عثمانی صاحب نے دہلی کا رخ کیا اور دہلی کے ایک نامور کالج جامعہ طبیہ میں معالجات مضمون کے استاذ اور اس کے شفاخانہ کے انچارج کی حیثیت سے تقرر ہو گیا، وہاں موصوف نے اپنی علمی صلاحیت اور طبابت کا سکّہ قائم کیا، ان کے مطب پر تقریباً دو سو سے زائد مریض ایک وقت میں ہوتے تھے۔ اپنے مریضوں کو بڑی یکسوئی اور توجہ سے دیکھا کرتے تھے۔ مریض ان کے علاج سے شفایاب ہوتے اور حکیم صاحب کو دعائیں دیتے، کچھ ہی عرصہ میں حکیم عثمانی صاحب نے بڑا نام کمایا اور حکیم حاذق کے طور پہچانے جانے لگے۔ اسی درمیان کا تعارف میرے والد مرحوم ڈاکٹر محمود قادری صاحب سے ہوا، یہ تعلق اس قدر گہرا ہو گیا کہ ان کا میرے گھر آنے جانے کا سلسلہ بن گیا۔ وہ اکثر میرے والد مرحوم سے بہت سے معاملات میں مشورہ لیا کرتے تھے اور میرے والد کو اپنا بزرگ مانتے تھے، میں بھی اسی زمانے میں ان سے روشناس ہوا اور اُن سے میرا تعلق آخری دم تک بنا رہا۔ جب میں نے طبّی دنیا میں قدم رکھا تو حکیم عثمانی صاحب کی سرپرستی مجھے حاصل رہی۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ان سے جہاں بھی ملاقات ہوتی وہ گھر کے حالات معلوم کرتے۔ یہ ان کی شفقت اور محبت تھی۔ وہ مجھے حالات سے مقابلہ کرنے کی نصیحت دیا کرتے تھے اور اس تعلق کو مرتے دم تک قائم

☆ سابق ڈین فیکلٹی آف میڈیسن [یونانی]، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

رکھا۔ وہ اپنی مختلف محفلوں میں مجھے مدعو کیا کرتے۔ ایک بار مرحوم نے اپنے گھر پر افطار پارٹی کا اہتمام کیا، جس میں سیاسی، سماجی لوگوں، کالج کے اساتذۂ کرام اور اس ناچیز کو بھی خصوصیت سے بلایا تھا۔ مہمانِ خصوصی کے طور پر حکومتِ ہند کے وزیر صحت جناب رفیق عالم صاحب بھی مدعو تھے۔ حکیم عثمانی صاحب نے سبھی لوگوں کو اُن سے متعارف کرایا اور سب کی پذیرائی کی۔

تقریباً پانچ سال جامعہ طبیہ، گلی قاسم جان دہلی میں اپنی خدمات دینے کے بعد ۱۹۶۹ء میں آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج قرول باغ میں حکیم انچارج دواخانہ اور سینئر لیکچرار شعبۂ معالجات کے عہدوں پر تقرری ہوئی۔ درس وتدریس میں انہیں پہلے ہی سے مہارت حاصل تھی، طبّیہ کالج میں موصوف کو اپنے علم وفن کے جوہر دکھانے کے مزید مواقع حاصل ہوئے اور انہوں نے طلبہ کو اپنا علمی سرمایہ اس طرح عطا کیا کہ آج بھی طالب علم ان کو یاد کرتے ہیں اور سبھی اپنی عملی زندگی میں بہت کامیاب ہیں۔ حکیم صاحب مرحوم میں علمی صلاحیت کے ساتھ ایک بہترین طبیب ہونے کا بھی فن موجود تھا۔ موصوف نے ہندوستانی دواخانہ میں ایک طویل عرصہ تک مریضوں کا علاج کیا، اس کے بعد طبّیہ کالج کے اسپتال میں بھی اپنے طبیب حاذق ہونے کا ثبوت پیش کیا، ان کے علاج سے سیکڑوں مریض شفایاب ہوتے اور ان کو دعائیں دیتے۔

۱۹۶۶ء سے باقاعدہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ایک فعال ممبر تھے۔ موصوف طبی کانفرنس کے زیر اہتمام سبھی پروگراموں میں پیش پیش رہتے، ان کی یہ خوبی تھی کہ میٹنگ میں جب وہ اپنی رائے پیش کرتے سبھی لوگ نہایت سنجیدگی اور پوری توجہ سے ان کی بات سنتے اور مانتے تھے، بعد میں موصوف کو اس تنظیم کا سینئر وائس پریسیڈنٹ نامزد کیا گیا۔ وہ ایک اچھے مقرر بھی تھے، جب بھی اسٹیج پر آتے سامعین کی توجہ ان کی خطابت کی طرف مرکوز ہو جاتی اور ان کی جوشیلی اور بامعنی تقریریں کر بے حد متاثر ہو جاتے تھے۔

۱۹۸۵ء میں حکیم رام لبھایا صاحب نے راقم الحروف کو اپنے مطب گوسوامی فارمیسی پر بلایا اور کہنے لگے کہ میں چاہتا ہوں کہ تم آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، صوبہ دہلی کے سکریٹری کا عہدہ سنبھالو، اسی وقت حکیم صاحب نے تحریری طور پر مجھے صوبہ دہلی کا سکریٹری مقرر کر دیا اور اس کا اعلان اخبار کے ذریعہ اطباء تک پہنچا دیا۔ اس وقت حکیم صاحب خود اس تنظیم کے صدر ہوا کرتے تھے۔ سکریٹری کا عہدہ سنبھالنے کے بعد سب سے پہلے میں نے کانفرنس کا دستور العمل دیکھا اور کام شروع کر دیا۔ اس تنظیم کے احیاء نو کے لیے ممبر سازی کا بیڑا اٹھایا اور تقریباً ڈیڑھ سو لوگوں کو ممبر بنا لیا، جس میں قرول باغ طبّیہ کالج اور ہمدرد طبّی کالج کے اساتذہ اور قرب وجوار کے مستند پریکٹیشنرز شامل ہوئے۔ اس کے بعد فوراً الیکشن کا اعلان کر دیا، جس میں بغیر کسی مقابلے کے حکیم گنگا رام گاندھی صدر اور خادم کو سکریٹری منتخب کر لیا گیا۔ اس کے بعد باضابطہ ماہانہ میٹنگیں ہوتی رہیں، جس میں بڑی تعداد میں حکماء شامل ہوتے، جیسے حکیم محمد احمد لاری، حکیم مظہر سبحان عثمانی، حکیم جمیل احمد، حکیم رام لبھایا، حکیم اقبال احمد، حکیم غلام مہدی، حکیم احمد یٰسین، حکیم عبدالحفیظ، حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی اور حکیم ضیاء الدین وغیرہ ہر میٹنگ میں شریک ہوتے اور اپنے مفید مشوروں سے نوازتے۔ دو سال بعد حکیم گنگا رام گاندھی اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے صدارت کے عہدہ سے سبکدوش ہو گئے۔ اس کے بعد پھر الیکشن ہوا اور اتفاقِ رائے سے حکیم عثمانی صاحب اس کے صدر اور خادم کو دوبارہ سکریٹری بننے کا موقع ملا اور یہ سلسلہ آٹھ سال تک جاری رہا، یہیں سے حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب سے میرا اور زیادہ قریبی تعلق پیدا ہو گیا، جو آخر تک قائم رہا۔ عثمانی صاحب صوبائی میٹنگ میں بغیر کسی عذر کے برابر شرکت کرتے اور مفید مشوروں سے نوازتے، طبّی مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے اور انہیں حل کرانے کے لیے عملی اقدامات کرتے، ذمہ داران کو خطوط لکھے جاتے ضرورت پڑنے پر اُن سے ملنے کے پروگرام مرتب کرتے، اس کے علاوہ صوبائی تنظیم کی مالی امداد بھی کرتے اور دیگر ممبران سے بھی تعاون کی درخواست کرتے۔ اس آٹھ سال کے دوران بہت سے کام کیے اور صوبائی تنظیم کی ایک پہچان بنائی، لیکن حالات نے کچھ ایسی کروٹ لی کہ ہم لوگوں نے استعفیٰ دے دیا اور اس تنظیم سے الگ ہو گئے اور اس کی باگ ڈور نوجوانوں کے حوالے کر دی۔

۱۴ستمبر ۲۰۱۲ء کو حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم کے یومِ پیدائش کے موقعہ پر غالب اکیڈمی، حضرت نظام الدّین اولیاء، نئی دہلی میں ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا، جس میں سامع کی حیثیت سے حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب مرحوم بھی مدعو تھے، چند شعراء کا کلام سننے کے بعد عثمانی صاحب کو بھی جوش آ گیا اور اُنھوں نے بھی اپنا کلام سنانے کی خواہش ظاہر کی اور اُنہیں فوراً ہی اسٹیج پر آنے کی دعوت دی گئی۔ حکیم عثمانی صاحب نے اپنا کلام پیش کیا، جس پر لوگوں کی داد و تحسین سے ہال گونج گیا اور یہ راز وہاں موجود سبھی پر عیاں ہو گیا کہ عثمانی صاحب کو شعر و شاعری کا بھی ذوق ہے، جو عموماً لوگوں پر ظاہر نہیں تھا، کیونکہ حکیم صاحب نے شاعری کو ذریعۂ عزّت نہیں بنایا، بلکہ ایک روایت کو زندہ رکھا، جو عموماً حکماء میں پائی جاتی تھی۔ اُن کے چند اشعار نمونے کے طور پر پیش ہیں۔

ے بہاریں بھی فانی، خزائیں بھی فانی
خوشی معتبر ہے نہ غم معتبر ہے

مانا کہ زندگی مری ناکام ہے مگر
کوئی تو بات ہے جیے جا رہا ہوں

دیوانگی میں فرض شناسی نہیں گئی
دامان گل کے چاک سیے جا رہا ہوں

ٹوٹے گا کب نفس کا تسلسل خبر نہیں
چلتی ہوئی ہوا کا بھروسہ نہ کیجیے

ہنگامہ نہ ہو سرد کہ رونق ہے اسی سے
فرعون کی بستی میں ہو موسیٰ کا مکاں بھی

حکیم صاحب اپنا مجموعہ کلام شائع کرنا چاہتے تھے، لیکن یہ کام ان کی زندگی میں نہ ہو سکا، اب یہ ذمہ داری ان کے صاحبزادے اور ان کے شاگردوں کی ہے کہ وہ ان کے منتشر کلام کو یکجا کر کے شائع کریں، تاکہ لوگ اس سے مستفیض ہو سکیں۔

دوران ملازمت عثمانی صاحب کو سیاست کا شوق ہوا تو انھوں نے ایک نئی راہ لی اور بھارتیہ جنتا پارٹی میں شامل ہو گئے۔ ابتدا میں پارٹی کے ایک مقبول اور فعال ممبر رہے اور پارٹی کے معزز رہنماؤں میں اپنا ایک مقام بنایا اور ایک معتبر اور معروف حیثیت حاصل کی، پارٹی کے سبھی سینئر لیڈران حکیم صاحب کا احترام کرتے تھے جب پارٹی کو مرکزی حکومت میں برسر اقتدار آنے کا موقع ملا تو عثمانی صاحب کو مائنارٹی کمیشن کا وائس چیئر مین کا عہدہ سونپا گیا، اُنھوں نے اقلیتی طبقے کی بھرپور رہنمائی کی۔ ان کے مسائل حل کرانے میں پیش پیش رہے اور اُن کی فلاح و بہبود کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔

حکیم عثمانی مرحوم بلاتفریق مذہب و ملّت سب میں مقبول تھے، ان کی شخصیت میں رواداری اور انکساری تھی۔ اس کے علاوہ مرحوم کی یہ بھی کوشش رہی کہ ان کا کالج دن دونی رات چوگنی ترقی کرے اور ایک دن وہ آئے کہ اس ادارہ کو یونیورسٹی کا درجہ مل جائے۔ اس مقصد کو پانے کے لیے وہ ہمہ تن کوشاں رہتے اور اس معاملے کو لے کر سبھی ذمہ داران سے رابطہ کرتے اور کالج کی تاریخی حیثیت سے لوگوں کو آگاہ کرتے، تاکہ ذمہ داران اس کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس طرف متوجہ ہوں اور اس ادارہ کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہو سکے۔ لیکن ان کی یہ تمنّا ان کے دل ہی میں رہ گئی، آخر کار وہ اس کام کو آنے والی نسل کے حوالے کر گئے۔ ۱۵رجنوری ۲۰۱۳ء کو حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب نے اس دنیا کو خیر باد کہہ دیا اور اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔

عثمانی صاحب کی وفات ایک بڑا سانحہ ہے، طبّی دنیا ایک سچے اور دردمند انسان سے محروم ہو گئی۔ ہماری دعا ہے کے خداوند کریم اُنھیں جنّت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی — اپنا تاثر

☆ پروفیسر سید مودود اشرف

ان کا سراپا متاثر کن تھا اور شخصیت پرکشش، باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ نڈر اور بے خوف۔ ان کی ہم نشینی کا شرف کم ہی حاصل ہوا لیکن نہ جانے کیوں دل میں ان کا حد درجہ احترام تھا، اپنے اساتذہ کے زمرے میں ان کو شمار کرتا تھا۔ مہمان نوازی ان کی دیدنی تھی۔ ایک بار قرول باغ، طبیہ کالج میں امتحان کے سلسلہ میں ان کا ساتھ رہا۔ ان کے حسن سلوک کا قائل ہوا، وضع دار لوگوں میں سے تھے۔ ملنے والوں کی تواضع میں کوئی کور کسر نہ چھوڑتے۔ تشخیص و تجویز ان کی قابل ستائش تھی۔ طب اور اپنے طالب علموں سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے ان کے معاصر ان کی فنّی حذاقت، ذہانت و فراست کے قائل تھے۔ سیاسی شعور کے اعتبار سے بھی طبّی دنیا میں ان کا اپنا ایک مرتبہ تھا۔ ان کے قدر دانوں میں حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی شامل تھے۔ حلقہ احباب وسیع تھا اور احباب ان کے گرویدہ، کچھ عرصہ ان کا قیام بحیثیت استاذ، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی رہا۔ دور دور سے مریض آتے اور ان کے علاج سے شفا پاتے۔

برجستہ تقریر میں بھی وہ اپنے معاصرین میں سب سے ممتاز و نمایاں تھے۔ حکیم شجاع الدین صاحب [استاذ محترم حکیم کمال الدین صاحب کے حقیقی بھائی] کو ہمدرد میں حکیم عبدالحمید صاحب کی زیر سرپرستی کام کرنے کا شرف حاصل رہا۔ وہ بتاتے تھے کہ جب کوئی پروگرام پڑتا اور صدر مجلس کی تاخیر سے آمد پر لوگ بدمزہ ہو رہے ہوتے تو حکیم عبدالحمید صاحب ایک مخصوص نام کے ساتھ ان کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دیتے اور یہ مائک سنبھال لیتے۔ اپنی تقریر سے سامعین کا دل موہ لیتے۔ یہ تذکرہ بھی اس جگہ شاید بے محل نہ ہو۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب حکیم صاحب قرول باغ طبیہ کالج کے سیاسی چپقلش کے شکار ہوئے۔ یہی ذریعہ بنا اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی میں ان کی آمد کا۔ باقاعدہ عارضی تقرر کے لیے جب یہ جگہ مشتہر ہوئی تو میرے دل میں بھی یہ خیال آیا ایک درخواست میری بھی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ مروجہ دستور کے مطابق درخواست کی اجازت طلب کرنے استاد محترم حکیم طیب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ الفاظ تو یاد نہیں انہوں نے جو کچھ کہا مفہوم اس کا یہ تھا، کس کے مقابلے میں درخواست دے رہے ہو؟ کہاں وہ، کہاں تم۔

بات بھی بالکل صحیح تھی، اپنا تو آج بھی یہ حال ہے ''کس بات میں اچھا ہے کس وصف میں عالی ہے''؟

بہر حال حکیم طیب صاحب کی زبان سے نکلا ہوا یہ جملہ ہو یا اس جیسا کوئی اور؛ ان کے دل میں حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کی کس قدر عظمت تھی اس کا آئینہ دار ہے۔ غرض انٹرویو میں کل دو لوگ تھے ایک تو حکیم عثمانی صاحب اور ایک یہ احقر۔ سلیکشن کمیٹی نے دونوں نام منظور کیے، سرفہرست حکیم عثمانی صاحب کا نام تھا دوسرے نمبر پر میرا نام تھا۔ یعنی اگر وہ جوائن نہیں کریں گے

☆ سابق ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تو جوائننگ لیٹر مجھے ایشو ہوگا اور ہوا بھی یہی۔ دراصل اسی دوران قرول باغ طبیہ کالج کے حالات حکیم صاحب کے حق میں بے حد سازگار ہو گئے تو حکیم صاحب نے وہاں واپسی میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی۔ سچ یہ تھا ان کو قرول باغ طبیہ کالج مع دلی کے بے حد عزیز تھا اور میں معالجات میں بحیثیت لکچرر اپنے تقرر کا متمنی۔ اللہ نے دونوں کی سن لی، وہ اپنی قسمت پر نازاں و فرحاں اور میں اپنی خوش قسمتی پر۔ نہ وہ رنجیدہ تھے نہ میں ملول۔ کبھی کبھی قدرت کے فیصلے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ سبحان اللہ۔

حکیم رئیس الرحمٰن ڈائرکٹر جنرل، سی سی آر یو ایم، حکیم صاحب کے عزیز ترین شاگردوں میں سے ایک اور وہ بھی ان کو ٹوٹ کر چاہتے۔ جب کبھی دوران ملاقات حکیم عثمانی صاحب کا نام آجاتا تو ان کی زبان رکنے کا نام نہیں لیتی۔ حکیم رئیس الرحمٰن صاحب ان کے معالج بھی رہے۔ ایک واقعہ انہوں نے کچھ اس طرح بیان کیا۔ حکیم صاحب کو ایک عارضہ لاحق ہوا۔ ان کے معالج ڈاکٹر نے اس حصہ کو قطع کرنے کا مشورہ دیا یا فیصلہ لیا، حکیم رئیس الرحمٰن نے اس رائے کی مخالفت کی اور محمرات سے اس کا علاج کیا۔ اللہ نے شفا دی اور وہ حصہ قطع و برید سے بچ گیا۔ ''پدر نہ کند پسر تمام کند'' والا فارسی محاورہ اس واقعہ پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ 'جہانِ طب' کا یہ شمارہ اپنے شفیق استاذ کے نام مخصوص کر کے حکیم رئیس الرحمٰن صاحب نے ان کے تذکرے کو جاوداں بنا دیا ہے۔ حق شاگردی ادا کرنے پر ان کو میری طرف سے دلی مبارکباد۔ میرے خیال میں یہ شعر حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کی شخصیت کا مظہر ہے۔

کہاں گم ہوئے وقت کی وسعتوں میں
چڑھے پانیوں میں اتر جانے والے

●●●

غزل

اچھا یہ طریقہ ہے ساقی! رندوں میں ہمارا نام بھی ہے
پینے بھی نہیں دیتا ہم کو، پینے کا مگر الزام بھی ہے
دنیا کو دکھانے کی خاطر توڑوں گا نہ پیمانہ زاہد
توہین مذاق زہد بھی ہے توہین شکست جام بھی ہے
آرام میں سو جانا کیسا؟ تکلیف میں گھبرانا کیسا؟
اس چلتی پھرتی دنیا میں تکلیف بھی ہے آرام بھی ہے
یہ تیری حیاتِ چند نفس، عبرت ہے جہاں والوں کے لیے
اے پھول تیرے آئینہ میں، تکلیف بھی ہے آرام بھی ہے
اے نیچی نظر والے ظالم، تو تیرِ نظر برسائے جا
زخمی ہوئے ہم تو کیا ہوگا، زخمی تو ہمارا نام بھی ہے

الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے
سرخی بھی بدل جائے، فسانہ بھی بدل جائے
باتوں سے نہ بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ
اپنے کو بدل لو تو زمانہ بھی بدل جائے

استاذ محترم حکیم مظہر سبحان عثمانی

☆ پروفیسر خالد زماں خاں

میں جب بھی اپنے محسن اور مثالی اساتذہ کرام کی فہرست پر نظر ڈالتا ہوں تو سب سے پہلے میرے ذہن میں حکیم مظہر سبحان عثمانی کا نام آتا ہے۔ میں نے ان سے نہ صرف کسب فیض کیا بلکہ ایسے بیش قیمت موتی چنے جس نے میری تعلیم کی راہوں کو روشن کر دیا۔ آج وہ اس دنیا میں نہیں ہیں مگر ان کی شفقت، محبت، ان کی یادیں اور ان کے نقوش زندہ و تابندہ ہیں۔ وہ دنیائے حکمت کے روشن چراغ تھے، شعر و سخن ان کی جاگیر تھی، سیاست کے کوچوں سے باخبر تھے، جو لوگ ان سے قریب تھے، وہ ان کی جامعیت کے معترف تھے۔

حکیم عثمانی صاحب کے نام سے پہلی بار ہمدرد طبی کالج، دہلی میں میرے کان آشنا ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں ہمدرد طبی کالج میں میرا داخلہ ہوا، اس وقت عثمانی صاحب کالج سے جا چکے تھے، لیکن اساتذہ اور سینئر طلباء میں برابر ان کی طبّی حذاقت کے چرچے ہوتے رہے۔ آپ سے تلمذ کا شرف مجھے بعد میں حاصل ہوا۔

حکیم عبداللطیف صاحب جب علی گڑھ سے سبکدوش ہوئے تو ہمدرد طبیہ کالج میں انہوں نے پرنسپل کا منصب سنبھالا۔ آپ کے ہمراہ حکیم سید ظل الرحمٰن، حکیم عبدالجبار خاں اور عثمانی صاحب بھی ہمدرد تشریف لائے اور درس و تدریس کی ذمہ داری سنبھال لی۔ معالجات کے مضمون سے عثمانی صاحب کو فطری لگاؤ تھا۔ جامعہ ہمدرد میں آپ نے معالجات پڑھانا شروع کیا جلد ہی طلبہ میں مقبولیت حاصل کر لی۔ جو لوگ یونیورسٹیوں اور کالجوں کی دنیا سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ باہمی چشمکیں، ریشہ دوانیاں بھی تعلیمی نظام کا ایک جز بن چکی ہیں۔ یہ مسموم ماحول عثمانی صاحب کو راس نہ آیا اور آپ نے ہمدرد طبیہ کالج کو خیر باد کہہ دیا۔ صلاحیتیں اپنا لوہا خود منواتی ہیں۔ دہلی کے طبّی حلقوں میں آپ کا نام اجنبی نہیں رہ گیا تھا جلد ہی آپ ہندوستانی دواخانہ میں انچارج طبیب کے منصب پر فائز ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد طبیہ کالج قرول باغ میں بحیثیت سینئر لیکچرر آپ کا تقرر ہو گیا، لیکن حاسدین کی عیاریوں نے کچھ ایسی بساط بچھائی کہ آپ کو طبیہ کالج چھوڑنا پڑا، حکیم عبدالحمید صاحب کو پوری تفصیل معلوم ہوئی تو انہوں نے عثمانی صاحب کو جامعہ ہمدرد میں بلا لیا۔

یہ پہلا موقع تھا جب ایک طالب علم اور ایک شاگرد کی حیثیت سے میں نے آپ کو قریب سے دیکھا، آپ نے جو موتی بکھیرے، ان کو اپنے دامن میں چنا، آپ کے طریقۂ تدریس کو ذہن نشیں کیا پہلی مرتبہ جب آپ ہماری درس گاہ میں داخل ہوئے تو میں حیران رہ گیا، روایتی اطبا سے الگ آپ کی مسحور کن شخصیت تھی، صاف ستھرا لباس، نفیس انداز، گورے چٹّے، لمبا قد، چال میں ایک وقار آہستہ آہستہ قدم رکھتے ہوئے کلاس میں داخل ہوئے تو طلبہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ چہرے سے خاندانی وجاہت عیاں تھی۔

انداز تدریس ایسا کہ دل موہ لے، سب سے پہلے طلبہ کو مضمون سے متعارف کرایا، لیکچر ایسا شستہ اور جامع تھا جیسے کوئی کتاب کھلی ہوئی ہو۔

☆ سابق ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تدریس مفردات میں آپ کا طریقہ یہ تھا کہ ایک دوا کا نام لکھا، اس کے خواص کی تفصیل طلبہ کو املا کرائی، مشکل اصطلاحات کی تشریح کرتے اور اس طرح جملہ معلومات طلبا کو ذہن نشین ہو جاتیں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک بار منضج کا ذکر آیا تو آپ نے لکھانا بند کر دیا اور منضج کی تعریف کی، مجھے آج بھی وہ تعریف یاد ہے آپ نے بتلایا کہ:

''منضج دوا کے اس فعل کو کہتے ہیں جو خلط پر اثر انداز ہوتا ہے، اگر وہ خلط غلیظ ہو تو اس کو اتنا رقیق کر دے کہ وہ عروق اور خلاؤں میں نفوذ کر جائے اور اگر خلط رقیق ہو تو اس کو اتنا غلیظ کر دے کہ وہ خلاؤں میں ٹھہر سکے اور آسانی سے جذب ہو جائے''۔

حکیم عثمانی صاحب ہمیں مفردات اور کلیات ادویہ پڑھاتے تھے، دوران تدریس ہلکے پھلکے مذاق بھی کر لیا کرتے تھے، ایک دن ہمارے ایک ساتھی سے کہا کہ ''میاں اللہ اللہ بھی کیا کرو اور پڑھا بھی کرو''۔

۱۹۷۷ء میں عثمانی صاحب نے اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ جوائن کر لیا۔ آپ کے ہم جماعت حکیم علی حیدر جعفری پہلے سے وہاں موجود تھے، دیگر اساتذہ سے بھی خوشگوار تعلقات تھے، مگر علی گڑھ کا ماحول انہیں پسند نہیں آیا اور وہ واپس دہلی چلے آئے اور دوبارہ ہندوستانی دوا خانہ کے انچارج طبیب ہو گئے۔ اسی دوران حکیم انوار احمد خاں شیروانی نے قرول باغ طبیہ کالج میں مشاہیر حکما کو جمع کر لیا اور اسے صف اول کا طبیہ کالج بنا دیا۔ ان مشاہیر میں حکیم فضل الرحمٰن مصباحی، حکیم کریم اللہ قادری، حکیم احمد یٰسین، طبیبہ افسر جہاں، حکیم عبدالجبار خاں اور طبیبہ نزہت اشتیاق خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ شیروانی صاحب کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ حکیم عثمانی کو قرول باغ طبیہ کالج میں لانے میں کامیاب ہوئے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی اور تکمیل الطب کالج لکھنؤ:

تکمیل الطب کالج لکھنؤ عثمانی صاحب کا معہد علمی تھا، آپ نے اسی کالج سے تعلیمی فراغت حاصل کی۔ لکھنؤ کے اثرات پڑنا لازمی تھا۔ مفردات میں مہارت تامہ اسی کالج کی دین تھی۔ واضح رہے کہ مفردات میں حذاقت اطباء لکھنؤ کی خصوصیات میں سے ہے، لکھنؤ میں آپ کے اہم اساتذہ میں حکیم شکیل احمد شمسی، حکیم مسیح الزماں ندوی وغیرہ تھے، آپ کے رفقاء میں حکیم علی حیدر جعفری، حکیم فیاض علی صدیقی اور حکیم فاروق احمد رضوی تھے، سینئر ساتھیوں میں حکیم عبداللطیف خاں بجنوری، حکیم نصیر احمد اور حکیم خلیل احمد وغیرہم تھے۔ عثمانی صاحب کو اپنی مادر علمی سے بے پناہ محبت تھی اور یہاں کے احوال سے ہمیشہ باخبر رہتے تھے۔ ۱۹۸۰ء میں تکمیل الطب کالج میں اساتذہ کی باہمی چپقلش عروج پر تھی حتیٰ کہ ایک صاحب کو جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ عثمانی صاحب کو اطلاع ہوئی تو بہت افسوس ہوا۔ فوراً لکھنؤ پہنچے تمام اساتذہ کو ایک جگہ جمع کیا ان میں مصالحت کرائی۔ آپس میں گلے ملوایا اور دہلی آ گئے۔

حکیم عثمانی اور آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس:

آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس سے عثمانی صاحب کا گہرا تعلق تھا، حقیقت یہ ہے کہ طبی کاز اور طبّی کانفرنس سے عثمانی صاحب کو بے انتہا لگاؤ تھا۔ آپ طبّی کانفرنس کی میٹنگوں میں پیش پیش رہتے، طبّی کانفرنس کا چار دہائیوں کے دوران ہونے والا شاید ہی کوئی جلسہ رہا ہو جس میں عثمانی صاحب نے اسٹیج کی ذمہ داری نہ سنبھالی ہو اور خطابت کے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ آپ اطباء کی طب یونانی سے غفلت اور لاپرواہی پر برملا بولتے تھے، ۱۹۸۰ء میں ہمدرد طبیہ کالج میں طالب علمی کے دوران ہمارے کالج کے احاطے میں طبّی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا، حکیم عثمانی صاحب نے اطبا سے مخاطب ہو کر کہا:

''جب آپ لوگ کلاس میں ہوتے ہیں تو طب یونانی کی بات کرتے ہیں، جب میٹنگ میں شریک ہوتے ہیں تو طب یونانی کی بات کرتے ہیں، لیکن جب اپنے مطب میں ہوتے ہیں تو طب کو بھول جاتے ہیں، دن بھر یونانی معالجات پڑھا کر پنسلین کا انجکشن لگانا ہماری سمجھ سے پرے ہے''۔

ایک میٹنگ میں آپ اور حکیم ابوالکلام گورکھپوری نے اتر پردیش میں طب یونانی کے علاحدہ ڈائرکٹوریٹ کے قیام کا مطالبہ کیا، بہت سے اطبا نے آپ کی اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا لیکن عثمانی صاحب اور حکیم ابوالکلام اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ آپ نے میٹنگوں میں یونانی اور آیورویدک ڈائرکٹوریٹ کو الگ کرنے کی مانگ کی اور بار بار میٹنگوں میں آواز اٹھائی، اپنے ذاتی تعلقات کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوئے چنانچہ دونوں کے ڈائریکٹوریٹ الگ کر دیئے گئے اور آج یونانی کے

ڈائرکٹر حکیم صاحب کے ہی ایک شاگرد ہیں۔ آل انڈیا طبّی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی میں سینئر اساتذہ، معالجین اور یونانی کے آفیسران ممبر ہوا کرتے تھے۔ ایک میٹنگ میں ان کو مخاطب کرتے ہوئے عثمانی صاحب نے فرمایا:

''آج میں دیکھ رہا ہوں کہ اس کمیٹی میں اساتذہ کی تعداد زیادہ ہے اور معالجین کی تعداد کم ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے''۔

جیسا کہ میں نے بتلایا عثمانی صاحب کو کانفرنس کی سرگرمیوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ جب اساتذہ کانفرنس میں پہنچتے تھے تو عثمانی صاحب ان کا سامان اپنے ہاتھوں میں لے لیتے اور جہاں کہیں ان کو قیام کرنا ہوتا وہاں چھوڑ کر آتے تھے اور جب تک وہ دہلی میں رہتے عثمانی صاحب بذات خود ان کا خیال رکھتے تھے۔ ان اساتذہ میں بہت سے ایسے تھے کہ میٹنگوں میں ان کے ہم رائے نہیں ہوتے تھے، لیکن عثمانی صاحب کو ان سب سے کوئی غرض نہ تھی۔ عثمانی صاحب کو عزت نفس بہت عزیز تھی اور اس پر وہ ضرب نہیں آنے دیتے تھے۔ ان کی طبّی خدمات کو سراہتے ہوئے حکومت دہلی نے انہیں طبیب ریاست کے اعزاز سے بھی نوازا۔

حکیم عثمانی صاحب تعلقات اور روابط کو آخری حد تک نباہتے تھے۔ حکیم محمد ہشام صدیقی کو اپنا چھوٹا بھائی بنایا تو ہمیشہ بڑے بھائی کی طرح ان سے پیش آئے۔ حتی کہ ہشام صاحب کے بچے عثمانی صاحب کو تایا ابو کہتے تھے۔

۱۵/ جنوری ۲۰۱۳ء کو حکیم اجمل خاں کی روایتوں کا امین، طبیب حاذق، بے مثل خطیب اور حکومتی ایوانوں میں طب کی آواز اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔

آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

●●●

غزل

شرمائے یوں اَشک نکل کے
جیسے کسی کا آنچل ڈھلکے
دیکھ لیا ساقی نے ہنس کے
چھلکے وہ پیمانے چھلکے
میری اُن کی راہ میں دنیا
اکثر آئی بھیس بدل کے
یہ اپنی نگاہِ ناز سے پوچھو
کیوں مری آنکھ سے آنسو چھلکے
اُن آنکھوں میں آنسو جیسے
پانی میں دو پھول کنول کے
جب بھی دیکھا اُن کا دامن
آنکھ میں رہ گئے اَشک مچل کے
حسن کی اَشک آلودہ آنکھیں
جیسے کٹورے گنگا جل کے
دیکھیں راہِ عشق میں زخمی
کیا ہوتا ہے آگے چل کے

حکیم مظہر سبحان عثمانی — ایک معتبر شخصیت

☆ پروفیسر منصور احمد صدیقی

تاریخ بلا وجہ کسی شخصیت کو اپنے آغوش میں جگہ نہیں دیتی، بارش کی ہر بوند موتی نہیں بنا کرتی، وقائع نگار کسی فرد کو یوں ہی صفحۂ قرطاس کی زینت نہیں بننے دیتا۔ کیونکہ اُن کے یہاں سرسری سماعت کا توثیقی جواز نہیں ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ تمنا کے بغیر باغ کا کوئی پھول نہیں کھلتا، کامیابیاں انہیں کو ملتی ہیں جو منزل کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں، خارزار اور پُر آزار شاہراہوں کو اپنے تلووں کا لہو پلانا جانتے ہیں، کامیابیوں اور کامرانیوں کا سارا قصہ یقیں محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم سے عبارت ہوتا ہے، لیکن تقدیروں کی نقش گری کرنے والی ایک طاقت وہ بھی ہے جو کسی چمن زار کے لیے خود ہی کسی کِشت کا انتخاب کر لیتی ہے۔ آزادیٔ ہند سے کوئی ایک دہائی قبل یکم جولائی ۱۹۳۸ء کو مشرقی یوپی کے ضلع گورکھ پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں موضع صمد پور میں ایک ہونہار، ذہین وفطین بچے نے ایک ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جہاں علم وعمل، زہد واتقا اور خاندانی شرافت کے منارے پہلے سے تابناک اور منور تھے۔ حکیم صاحب کے والد آسودہ، خوشحال اور زمیندار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ علم و دانشوری میں اُن کے گھرانہ کا تشخص قائم تھا۔ خاندانی شرافت اور برتری کے پیش نظر حکیم عثمانی صاحب کی ابتدائی تعلیم والدہ محترمہ کی نگرانی میں گھر پر شروع ہوئی، عہدِ طفولت کے مرحلے سے گزرنے کے بعد درسِ نظامی کی صحیح تعبیر وتشریح کے لیے معروف دینی درس گاہوں کا رخ کیا، وہاں پر السنہ الشرقیہ [عربی و فارسی اور اردو] کے علاوہ روایتی فلسفہ، منطق، ادب، لغت اور علومِ عقلیہ ونقلیہ میں غوطہ لگایا۔

خاندان عزیزی کے ذریعہ تاسیس پانے والی برصغیر کی عظیم طبّی درس گاہ میں اُن کو صحت ومرض کی گتھیوں سے نبرد آزما ہونے کا حسین موقع ملا۔ ۱۹۵۵ء میں حکیم عثمانی صاحب تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں طبّی تسکین و طمانیت کی خاطر باریاب ہوئے اور ۱۹۵۹ء میں فاضلِ طب [FMBS] کی سند حاصل کر کے وطن مالوف گورکھ پور واپس ہو گئے۔ دورانِ طالب علمی حکیم شکیل احمد شمسی کی جوہر شناس نظروں نے حکیم صاحب کی ذہانت وفطانت کو پڑھ لیا تھا۔ اس طرح حکیم صاحب کو حکیم شکیل احمد شمسی صاحب نے اپنے خاص شاگردوں کی صف میں شامل کر لیا تھا۔

حکیم مظہر صاحب خود رقمطراز ہیں:

> ''ہر طالب علم کو تحصیل علم کے مختلف المراحل دور میں متعدد اساتذۂ فن سے کسب فیض کا موقع ملتا ہے، مگر ایسے اساتذہ کم ہوتے ہیں جو مدارس و جامعات کی مقررہ میعاد ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنے تلامذہ کی علمی سطح اور فکری رجحان کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے دم آخر تک چشمۂ فیض بنے رہتے ہیں، ایسے ہی اساتذۂ فن کی صف میں ایک قد آور اور دلآویز شخصیت میرے استاد شکیل احمد شمسی کی بھی تھی، استادِ مرحوم سے اپنے تلمذانہ تعلق کے گذشتہ تیس سال کے طویل زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو اُن کی پُر فیض رفاقت، بے پایاں محبت اور گرانمایہ سرپرستی کے آگے سر نیاز خم ہو جاتا ہے''

دیگر اساتذہ میں شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین احمد لکھنوی کی پُر فیض شاگردانہ عاطفت رہی، جن سے حکیم صاحب نے اسرارِ مطب اور نسخہ نویسی کی نزاکتوں سے خود میں جلا پائی۔ اثناءِ تعلیم کالج کی ادبی وثقافتی پروگراموں

☆ ڈائرکٹر، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور

میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے نیز دبستان لکھنؤ میں بھی آپ کی نمائندگی مداومت کے ساتھ رہتی تھی۔ ۱۹۶۱ء میں حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب نے گورکھ پور کی مشہور مارکیٹ اردو بازار میں حکیم ابوالکلام صدیقی کی معیت میں طبّی حذاقت اور فنی مہارت کا عملی مظاہرہ بحیثیت 'رئیس الطبیب' کیا۔ ترجیحی بنیادوں پر لکھنؤ اطباء کی روایت کے علمبردار رہے۔ شفائیات کے باب میں لکھنؤ کے اطباء ادویۂ مفردہ کو استحقاقی طور پر فوقیت دیتے تھے، ان کا طرزِ معالجہ کچھ اس طرح تھا:

''پہلے مرض کی تشخیص کرتے ہیں اور نوعیت مرض، جنس مرض، زمانہ مرض، حیات مرض وغیرہ کے مطابق مفردات کو ترتیب دے کر علاج کرتے ہیں''۔

مذکورہ بالا اقتباس سے اس بات کا عندیہ ملتا ہے کہ حکیم شکیل احمد شمسی تاحیات ان کے مثالی نمونہ رہے، چنانچہ اُنہیں کے ایماء پر ۱۹۶۴ء میں جامعہ طبّیہ گلی قاسم جان دہلی میں بحیثیت سینئر استاذ شعبہ معالجات جوائن کر لیا۔ یہاں کے گرد و نواح میں بطور طبیبِ حاذق بہت جلد شہرت پائی۔ ۱۹۶۹ء میں ہندوستانی دواخانہ گلی قاسم جان بلی ماران میں بحیثیت چیف فزیشین تقرر ہوا۔ یہاں بھی اُن کی معالجانہ ندرتوں کا خوب چرچا ہوا، خوب شہرت ملی۔ ۱۹۷۰ء میں آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج قرول باغ اینڈ ہاسپٹل نئی دہلی میں بحیثیت لیکچرر گریڈ-1 شعبۂ معالجات اور انچارج شفاخانہ کی حیثیت سے جوائن کیا۔ اس طرح شعبۂ معالجات میں وہ تسلسل کے ساتھ اپنی استادانہ مہارت اور جادوئی نبض شناسی سے اس عظیم درس گاہ کی نیک نامی میں برابر تعاون کرتے رہے۔ اساتذہ، طلبہ اور مریضوں میں یکساں مقبولیت اور نام وری پائی۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۴ء میں طبّیہ کالج بورڈ کے صدر نے حکیم عثمانی صاحب کا تبادلہ ہندوستانی دواخانہ میں کر دیا، کالج کے اساتذہ، ماتحت ملازمین اور طلباء نے بورڈ کے صدر کے اس حکم کے خلاف باقاعدہ احتجاجی مظاہرہ کیا اور کالج لگاتار چار مہینہ تک تعطل کا شکار رہا، نتیجتاً حکیم صاحب دوبارہ اپنی پوزیشن پر بحال کیے گئے۔ حکیم صاحب بعد میں اسی شعبہ میں ریڈر ہوئے، خاطرِ آزردہ سے بھری ہوئی حکیم صاحب کی زندگی بالآخر ۱۹۹۸ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئی۔ بعد میں حکومت دہلی نے اُن کو پروفیسر ایمریٹس مقرر کیا، پھر دہلی حکومت کی طرف سے ''اسٹیٹ ڈاکٹر'' کے اعزاز سے بھی سرفراز ہوئے۔ یہ اعزاز اُس وقت کے مرکزی وزیر تعلیم مرلی منوہر جوشی کے ہاتھوں دیا گیا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی یونانی طب کے مبادیات اور کلیات پر گہری نظر تھی۔ فنِ تدریس کو ایک متبرک اور برگزیدہ پیشہ سمجھ کر اس کی صورت طرازی اور پنہائیوں میں قدیم و جدید کے امتزاج کو خوب سے خوب تر بنا کر پیش کرنا جانتے تھے۔ قدیم طبّی آگہی وحسیات جو منطقی استدلال پر بنیاد کرتے ہیں، اُنہیں عصری رمزیات میں توجیہ وتشریح کر کے طلبہ کے سامنے پُرکیف وپُرکشش بنا کر پیش کرنے کا سلیقہ آتا تھا۔ نو دریافت امراض کے علل واعراض کو طے کرنا، اصولِ تشخیص متعین کرنا، اصولِ علاج کا تعین وتوضیحات اور ادویات کی خوشہ چینی میں قرول باغ طبّیہ کالج میں اُن کا کوئی ہمسر اور ثانی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سی سی آر یو ایم کے ذریعہ مرتب کیے جانے والے بیشتر نسخوں کی توثیق اور تدوین کے لیے اُن کے مشوروں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ مرحوم حکیم عبدالحمید صاحب اور مرحوم حکیم عبدالرزاق صاحب اُن کے قدردانوں میں تھے۔ جس کا ثبوت حکیم عبدالحمید صاحب کی قیادت میں کئی بڑے طبّی محاذوں پر اُن کی شمولیت سے ملتا ہے۔ وہ حکیم عثمانی کی آراء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ اس بارے میں حکیم عثمانی صاحب خود رقمطراز ہیں:

''اجمل خان طبّیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر معالجات کا انتخاب ہونا تھا حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم Selection commitee کے Expert تھے اور ان کے ساتھ سی سی آر یو ایم کے اس وقت کے ڈائرکٹر حکیم عبد الرزاق صاحب مرحوم بھی Selection committee کے ایک ممبر تھے۔ جب یہ قافلہ بذریعہ کار علی گڑھ کے لیے روانہ ہوا تو مرحوم عبدالرزاق صاحب نے مجھے بھی علی گڑھ چلنے کے لیے اپنے ساتھ لے لیا، وہاں پر یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ہم لوگوں نے قیام کیا۔ حکیم عبدالحمید مرحوم گیسٹ ہاؤس کے صحن میں ایک کرسی پر تشریف فرما تھے میں اُن کے قریب بیٹھا ہوا تھا، علمی گفتگو ہو رہی تھی دورانِ گفتگو بیخ کبر کا ذکر چل پڑا، میں نے اُس وقت جب یہ کہا کہ اس دواء کا پھل بطور اچار بھی استعمال ہوتا ہے اور پنجاب کے لوگ بکثرت اس کو پسند کرتے ہیں اور وہ اپنی زبان میں اس کو ٹینٹی بولتے ہیں، تو میں نے دیکھا کہ حکیم صاحب نے فوراً اپنی جیب سے چھوٹی سی ایک پاکٹ ڈائری نکالی اور اس میں کچھ لکھنے لگے''۔

اس واقعہ سے حکیم عبدالحمید کے یہاں حکیم عثمانی کی علمی وفنی حیثیت کا پتہ چلتا ہے، حکیم عثمانی صاحب زمانۂ طالب علمی سے ہی بہت متحرک اور فعال تھے، جس کا مظہر اُن کی بعد کی زندگی ہے۔ طلباء یونین تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے سکریٹری رہے، دورانِ قیامِ گورکھ پور وہاں کی بیشتر ادبی محفلوں

اور تنظیموں میں نہ صرف شریک رہا کرتے تھے، بلکہ وہاں کی ایک خاص تنظیم 'مرکز ادب' کے نائب صدر بھی رہے۔ چونکہ زمانۂ طالب علمی سے ہی کافی متحرک، باعمل اور فعال قسم کے فرد تھے اور فنِ خطابت پر اچھی دستگاہ تھی، اس لیے میدانِ سیاست کی گتھیوں کو تاحیات سلجھاتے رہے اور اسی پس منظر میں ۲۰۰۳ء میں نیشنل کمیشن فار مائنارٹیز کے وائس چیئرمین مقرر ہوئے اور ۲۰۰۶ء تک وہ اس عالی منصب پر فائز رہے۔

حکیم صاحب کا ذہن شروع سے اکیڈمک تھا۔ اُنہوں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں 'پرواز' نام کا ایک قلمی ہفت روزہ بھی نکالا تھا۔ وہ ماہانہ تجلی دیوبند کے ملا ابن العرب مکی کی طرز پر 'علامہ امرود بخش شلجمی' کے قلمی نام سے ایک مزاحیہ کالم 'برادری' میں لکھا کرتے تھے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عامر عثمانی اُن کی تحریروں کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ طبّی موضوعات پر اُن کی تحریریں خاص اہمیت کی حامل ہیں 'ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات' اُن کی ایک اہم علمی، تحقیقی کاوش اور طبّی ادب میں ایک بیش قدر اضافہ ہے۔ ایک سپہ سالار کے اندر طبابت جیسا نازک شغل ڈھونڈ کر مضمون نہیں، کتابچہ لکھنا حیرت و استعجاب کا کھلا مظہر اور ثبوت ہے۔ حکیم سید شجاع الدین ہمدانی اس بابت تحریر فرماتے ہیں:

> ''حکیم عثمانی مستقل کتابیں لکھنے کے عادی نہیں ہیں لیکن جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کی جودتِ طبع آسمان پر پرواز کرنے لگتی ہے، اس کی بہترین مثال ان کی کتاب ٹیپو سلطان کے معالجات ہے۔ ٹیپو سلطان میں ایک طبیب کی تلاش ایک محقق ہی کر سکتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بات کو سطحی نظر سے دیکھنا پسند نہیں کرتے وہ جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو نہایت عمیق اور دقیق نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس میں کوئی نئی بات تلاش کر لیتے ہیں''۔

اس کتابچہ کی زبان و بیان نہایت واضح، عام فہم، سلاست و روانی سے بھرپور ہے۔ گویا سرسید صاحب کے لفظوں میں ''بات دل سے نکلے اور دل میں پہنچے'' کا ترجمان ہے۔ اسی لیے دورانِ مطالعہ اکتاہٹ، بیزاری اور بے رغبتی نہیں ہوتی، تاریخی شواہد اور معتبر حقائق کی بنیادوں پر اس دستاویز کی آرائش اور تزئین کاری کی گئی ہے۔ خدشہ ہے کہ یہ دستاویزات ضائع نہ ہو جائیں اس لیے ضرورت ہے کہ اس کی دوبارہ نہ صرف طباعت کی جائے، بلکہ اس گوہر افشاں کو بنیاد بنا کر اس عظیم شخصیت کے کارناموں کو مزید زدائش کی جائے اور عقیدت میں ان کی عظمتوں کو سوسو سلام کیا جائے، کویراج برہم دت شرما سابق پرنسپل آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، نئی دہلی حکیم موصوف کی عظمت و بڑائی کا کچھ یوں اعتراف کرتے ہیں:

> ''آج کل کے نوجوانوں میں بحیثیت لیکچرر، معالج اور صاحب قلم، اُن کی خداداد صلاحیت اور ذہانت کا میرے اوپر نہایت خوشگوار اثر ہے۔ طبیہ کالج ہسپتال میں ان کے مریضوں کی بھاری تعداد کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کہ آج سے بہت پہلے کے روایتی طرز کے حکیموں کے مطب میں مریضوں کا ہجوم ہے''۔

حکیم موصوف ایک خوش الحان، شعلہ بیان اور سحر انگیز مقرر تھے۔ اُن کا اندازِ خطابت نہایت سادہ، پُرکشش اور اس قدر پُراثر ہوتا کہ محفلوں اور علمی مجالس میں حشمت، سنجیدگی اور متانت چھا جاتی تھی۔ حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی لکھتے ہیں:

> فنِ تقریر میں وہ اس قدر حاوی ہیں کہ ملک کی فعال سیاست میں ان کا ایک اہم مقام ہے اور بحیثیت طبیب ملک کے دارالسلطنت میں نیک نام ہیں۔ دلی کی سیاست اور طبابت دونوں پر اُن کا قبضہ، مسیح الملک حکیم اجمل خان کی یاد تازہ کر دیتا ہے''۔

مذکورہ گوناگوں صفات کے علاوہ حکیم عثمانی اشعار بھی کہتے اور مترنم آواز میں گنگناتے تھے۔ مرحوم حکیم عبدالحمید صاحب سے متاثر ہو کر اپنی سوچ کو اس طرح شعری پیکر عطا کیا ہے۔

الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے
سرخی بھی بدل جائے، فسانہ بھی بدل جائے

باتوں سے نہ بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ
اپنے کو بدل لو تو زمانہ بھی بدل جائے

مصادر و مراجع

۱- تذکرۂ استاذ حکیم مظہر سبحان عثمانی ''حکیم شکیل احمد شمسی شخصیت اور فن'' آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، نئی دہلی، ص ۱۴۹-۱۳۹

۲- ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات، حکیم مظہر سبحان عثمانی، سلسلہ مطبوعات مجلس تحقیقات طبّی، دہلی، الجمعیۃ پریس، دسمبر ۱۹۷۶ء

۳- تکمیل الطب کالج کے صاحبِ تصنیف اطبّاء، حکیم وسیم احمد اعظمی، تکمیل الطب کالج نمبر، سہ ماہی جہانِ طب، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۹۹-۲۹۸

۴- الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے، حکیم مظہر سبحان عثمانی، 'پیکر فکر و عمل: حکیم عبدالحمید' مرتب حکیم محمد خالد صدیقی مطبع گریٹ انٹر پرائزز جی ۳۰ سریتا وہار، نئی دہلی ۲۰۱۰: ص ۱۶۲-۱۵۹

●●●

حباب میں موتی — حکیم مظہر سبحان عثمانی

☆حکیم شمس الآفاق

صحت و مرض لازمۂ زندگی ہیں، جس طرح ہر ذی روح کے لیے موت یقینی ہے، ویسے ہی صحت کے ساتھ مرض یقینی ہے۔ اس سے کوئی بچا نہیں، حتیٰ کہ انبیاء بھی نہیں۔ زندگی اور موت کی طرح صحت اور مرض بھی اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔

الہٰ آباد یونیورسٹی چھوڑنے کے بعد جب میں نے یونانی میڈیکل کالج الہٰ آباد میں داخلہ لیا اور طب یونانی سے وابستگی ہوئی تب ہی سے چند اطباء کے اسمائے گرامی سامع نواز ہونے لگے تھے۔ حماد عثمانی مرحوم صاحب سے اکثر و بیشتر نامور اطباء کا ذکر سننے کو ملتا رہتا تھا۔ ان میں چند خاص ناموں کا ذکر ضرور ہوتا تھا۔ ایک نام تو حکیم پروفیسر محمد طیب صاحب مرحوم و مغفور کا اور دوسرا نام حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب مرحوم و مغفور کا۔

حکیم حماد عثمانی ایک معتبر شخصیت تھے۔ وہ بے جا تعریف کے قطعی قائل نہ تھے، یہ لوگ علمی صلاحیتوں کو جانتے تھے۔ ان کے منہ سے ان اطباء کا نام سُن کر ملاقات کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ پھر ان دونوں حضرات سے ملاقات کا شرف کبھی کبھی امتحان کے زمانے میں ہونے لگا۔ وقت گزرتا گیا اور ایک دن ایسا آیا کہ مجھے دلی میں وزارت صحت، حکومت ہند میں ملازمت مل گئی۔ اب ان حضرات سے ملاقات کا راستہ آسان ہو گیا تھا۔ اکثر و بیشتر دفتر کے کام سے یا پھر ذاتی ملاقات کی غرض سے طبیہ کالج، قرول باغ جانا ہوتا تو حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب سے ملاقات کا شرف ضرور حاصل کرتا۔ وہ بھی خوش ہوتے۔ دھیرے دھیرے ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور تعلقات بہت وسیع اور قریبی ہو گئے۔ اکثر یونانی فارماکوپیا کمیٹی کی میٹنگوں میں ان سے علمی بحث اور مباحثہ کا خوب کامیاب دور چلتا اور اس طرح میں ان کی علمی لیاقت اور طبّی صلاحیت کا قائل ہو گیا۔

حکیم صاحب موصوف میرے لیے ایک استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن نہ کبھی انہوں نے اپنے کو استاد سمجھا اور نہ مجھے غیر سمجھا۔ مجھ سے بہت شفقت اور محبت سے ملا کرتے تھے۔ پھر ایک دور وہ بھی آیا کہ جب میں اپنی کتاب 'شفاء الامراض' کے سلسلے میں ان سے ملا اور ان سے گزارش کی کہ آپ اس کتاب پر نظر ثانی کر لیں، چونکہ اس زمانے میں ان کی طبیعت ناساز رہتی تھی۔ اس لیے انہوں نے صرف تبصرہ پر ہی اکتفا کیا۔ یہ بھی ان کی مہربانی اور محبت تھی کہ انہوں نے مجھ پر یہ کرم فرمایا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو بے لوث، یاروں کے یار، شاگردوں کے مشفق اور ہمدرد اور مریضوں کے مسیحا تھے۔ مطب میں بیٹھتے تو مریضوں سے مطب بھرا ہوتا تھا۔ ایک سے ایک پیچیدہ مریض ان سے قرول باغ کے مطب میں مستفیض ہوتے تھے۔ معالجہ اور نسخہ نویسی ایسی کرتے تھے کہ مریض کو نہ اس کے حاصل کرنے میں اور نہ اسے تیار کرنے میں دقت ہوتی۔ آسانی سے بازار سے حاصل کرتے اور دوا تیار کر لیتے۔ مریض دوا کے چند روز استعمال کے بعد صحت یاب ہو کر خوش خوش اپنے گھر واپس چلا جاتا۔ ان کو خدا نے دست شفا بخشا تھا۔ نبض پر ہاتھ رکھتے ہی، مریض سکون محسوس کرنے لگتا اور دوا استعمال کر کے شفایاب ہو جاتا۔ مریضوں کو Appointment کے ذریعہ ہی دیکھتے تھے۔ جتنے وقت کے پابند تھے اس سے زیادہ اصول کے پابند تھے۔ اپنے مطب میں 'ضیق النفس' کے مریضوں کو 'شربت ضیقی' حکیم رام لال ماہر میرٹھ کی تیار کردہ دوا خوب استعمال کراتے اور مریض بھی شفایاب ہوتے۔ انہیں کو دیکھ کر میں نے بھی اس دوا کا استعمال اپنے مطب میں شروع کر دیا اور مستفیض ہوا۔ کہتے تھے کہ 'ضیق النفس کے مریضوں کے لیے 'رام بان' کا

☆ سابق ڈپٹی ایڈوائزر، [یونانی]، وزارت صحت و خاندانی بہبود، حکومت ہند

کام کرتی ہے۔حقیقت میں ایسا ہی ہوتا تھا۔ یہ دوا شاید اب دستیاب نہیں ہے۔اسی طرح حکیم صاحب موصوف 'تخم کونچ' کو امراض اعصاب میں خوب استعمال کرتے۔مفرد دواؤں کے استعمال میں وہ حکیم شکیل احمد شمسی مرحوم کے شاگرد تھے۔خوب خوب مفرد دوائیں استعمال کرتے۔ان کے نسخوں سے جدت پسندی عیاں ہوتی تھی۔وہ طبّی اجتہاد کے قائل تھے۔کسی بات کو مِن وعَن مان لینا ان کا شیوہ نہیں تھا۔کسی کو خوش کرنے کے لیے ہاں میں ہاں ملانے کو ناپسند فرمایا کرتے۔ایسے لوگوں سے نفرت تک بھی کرتے تھے۔ شاعری میں بھی ایک اہم مقام رکھتے تھے۔حکیم شمسی صاحب مرحوم ہی کی شاگردی میں انہوں نے شاعری کے میدان میں بھی قدم رکھا اور بازی ماری اور کامیاب رہے۔وہ میرے مشفق بھی تھے اور رفیق بھی۔

میری کتاب 'شفاء الامراض' میں جس بے باکی اور جرأت سے تبصرہ لکھا وہ قابل ستائش بھی ہے اور قابل تحسین بھی۔ یہ تبصرہ اطباء حضرات کے لیے ایک مثال ہے اور سبق آموز بھی، اگر وہ سبق لینا چاہیں نہ کہ آج کے پیشہ ورانہ مبصر حضرات کی طرح جو حقیقت سے دور صرف خوشامدانہ لہجے میں تبصرہ کرتے اور لکھتے ہیں۔ یہ پیشہ ور مبصر ہیں۔ان کا تبصرہ حقیقت اور سچائی سے کوسوں دور رہ کر منافقت کا طریقے والا ہوتا ہے۔ جب کہ حکیم صاحب کا تبصرہ بے باک اور نہایت سادہ اور حقیقت پر مبنی ہوتا تھا۔علمی حضرات ثقیل زبان کا سہارا نہ لے کر عام فہم اسلوب کا طریقہ استعمال کرتے ہیں۔ مواد، معیار اور اسلوب بیان کا حقیقی تجزیہ کرتے ہیں۔یہی ان کا معیار اور طریقہ تھا۔آج معیاری، حقیقت پسند اطباء تو عنقا ہیں۔

ان کے مفردات کے نسخے بہت سادہ اور سہل ہوتے تھے۔آسان نسخے تحریر کرتے جو نہ صرف معمول مطب ہوتے، بلکہ ان کے اجزاء بھی سہل الحصول ہوتے۔ان کی ترتیب میں موصوف کی طباعی وجدت طرازی صاف عیاں ہوتی تھی۔

معالجات کے میدان میں عثمانی صاحب حکیم طیب صاحب مرحوم کے ہمعصر تھے۔دونوں کی تشخیص وتجویز نہ صرف بہت معیاری ہوتی بلکہ کارگر اور مفید بھی ہوتی تھی۔چھوٹے چھوٹے نسخوں سے بڑے بڑے پیچیدہ اور مزمن امراض کا علاج بخوبی کرتے تھے۔ جو شان اور خوبی معالجات کے میدان میں حکیم پروفیسر طیب صاحب مرحوم کی تھی وہی طرز اور طریقۂ علاج کم وبیش حکیم مظہر سبحان عثمانی کا بھی تھا۔کبھی کبھی حکیم طیب صاحب بھی ان کے نسخوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو جاتے۔ان کی معالجاتی صلاحیت یقیناً بہت اعلیٰ پیمانے کی اور سائنٹفک ہوتی تھی۔اس کا احساس ہم سب لوگوں کو پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے اور جب تک زندگی باقی ہے تب تک رہے گا۔

حکیم صاحب موصوف علم وادب اور طبّی دنیا کی ایک بہت ہی معتبر شخصیت تھے۔ان کے نسخے، ان کے مقالات ونگارشات اور ان کی تقریریں ان کے علم وفضل کے گواہ ہیں۔اسلامی علوم نیز خالص دینی علوم پر اور شعر وشاعری پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔طب قدیم کے ساتھ ساتھ طب جدید کی ایک اہم شاخ میں بھی ان کو صرف سند ہی حاصل نہیں تھی بلکہ فنی آگہی بھی تھی۔ ان دونوں کے امتزاج سے وہ کافی گل کھلاتے تھے، حیرت سے زیادہ خوشی اور اس سے زیادہ افتخار محسوس ہوتا تھا کہ وہ مسلسل مطالعہ کرتے تھے۔ان کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع ہوتا تھا۔اپنے مطالعے کے ثمرات کو اپنے قلب وجگر میں خون کے ساتھ سمو لیتے تھے اور اس ہضم علمی سے طبّی دنیا کو مستفید کرتے تھے۔

علم طب کو عطیہ خداوندی کہا جاتا ہے۔جس زمانے میں انسانی تہذیب نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اس زمانے سے صحت کی طرف رہنمائی کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود لے رکھی تھی۔صحت اور مرض دونوں اللہ کی طرف سے ہیں۔حکیم صاحب کا عقیدہ اتنا پختہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا 'وَاِذَامَرِضتُ فھُوَ یشفین' [الشعراء، پارہ۱۹] کو خوب پڑھا کرتے۔ یہ ان کی ایمانی پختگی کا بین ثبوت ہے۔ یہ صرف عقیدہ ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ شفا دینے والا صرف اور صرف اللہ ہے۔حکیم صاحب اکثر و بیشتر اپنے مریضوں اور ساتھیوں سے کہا کرتے تھے کہ کھانے کے بعد تھوڑا آرام کرنا چاہیے اور رات کو کھانے کے بعد چہل قدمی کرنی چاہیے۔ وہ حقیقت میں ایک نایاب گوہر تھے۔

دیکھیے موت ایک ناگزیر حقیقت ہے انسان مٹی سے پیدا ہوا ہے اور مٹی میں ملایا جائے گا اور پھر اسی مٹی سے اٹھایا جائے گا۔کیا خبر تھی کہ اتنی جلدی ایسا طبیب، ایسا مسیحا

اپنی خود داری کو سینے سے لگا کر ایک روز
موت کی وادی میں چپکے سے قدم رکھ دے گا

اللہ تعالیٰ ایسے طبیبوں، ایسے حکیموں کی قبر کو نور سے بھر دے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ان کے لیے یہی سب سے بڑا اور اہم خراج عقیدت ہوگا۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی — ایک ہمہ گیر شخصیت

☆پروفیسر ابوبکر خاں

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ حکیم صاحب گورکھپور ضلع کے صمد پور گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا گاؤں گورکھپور کے بانس گاؤں تحصیل میں واقع ہے۔ آپ کی حیثیت طبّی دنیا میں شمس کی طرح ہے، جو کہ طبّی دنیا کو ہمیشہ روشن کرتا رہے گا۔ عثمانی صاحب ایک اچھے استاذ، سیاست داں اور ایک کہنہ مشق طبیب تھے۔

میری اُن سے ملاقات ویسے تو پہلے سے تھی، مگر خصوصی ملاقات اس وقت ہوئی جب حکیم صاحب اپنے بیٹے دانش ریحان عثمانی کے داخلہ کے سلسلے میں میرے پاس علی گڑھ تشریف لائے۔ ویسے تو اُن کی اور میری عمر میں کافی فرق تھا، لیکن اُنہوں نے میرے ساتھ ایک دوست کا سا تعلق رکھا۔ میں جب کبھی دہلی جاتا تو اُن سے ملاقات ضرور کرتا، بلکہ اکثر اوقات اُن کے ساتھ ہی قیام کرتا تھا۔

استاذ کی حیثیت سے حکیم صاحب نے قرول باغ طبّیہ کالج، دہلی سے اپنا کیریئر شروع کیا اور وہیں سے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ شروع سے آخر تک شعبہ معالجات سے وابستہ رہے۔ وہ ایک تجربہ کار اور مشفق استاذ تھے، طلبہ اور طالبات کو طبِ یونانی کی اچھی تعلیم دیتے تھے اور طالب علم اُن سے مطمئن رہتے تھے۔ اردو زبان پر اُن کو عبور حاصل تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اُن کو فارسی اور عربی زبان پر بھی دسترس تھی۔ میں نے کئی بار ممتحن کی حیثیت سے ان کے طلبہ اور طالبات کا امتحان لیا، جس سے اندازہ ہوا کہ عثمانی صاحب بچوں کو کتنی اچھی تعلیم و تربیت دے رہے ہیں۔

حکیم عثمانی صاحب بہت اچھے انسان تھے، دوسروں کی مدد اور خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ طبّی دنیا کے کئی لوگوں نے اُن کے تعلقات سے بہت فائدہ اٹھایا۔ انسانی رواداری اور ہمدردی اُن کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اُن کو بہت تکلیفیں پہنچائیں، مگر وہ حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہے اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ خاندانی عزیز و اقارب اور تعلقات والوں کے ساتھ اُن کا رویہ مشفقانہ اور ہمدردانہ رہا کرتا تھا۔

عثمانی صاحب کو زندگی کا بہت تجربہ حاصل تھا، انتقال سے چند ہفتے پہلے اپنے بیٹے دانش ریحان عثمانی کو نصیحت کی تھی کہ زندگی کس طرح گزارنی ہے اور کون تمہارے دوست اور کون دشمن ہیں؟۔ اُن کا بیٹا دانش دہلی گورنمنٹ میں ڈرگ انسپکٹر [یونانی] کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہا ہے۔

سیاست داں کی حیثیت سے حکیم عثمانی صاحب ایک قومی سیاسی جماعت سے منسلک رہے، مگر اپنی رکنیت سے اُنہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا، حالانکہ پارٹی کے سینئر ممبران اور وزیر اعظم سے اُن کے ذاتی تعلقات تھے۔ حکیم صاحب بہت اچھے مقرر تھے اور بڑے بڑے جلسوں کو خطاب کیا کرتے تھے۔ الیکشن کے زمانے میں اکثر موقعوں پر خصوصاً دہلی کے مسلم علاقوں میں اُن کی تقریریں لازمی طور پر ہوا کرتی تھیں۔

میں نے ایک بار حکیم صاحب سے سیاسی جماعت کی رکنیت حاصل کرنے کا سبب معلوم کیا تو جواب میں اُنہوں نے فرمایا کہ ایک سیاسی

☆سابق صدر شعبۂ معالجات و ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

جماعت کے بہت سینئر رکن، جو وزیر بھی رہ چکے تھے، حکیم صاحب کے زیر علاج تھے، اس وجہ سے اُن کا عثمانی صاحب کے یہاں آنا جانا تھا، اس بات کا فائدہ اٹھا کر اُن کے کالج کے ایک ساتھی نے اُس وقت کی برسر اقتدار پارٹی کی مدد سے عثمانی صاحب کو بہت پریشان کیا اور اُن کو Suspend کروادیا، اس کے بعد حکیم صاحب نے اپنے مریض اور پارٹی کے سینئر رکن کی مدد سے پارٹی کی رکنیت حاصل کی اور ایک مدّت تک رکن رہے۔ حکیم صاحب قومی اقلیتی کمیشن کے تین سال تک نائب صدر رہے اور کمیشن کے کام کو بخیر وخوبی انجام دیا۔ سیاسی حلقوں میں آج بھی اُن کی اہمیت کا تذکرہ ہوتا ہے۔

بحیثیت طبیب عثمانی صاحب کہنہ مشق طبیب تھے اور اُن کا شمار دہلی کے ممتاز اور نامور اطبا میں ہوتا تھا۔ اُن کا قیام قرول باغ کی رہائشی کالونی میں تھا اور آپ اپنے رہائشی مکان کے باہر کے کمرے میں مطب کیا کرتے تھے۔ میرا اکثر اُن کی رہائش گاہ پر قیام کا اتفاق ہوا، میں نے دیکھا کہ عثمانی صاحب کے پاس دہلی کے علاوہ ہریانہ، پنجاب اور اُتر پردیش سے خاصے مریض آیا کرتے تھے اور علاج سے مریضوں کو خاطر خواہ فائدہ بھی ہوتا تھا۔ اکثر اوقات میرا اُن سے علاج معالجہ کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال ہوتا رہتا تھا۔ اُنہوں نے میرے مشورے سے کئی نسخے بھی اپنے ڈائری میں نوٹ کیے۔ اپنے مطب میں زیادہ تر خود تیار کردہ دوائیں استعمال کرتے تھے اور چند ایک دوائیں مختلف دوا ساز اداروں مثلاً ہمدرد، دوا خانہ طبّیہ کالج علی گڑھ اور دہلوی ریمیڈیز وغیرہ کی استعمال کرتے تھے۔

عثمانی صاحب مزمن اور پیچیدہ امراض کا بہت موثر علاج کیا کرتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اُنہوں نے روہنی علاقے میں واقع اپنے مکان میں سکونت اختیار کرلی تھی اور قرول باغ میں ذاتی مطب قائم کرلیا تھا، جس میں ہر اتوار کو روہنی سے آکر مطب کیا کرتے تھے۔ اُن کے مطب پر دور دور سے مریض آیا کرتے تھے۔ ایک بار میں اُن کی رہائش گاہ پر بیٹھا تھا کہ علی گڑھ کی ایک مریضہ اپنے بچے کے ساتھ آئی اور حکیم صاحب نے میرا تعارف کرایا، یہ مریضہ علی گڑھ کے بہت بڑے تاجر کی بیٹی تھیں۔

آخر میں میری دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کو اپنی آغوش رحمت میں جگہ دے، آمین!

●●●

غزل

میرے نہ ہوئیے مجھے اپنا نہ کیجئے
لیکن مذاقِ حسن کو رُسوا نہ کیجئے

دل تو یہ کہہ رہا ہے کہ اُن سے گلہ کروں
غیرت یہ کہہ رہی ہے کہ شکوہ نہ کیجئے

ٹوٹے گا نفس کا یہ تسلسل خبر نہیں
چلتی ہوئی ہوا کا بھروسہ نہ کیجئے

ظالم سے گلستاں کو بچانا ضرور ہے
کچھ گل مسل گئے ہیں تو پروا نہ کیجئے

ہے آج تیز دھوپ میں ہمت کا امتحاں
اس وقت آپ زلف کا سایہ نہ کیجئے

مظہرؔ وہ بت کدہ ہو، کلیسا ہو یا حرم
جب تک نہ دل جھکے کہیں سجدہ نہ کیجئے

استاذِ محترم پروفیسر حکیم مظہر سبحان عثمانی — کچھ یادیں کچھ باتیں

☆ ڈاکٹر محمد سکندر حیات صدیقی

جب میں سینٹ اینڈریو کالج، گورکھپور سے بی ایس سی کر رہا تھا تو بار ہا یہ خیال ذہن میں آتا کہ اس کے بعد کیا کریں گے؟ یا کیا ہوگا؟ اس دوران اسلامیہ انٹر کالج، گورکھپور کے ہندی کے استاذ جناب انصاری صاحب نے، جو میرے ہم وطن [کشی نگر] کے تھے، مجھے مشورہ دیا کہ میں بی یو ایم ایس [طب کی پڑھائی] کروں۔ ضمناً یہ بھی بتاتا چلوں کہ میں نے درجہ ۶ سے درجہ ۱۰ تک کی تعلیم اسلامیہ انٹر کالج، گورکھپور سے ہی حاصل کی تھی۔ اس دوران میری ملاقات جناب شاہد انصاری صاحب سے ہوئی جو طبّیہ کالج، قرول باغ میں بی۔ یو۔ ایم۔ ایس سال اول کے طالب علم تھے اور میرے محلّہ نرسنگھ پور کے نزدیک پپرا پور کے رہنے والے تھے۔ اُنہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اے اینڈ یو طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی میں داخلہ لے لوں۔ شاہد بھائی کے مشورے اور اللہ کے کرم سے میرا داخلہ ہوگیا اور مجھے جمیل ہاسٹل، جو حکیم اجمل خاں کے بیٹے کے نام سے منسوب ہے، مل گیا۔ جمیل صاحب تقسیم کے دوران پاکستان چلے گئے تھے۔ شروع میں میں شاہد بھائی کے ساتھ کمرہ نمبر ۱۱ میں رہا، بعد میں مجھے کمرہ نمبر ۳۲ الاٹ ہوگیا، جہاں میں تعلیم مکمل کرنے سے لے کر ہاؤس جاب مکمل کرنے تک رہا۔ بی یو ایم ایس سال اول میں ہی مجھے یہ پتہ چل گیا تھا کہ آخری سال میں معالجات بھی ایک مضمون ہے، جس کے استاذ حکیم فضل الرحمٰن شرؔر مصباحی صاحب اور حکیم مظہر سبحان عثمانی ہیں۔ معالجات کا نام بار بار سینئر ساتھیوں سے سن کر یہ تجسس ہوتا کہ آخر یہ کیسا مضمون ہے؟

اور اسی طرح وقت گزرتا گیا، میرے دل میں معالجات کے اساتذہ سے ملاقات کی خواہش بڑھتی گئی اور ایک دن یہ خواہش پوری ہو ہی گئی۔ میرے ایک سینئر ساتھی نے معالجات کے استاد حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب سے میری ملاقات کرائی۔ حکیم عثمانی صاحب کا تعلق مشرقی اتر پردیش کے ضلع گورکھپور کی تحصیل بانس گاؤں کے قصبہ صمد پور سے تھا۔ میرے عم مکرم محمد امین صاحب کے مکان محلّہ کھوکھا ٹولہ میں عثمانی صاحب کے ہم زلف رہا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے حکیم صاحب سے میری قربت ہوئی، حکیم صاحب کے زیادہ تر اعزاء سے بھی میری ملاقاتیں ہوتی رہتیں۔ میرے اندر اپنے ہر استاذ سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی خواہش رہی، اس میں ان کے پڑھانے کا طریقہ، طرزِ گفتگو، شاگردوں کے تئیں ان کا برتاؤ وغیرہ شامل ہے۔

استاذ محترم آج کے طب یونانی کے فارغین کی طرح اپنے نام سے پہلے ڈاکٹر لکھنا پسند نہیں کرتے تھے، اُنہوں نے تاحیات خود کو حکیم لکھا اور دوسروں نیز طلبہ کو بھی حکیم لکھنے کی طرف راغب کیا۔ وہ اپنے شاگردوں کے تئیں ایسی شفقت کا مظاہرہ کرتے تھے، جیسے کہ والدین کرتے ہیں۔ طبّیہ کالج قرول باغ کے طلبہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے پر مسرت موقع پر نماز کے بعد اساتذہ کرام سے کالج کیمپس میں عید ملنے اُن کی سرکاری رہائش گاہ پر جاتے اور عیدی کی فرمائش کرتے۔ اِس سلسلہ کا آغاز حکیم انوار احمد صاحب کے دولت کدہ سے ہوتا اور حکیم سید اشتیاق احمد صاحب، استاذ محترم عثمانی صاحب، حکیم عبد الجبار صاحب، حکیم سید محمد عاقل صاحب، حکیم مرزا صاحب اور حکیم محمد احمد لاری صاحب کے درِ دولت پر ختم ہوتا۔ حکیم سید اشتیاق احمد صاحب ایک سخت استاذ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، اس کے برعکس میڈم ڈاکٹر

☆ پرنسپل و میڈیکل سپرنٹنڈنٹ، اسٹیٹ تکمیل الطب کالج و اسپتال و انچارج ڈائرکٹر یونانی طبّی سروسز، حکومتِ اُتر پردیش، لکھنؤ

نزہت اشتیاق صاحبہ ایک نرم مزاج خاتون تھیں۔ طلبہ حکیم اشتیاق صاحب کے دولت کدہ پر شیرینی نوش کرنے کے بعد میڈم کو بھی عید کی مبارک باد دینے کی خواہش ظاہر کرتے جب میڈم آتیں تو طلبہ اُن سے عیدی کی فرمائش کرتے، میڈم سارے طلبہ کو ایک ایک روپیہ کے حساب سے عیدی دیتیں۔ اس کے بعد حکیم عثمانی صاحب کے گھر کا رُخ کرتے استاذ محترم پہلے شیرینی کا انتظام کرتے پھر جب اُن سے عیدی کی فرمائش ہوتی تو وہ بھی اپنے بچپن کے واقعات بیان فرماتے اور پھر عیدی پر تبادلۂ خیال ہوتا۔ ایک مرتبہ کی بات ہے اس وقت میں سال چہارم کا طالب علم تھا، کالج میں آخری سال کے تحریری امتحانات عید سے پہلے ہی ختم ہو گئے تھے، صرف زبانی اور عملی امتحان ہونا باقی تھے کہ عید آ گئی۔ حکیم صاحب کے گھر سوئیاں کھانے کے بعد جب استاذ محترم سے عیدی کی فرمائش کی گئی تو وہ گویا ہوئے کہ تم لوگ مجھ سے عیدی لو گے تو ابھی گھر میں نواسہ آیا ہوا ہے وہ تم لوگوں سے عیدی مانگنا شروع کر دے گا۔ اس کے بعد بھی ہم لوگ عیدی پر اصرار کرتے رہے۔ کچھ توقف کے بعد استاذِ محترم گویا ہوئے کہ تم لوگ یہ بتاؤ کہ کس کس کو عیدی روپئے کی شکل میں چاہئے اور کس کس کو امتحان میں اچھے نمبر کی شکل میں؟ یہ سنتے ہی طلبہ دو گروپ میں تقسیم ہو گئے، فائنل والوں کا کہنا تھا کہ ہم کو اچھے نمبر چاہئیں، چونکہ ہم لوگوں کا ابھی ایک سال باقی تھا، لہٰذا ہم لوگوں نے نقد عیدی کا مطالبہ کیا اور پھر ہم سب کو عیدی ملی۔ حکیم سید محمد عاقل صاحب عیدین کے موقع پر پھل اور مشروبات وغیرہ کا اہتمام کرتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ تم لوگ تمام اساتذہ کے ہاں سے شیرینی کھا کر آئے ہو، میرے یہاں پھل کھاؤ اور جوس پیو۔

استاذِ محترم حکیم عثمانی صاحب معالجات کے درس میں قدیم اور جدید دونوں نظریات بیان کرتے تھے اور مرض کے دونوں پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالتے۔ اُن کے مطب میں مریضوں کی قطار لگتی تھی اور طلبہ بھی اِس فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح اُنہیں او پی ڈی میں بیٹھنے کی جگہ مل جائے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی طب کے دلی اسکول میں استاذ تھے، جہاں علاج بالمرکبات رائج ہے، تاہم مفرد اور مرکب دونوں کے افادی پہلوؤں پر بھرپور روشنی ڈالتے تھے اور مفرد اور مرکب ادویہ پر مشتمل نسخہ جات لکھاتے، چونکہ وہ طب کے لکھنؤ اسکول کے پروردہ، تکمیلی تھے اور اُن کے اندر خاندانِ عزیزی کے اطباء کے اوصاف کوٹ کوٹ کر بھرہوئے تھے۔ اطباءِ جھوائی ٹولہ کو چونکہ مفردات پر کامل عبور حاصل ہوتا تھا اور عثمانی صاحب کو مفرد نسخوں کے علاوہ مرکب نسخوں پر بھی ملکہ حاصل تھا۔ اُن کی او پی ڈی پیر، بدھ اور جمعہ کو ہوتی تھی۔ اِن دنوں میں وہ مریضوں کے نسخے ہمیشہ اپنے شاگردوں سے ہی لکھواتے تھے، مریض کو دیکھنے کے بعد خود نسخہ بولا کرتے تھے، ایک شاگرد پرچے پر لکھتا تھا اور دیگر شاگرد اپنی کاپیوں، ڈائریوں میں نوٹ کرتے۔ مریض کے معائنہ کے بعد ایسا لگتا تھا کہ وہ زیادہ اجزاء پر مشتمل نسخہ تجویز فرمائیں گے، لیکن جب نسخہ اِملا کراتے تو بہت کم اور سستی دوائیں تجویز کرتے۔ اُن کی کوشش عموماً یہ ہوتی کہ مریض کو دوا اسپتال سے ہی ملے، بدرجۂ مجبوری باہر کی دوا لکھتے، وہ بھی سستی اور سہل الحصول۔ ہر مریض کو پوری توجہ سے دیکھتے، خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ وہ مریضوں کو ورزش کے طریقے بھی بتاتے تھے۔ مطب میں اگر کوئی مریض سخت آواز میں بات کرتا تو اُس سے بھی بڑی نرمی سے پیش آتے، طلبہ کو سمجھاتے کہ یہ Public dealing ہے، فرماتے کہ میں یہاں استاذ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک طبیب کی حیثیت میں ہوں۔ مریضوں کو گھریلو دواؤں پر مشتمل نسخے لکھا کرتے، ان نسخوں میں عام طور پر ہلدی، کالی مرچ، سونف، دھنیا، تیز پات، کھانے کا نمک، گیہوں کی بھوسی، امرود کے پتے، شہتوت کے پتے وغیرہ ہوتے، ایسے نسخہ جات کو آج Kitchen Medicine یا Garden Medicine کے نام سے جانا جاتا ہے۔

استاذ محترم کبھی کبھی آیورویدک کے وہ مرکبات بھی لکھا کرتے تھے، جن کے اجزاء ترکیبی میں یونانی مفرد دوائیں وافر مقدار میں شامل ہوں۔ اپنے مریض کی اقتصادی اور معاشی حالت کو مدنظر رکھ کر دوائیں تجویز فرماتے تھے اور ایسا اپنے گھر کے مطب میں بھی کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے مریضوں کو دوا کے استعمال میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ اگر کوئی مریض سفوف کو پسند نہیں کرتا تو اس کے لیے گولی یا ٹکیہ لکھتے، اگر جوشاندہ لینے میں دشواری ہوتی تو کوئی شربت اور اگر ذیابیطس شکری کا مریض ہوتا تو عرقیات پر ہی اکتفاء فرماتے، کچھ دواؤں کو کیپسول میں بھر کر بھی دیتے تھے۔ ان سب کا مقصد دوا کو اندرون بدن پہنچانا ہوتا۔ وہ تجویزِ نسخہ میں مریض کے مزاج کی رعایت کرتے تھے۔

استاذِ محترم کے نسخوں پر طب کے دبستان لکھنؤ اور دہلی کی چھاپ ہوتی تھی۔ اُن کے نسخوں کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ محض اگلوں کی صدائے بازگشت نہیں ہیں، ان سے ہمیں نئی سمتوں اور جہتوں کا پتہ چلتا ہے اور اسی وجہ سے دہلی میں اُن کی ایک شناخت تھی۔

استاذِ محترم کا مزاج Main Stream میں رہنے کا تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی تحریری، تقریری مقابلے جہاں کہیں ہو رہے ہوتے، اُن میں اپنے دوستوں کے ساتھ ضرور شریک ہوتے۔ طالب علمی کا دور ختم ہونے کے بعد بھی اُن کا مزاج ویسا ہی تھا۔ حکیم عبدالرزاق صاحب نے، جو طبّیہ کالج قرول باغ کے فارغ تھے اور مرکزی حکومت میں ڈپٹی ایڈوائزر [یونانی] کے ساتھ سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن کے ڈائرکٹر بھی تھے، ایک بار ٹیلی ویژن پروگرام کے تحت امراض اور اُن کا یونانی علاج کے عنوان پر متعدد اطباء سے بولنے اور اس پروگرام میں حصہ لینے کو کہا، مگر کوئی تیار نہیں ہوا اور آخر میں قرعۂ فال استاذِ محترم کے نام پر نکلا۔ وہ ٹی وی پروگرام میں شامل ہوئے اور تسلسل سے پروگرام دیتے رہے۔ اُن کے پاس پروگرام دیکھنے والوں کے بے شمار خطوط آتے، وہ سب کو فرداً فرداً جواب دیتے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک صاحب نے پروگرام دیکھنے کے دوران آپ کا نام تو نوٹ کر لیا مگر پتہ نوٹ نہ کر پائے، بعد میں وہ ٹیلی فون ڈائرکٹری سے اُن کا پتہ معلوم کر کے اُن کے پاس آ پہنچے، استاذِ محترم نے اُن کو دیکھا اور نسخہ تجویز کر دیا۔

میری انٹرن شپ کے دوران ایک مریضہ کا قصہ آج بھی میرے ذہن میں تازہ ہے، جو نفسیاتی مرض میں مبتلا تھی، پازیب پہن کے آتی تھی، استاذِ محترم اُسے اطمینان سے دیکھتے اور نسخہ لکھتے۔ وہ جب بھی آتی تو دور سے ہی پتہ چل جاتا کہ وہ آ رہی ہے اور ہم سر کو بتاتے کہ آپ کی خاص مریضہ آ رہی ہے اور سر صرف مسکرا دیتے۔

استاذِ محترم اتوار کو اپنے گھر پر مطب کرتے تھے، اتوار کو کبھی باہر نہیں جاتے تھے، حتیٰ کہ اپنے آبائی وطن بانس گاؤں بھی اگر کبھی جانا پڑتا تو ہر حال میں اتوار کی صبح تک دہلی ضرور آ جاتے۔ اپنی رہائش گاہ پر مریضوں سے دیکھنے کی فیس لیا کرتے تھے اور دوائیں بھی اپنے پاس سے دیا کرتے تھے۔ اگر کوئی طالب علم اپنے کسی عزیز کو دکھاتا تو وہ اس کے کہنے پر بھی فیس نہیں لیتے یا دوا باہر سے تجویز کرتے، یعنی حالات کے حساب سے۔ میں اور میرے ساتھی انٹرن شپ کے دوران اکثر سوچا کرتے تھے کہ استاذِ محترم ایسی دوائیں تجویز کریں گے، جو مہنگی ہوں گی لیکن مریضوں کو بہت ہی سستی دوائیں تجویز کرتے، جب کسی بھی مریض کے سببِ مرض کے بارے میں بات ہوتی تو کہتے کہ جس خلط کا مرض ہے، اُس کی رعایت سے نسخہ ترتیب دو۔ وہ معالجات کے عملی امتحان میں بحیثیت انٹرنل ایگزامنر اپنی موجودگی کو بہر حال یقینی بناتے، خواہ وہ دہلی سے باہر ہی کیوں نہ ہوں، اس وقت دہلی ضرور آ جاتے۔

میرا جب بھی استاذِ محترم کے گھر جانا ہوا، اُن کو طبِ جدید اور قدیم کی کتابوں کا مطالعہ کرتے پایا، وہ ہم لوگوں سے بھی یہی کہا کرتے تھے کہ طبِ قدیم کے ساتھ ساتھ تم لوگ طبِ جدید کا بھی مطالعہ کرو اور دونوں کا تقابلی جائزہ لو تا کہ تمہاری Knowledge Up date رہ سکے، یہ دہلی ہے یہاں ہر طرح کا مریض تمہارے پاس آئے گا، جس میں پڑھے لکھے لوگ، آفیسر کلاس اور غریب وغیرہ اور تمہیں سب کو مطمئن کرنا ہوگا۔

جب سنٹرل گورنمنٹ ہیلتھ اسکیم کے تحت میڈیکل آفیسر کی جگہیں نکلیں تو میں نے استاذِ محترم سے مشورہ کیا تو اُنہوں مجھے فارم بھرنے سے سختی سے روک دیا، اُن کا کہنا تھا کہ یہ اسپتال زیادہ تر بڑے شہروں میں ہیں، جہاں پر مطب کے کمرے چھوٹے اور رہائش کی پریشانی کا سامنا ہوگا، میں چاہوں گا کہ تم لوگ درس و تدریس کے کام میں لگ جاؤ، جہاں پورے کا پورا کیمپس تمہارا اپنا ہوگا، کالج اور اسپتال اور ہاسٹل وغیرہ۔ وہ اپنے فرزند ڈاکٹر دانش عثمانی کے بارے میں چاہتے تھے کہ وہ اپنا مطب کریں۔ وہ نوکری کے سخت خلاف تھے۔

ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد مجھے مزید تین ماہ کی توسیع مل گئی۔ ۷ ستمبر ۱۹۸۹ء کو میرا راجستھان یونانی میڈیکل کالج، جے پور میں بحیثیت لکچرار تقرر ہو گیا۔ اس طرح زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا، لکچرار شپ کے دوران ہی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اجمل خاں طبّیہ کالج میں ایم ڈی معالجات میں میرا سلیکشن ہو گیا اور مجھے ۱۹۸۹ء میں کالج سے تین سال کی تعلیمی چھٹی مل گئی۔ ۱۹۹۱ء میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں پھر واپس جے پور آ گیا۔

پروفیسر حکیم سید علی حیدر جعفری، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اجمل خاں طبّیہ کالج میں شعبۂ معالجات کے چیرمین تھے، تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں استاذِ محترم کے ہم جماعت تھے۔ وہ ایم ڈی [معالجات] تھیسس کے زبانی امتحان کے لیے استاذِ محترم کو ہی بلایا کرتے تھے، ایک مرتبہ استاذِ محترم نے مجھ سے کہا کہ تمہارے چیئرمین کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں اتوار کو دہلی میں اپنا مطب نہیں چھوڑ سکتا، پھر بھی وہ امتحان اتوار میں اس لیے رکھتے ہیں

کہ بات بھی رہ جائے اور میں علی گڑھ بھی نہ جاسکوں۔ استاذِ محترم کے اس خیال کا میں نے جعفری صاحب سے تذکرہ کیا تو اُنہوں نے اتوار کے علاوہ دیگر دنوں میں امتحان کرانا شروع کر دیے۔

علی گڑھ سے جے پور واپس آنے پر پتہ چلا کہ مجھے آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کا جوائنٹ سکریٹری بنا دیا گیا ہے۔ اس خبر سے مجھے کافی تشویش ہوئی کہ اس عہدے پر سینئر اطبّاء فائز ہوتے رہے ہیں، مجھے یہ ذمہ داری کس کی ایماء پر دی گئی؟ جب استاذِ محترم سے ملاقات ہوئی تب یہ عقدہ کھلا کہ اُنہوں نے ہی مجھے اور میرے سینئر ڈاکٹر محمد ادریس صاحب کو، جو قرول باغ طبّیہ کالج میں استاذ ہیں، مذکورہ عہدے کے لیے نامزد کرایا ہے۔ استاذِ محترم کا کہنا تھا کہ طبّی کانفرنس میں نئے اور نوجوان اطباء کو کام کرنے کا موقع ملنا چاہیے۔ استاذِ محترم سے آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی مجلسِ انتظامیہ کی میٹنگوں میں اکثر ملاقات ہوتی، وہاں وہ ہم جیسے خوردوں کو اپنی باتیں رکھنے کا پورا پورا موقع دیتے تھے۔

میرا جب کبھی دہلی جانا ہوتا تو استاذِ محترم کے مطب میں لازمی طور حاضری دیتا، اُن کا مطب قرول باغ میں ہی تھا۔ جب بھی مرض اور دوا کے بارے میں باتیں ہوتیں تو فرماتے مرض اور اس کے مدارج کے اعتبار سے الگ الگ دوائیں ہوتی ہیں، دوا کے ساتھ ساتھ زیادہ اہمیت مرض اور اس کے اسباب کی ہے۔ نسخہ کی تجویز میں اِس نکتہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

استاذِ محترم اپنے شاگردوں کی ترقی اور خوشحالی کی بارے میں ہمیشہ فکر مند رہا کرتے تھے، اُن کی ہر ممکن کوشش یہی ہوتی کہ ان کے شاگرد دن دونی، رات چوگنی ترقی کریں۔ ڈاکٹر لیاقت علی صاحب جو، جودھپور یونیورسٹی جودھپور میں ڈپٹی رجسٹرار تھے، بغرض علاج استاذِ محترم کے مطب میں آئے تو اُن سے اپنے شاگرد ڈاکٹر محمد عرفان کا، جو اس وقت زبیریہ طبّیہ کالج جودھپور کے پرنسپل تھے، تذکرہ کیا اور ڈاکٹر محمد عرفان کو اُن سے رابطے میں رہنے کو کہا۔ اسی طرح جب میں نے اسٹیٹ تکمیل الطب کالج، لکھنؤ میں ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو پرنسپل کا چارج سنبھالا تو اُنہوں نے اپنے ایک عزیز کو لکھنؤ میں فون کر کے کہا کہ آپ کا چھوٹا بھائی لکھنؤ میں پرنسپل ہو گیا ہے، آپ اس کا پورا خیال رکھیں، لکھنؤ اس کے لیے نئی جگہ ہے۔

استاذِ محترم تکمیل الطب کالج سے فارغ تھے، اُنہیں اپنی مادرِ درس گاہ سے بے پناہ لگاؤ تھا، وہ بارہا کہتے کہ دل چاہتا ہے کہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ آؤں اور اپنے دل کی کچھ باتیں کالج میں آ کر کہوں لیکن اپنی علالت کے باعث ہمت نہیں ہوتی۔ میری بھی دیرینہ آرزو تھی کہ استاذِ محترم ایک بار اپنی مادرِ درس گاہ کو ضرور دیکھ لیتے، مگر میں بھی اُن کی علالت کے مدنظر زیادہ اصرار نہ کرتا۔ استاذِ محترم کی دلی خواہش تھی کہ اُن کے آبائی وطن بانس گاؤں کے مکان میں نسواں کالج کھل جائے، اِس سلسلہ میں اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اپنے بھائی محمد ظفر امین عرف ڈکو سے بات کرو، اُن کے سیاسی رسوخ بھی ہیں، مگر اُن کی یہ خواہش پوری نہیں ہو سکی۔

تاریخ کا یہ دستور رہا ہے کہ اُس نے دنیا میں پیدا ہونے والے انسانوں کو یاد رکھا ہو یا نہ رکھا ہو، لیکن اُن کی خدمات کو برسوں یاد رکھا ہے۔ استاذِ محترم کی خدمات کو طبّی دنیا میں برسوں یاد رکھا جائے گا۔ اُن کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے اسٹیٹ تکمیل الطب کالج، لکھنؤ کے ۲۰۱۱ء میں ہونے والے سیمینار کی پروسیڈنگس کو اُن کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اتنا ہی نہیں کالج کے سیمنار میں، جو حکومتِ ہند کے تعاون سے ہوا تھا، میں کالج کے فارغین، اساتذہ اور طلباء کو میمنٹو دینے کے لیے جو نام تجویز کیے گئے، اُن میں استاذِ محترم کا اسم گرامی سرفہرست تھا۔ چونکہ استاذِ محترم اپنی علالت کے باعث سیمنار میں شرکت کرنے سے قاصر رہے، لہٰذا اُن کا میمنٹو اور شال اُن کے خاص شاگرد ڈاکٹر محمد عرفان صاحب، استاذ اسٹیٹ تکمیل الطب نے حاصل کیا اور دہلی جا کر اُنہیں پیش کیا، جسے لیتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئے اور اُنہیں اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آنے لگا تھا۔

مجھے استاذِ محترم کی رہنمائی، اُن کی شفقت اور دعاؤں سے زندگی کے زیادہ تر شعبوں میں کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملا، اُن کی نصیحت، اُن کے اندازِ فکر، اُن کی انفرادیت اور نامساعد حالات میں بھی استقامت کو آج بھی آزمایا جا سکتا ہے۔ اُن سے یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کا شعور ملا، یہی نہیں اپنے مخالف یا ہم مزاج نہ ہونے والے شخص سے بھی حسنِ سلوک اور اپنی جانب راغب کرنے کا سلیقہ ملا۔ استاذِ محترم کا کہنا تھا کہ پوری زندگی ایک طالب علم کی طرح گزارو، نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی ترغیب مجھے اُن ہی سے ملی۔ دعا ہے کہ اللہ رب العزت استاذِ محترم کو غریقِ رحمت کرے اور محض اپنے فضل و کرم سے جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل مرحمت فرمائے، آمین!!

●●●

استاذی محترم جناب حکیم مظہر سبحان عثمانی

☆حکیم شارق علی خاں

استاذی محترم آنجہانی حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب کا شمار ملک کے اُن چیدہ حکماء میں ہوتا ہے، جن کی سعی جمیل سے آزاد ہندوستان میں طب یونانی کی بقاء، تعلیم وتعلم اور اس کی اشاعت وترویج کو ایک نئی جہت ملی۔ مرحوم عثمانی صاحب قدیم کلاسیکی معلومات اور جدید اضافات کی ہم آہنگی کی ایک مثال تھے۔ طب یونانی کے دبستان لکھنؤ کے نقیب تھے، لیکن میدان عمل دلّی ہونے کی وجہ سے دلّی اور لکھنؤ کی فنّی معنویت کا آمیزہ تھے۔

خوش مزاج، خوش پوش تھے اور بذلہ سنجی میں بھی یکتا تھے۔ عام طور پر سفید پوشاک میں ملبوس نہایت نفاست پسند، دمکتا ہوا چہرہ، زیرلب مسکراہٹ اُن کی پہچان تھی۔ متانت، بردباری سے لبریز، بڑی باہمت شخصیت کے مالک تھے، اپنی زندگی میں بڑے نشیب وفراز سے گزرے، لیکن صبر واستقامت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیا۔ عام طور پر شستہ لکھنوی اردو بولتے تھے، لیکن دلّی کی خاص زبان، جس میں پنجابیت کا آمیزہ ہوتا ہے، اُن کو بولتے دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی۔

مرحوم ومغفور اطلاقی معالجات کے ماہر تھے۔ گو وہ کلاس میں معالجات کے درس کلاسیکی اعتبار سے دیتے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عملی معالجات کے پہلو اور نکات ضرور بیان کرتے جاتے، لہذا طلباء اُن کی کلاس میں خاص طور پر شامل ہوتے تھے اور بڑی دلجمعی سے اُن کا لکچر سنتے۔ کلاس میں بڑا سنجیدہ ماحول رہتا تھا، لیکن کبھی کبھی اس سنجیدگی کو وہ کسی خاص لطیفے سے توڑتے، جو اُن کی عملی معالجاتی زندگی پر مبنی ہوتا تھا اور عملی مطب سکھانے کا حصہ ہوتا تھا، ہم لوگ اس سے بڑے محظوظ ہوتے اور دفعتاً یہ سنجیدگی قہقہوں میں تبدیل ہوجاتی۔

میں زمانۂ طالب علمی کی یادوں کو پھر سے یکجا کررہا ہوں، یہ یاد کرنے کے لیے کہ میں حکیم صاحب سے پہلی مرتبہ کب اور کہاں ملا؟ مجھے یاد آرہے ہیں وہ دن، جب میں نے کالج میں داخلہ لیا۔ ملک سے ایمرجنسی کا دور ختم ہوچکا تھا، جنتا پارٹی کی نئی سرکار وجود میں آچکی تھی، اس کے اثرات ملک بھر میں زندگی کے ہر شعبے میں نظر آنے لگے تھے۔ ایک دن کالج میں بڑی خوشیاں منائی جارہی تھیں۔ میں نے اپنے سینئرس سے سنا کہ حکیم عثمانی صاحب نے پھر سے کالج جوائن کرلیا ہے۔ یہ خبر میرے لیے اس وجہ سے قابل توجہ تھی کہ میں اپنے سینئرس سے یہ سنتا آیا تھا کہ حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب، جو ایمرجنسی کی وجہ سے معتوب تھے، ایک نہایت لائق وفائق اور بلند پایہ طبیب ہیں، جن کی تعلیم سے ہم لوگ محروم ہیں، اگر وہ کالج جوائن کرلیں تو یہاں کے تعلیمی ماحول کو ایک نئی زندگی ملے گی۔

وقت گزرتا گیا اور کالج کا پہلا سال گزر گیا، یہ سال پری طب کلاس کا تھا، جس کی وجہ سے کالج کے اصل طبّی اسٹاف سے ہمارا سیدھا تعلق نہیں تھا، اگلے سال فرسٹ پروفیشنل بی یو ایم ایس میں تشریح اور منافع الاعضاء ہم لوگوں کو استاذِ شفیق پروفیسر سید اشتیاق احمد صاحب مرحوم ومغفور سے

☆ریسرچ آفیسر انچارج، ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ

پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، جو پڑھنے والے طلبہ کو خاص طور پر عزیز رکھتے تھے، لہٰذا اُن کا دستِ شفقت میرے سر تک پہنچا اور میں اُن کے دائرۂ طلبہ عزیز میں شامل ہوگیا۔ استاذی محترم حکیم سید اشتیاق احمد صاحب کے تلمیذ عزیز کی حیثیت سے اُن کے دیوان خانے میں اکثر و بیشتر حاضری ہونے لگی، اُن کے احسانات اور شخصیت کے تذکرے کے لیے ایک علیٰحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ ایک دن جب میں وہاں موجود تھا کہ محترم حکیم عثمانی صاحب وہاں تشریف لائے اور حکیم سید اشتیاق احمد صاحب کی جانب والی نشست پر تشریف فرما ہوئے، میں ادباً کھڑا رہا۔ مرحوم و مغفور حکیم سید اشتیاق احمد صاحب نے مجھے متعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے شاگرد ہیں، فرسٹ ایئر کے طالب علم ہیں۔ مرحوم حکیم عثمانی صاحب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ تشریف رکھیں، کھڑے کیوں ہیں؟ میں ایک طرف بیٹھ گیا اور اُن دو طبّی شخصیتوں کی گفتگو میں کھو گیا۔ یہ میری مرحوم و مغفور سے پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔ یہ ایک ملاقات، ملاقاتوں میں بدلتی گئی اور پھر کالج کے شب و روز کی جولانیاں، طلبہ کی توانائی کے مظہر و مظاہر نے اُن خوش نصیب لمحات میں اضافہ در اضافہ کیا، یہاں تک کہ میں استاذ محترم کے حلقۂ طلبہ عزیز میں شامل ہوگیا۔

حکیم عثمانی صاحب سینئر طلبہ کو معالجات کے اس حصہ کا درس دیتے تھے، جو نسبتاً مشکل تصور کیا جاتا ہے، اس میں امراضِ جگر، مرارہ، طحال، بانقراس، امراضِ معدہ و امعاء اور حمیات شامل ہیں۔ امراضِ عفونیہ پر اُن کے درس آج تک میرے ذہن پر ثبت ہیں، جو اُنہوں نے طب یونانی کے بنیادی نظریات کے پس منظر میں جدید عفونی نظریہ کی توضیحات کے ساتھ ہم کو عطا کیے تھے۔ امراضِ کلیہ و مثانہ کے ضمن میں بھی اُن کی معلومات یکتا تھی نیز اُن کا ایک لکچر جو مرضِ قولنج سے متعلق تھا اور مسلسل دو گھنٹہ کی مدت پر مبنی تھا، آج تک مجھے یاد ہے۔ اس کا معیار آج کے پوسٹ گریجویٹ درس سے بھی بہتر تھا۔ معالجات کا درس دیتے وقت ہر مرض کی ماہیت، اسباب و علامات، علامات فارقہ، مضمرات، اصول علاج اور معمولات مطب کا احاطہ کرتے تھے نیز ذاتی تجربات کو بھی فراخ دلی سے بیان کرتے تھے۔

ہمارے طالب علمی کے زمانہ میں آیورویدک پنچ کرما کے لیے کالج میں ایک تجویز لائی گئی تھی، حکیم صاحب مرحوم و مغفور نے اکابرین کالج کے ساتھ یونانی شعبہ میں اس کے مماثل ایک شعبہ کی تجویز پیش کی، جو معالجاتِ خصوصی کے نام سے تھی۔ یہی معالجات خصوصی آج کے دور میں علاج بالتدبیر کہلایا۔

۸۳-۱۹۸۲ء کی کالج میگزین کا میں مدیر مقرر کیا گیا اور حکیم صاحب ہمارے سرپرست مدیر تھے۔ اس سلسلہ میں بھی اُنہوں نے بہترین رہنمائی فرمائی اور میگزین کو عمدہ و معیاری بنانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ مضامین کے انتخاب میں اُنہوں نے معیار کا خیال رکھا اور اس پر بھی اُن کی نظر تھی کہ فلاں مضمون کہاں سے سرقہ یا کسی مضمون کا چربہ ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میرے ایک عزیز دوست نے ایک مضمون ملک کے ایک نامور حکیم کی کتاب کے 'مقدمہ' سے چربہ کر کے میگزین میں چھپنے کو دیا تھا۔ حکیم صاحب نے دیکھتے ہی اس کا حوالہ بتا کر اس کو مسترد کر دیا اور اس کو قطعاً چھاپنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ اس واقعہ سے میرے دوست مجھ سے ایک عرصہ تک ناراض رہے، لیکن اُن کا منصفانہ فیصلہ علمی دیانت داری کا ترجمان تھا، جس کے سامنے کوئی چوں و چرا نہ کر سکتا تھا۔

کلاس میں درس و تدریس کے علاوہ مطب میں حکیم صاحب نہایت پابندی کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے تھے، اُن کے ساتھ ان کے داہنی جانب ہاؤس فزیشین، بائیں جانب ڈمانسٹریٹر تشریف فرما ہوتے اور سامنے کی جانب چند انٹرن بیٹھتے تھے۔ مریض کا حال سننے کے بعد اس کا معائنہ بھی کرتے، جس میں نبض شناسی بھی شامل تھی اور نسخہ تجویز کرتے۔ عام طور پر نسخہ بولتے جاتے، کبھی ڈمانسٹریٹر اور کبھی ہاؤس فزیشین کو اشارہ کر کے تحریر کرنے کے لیے کہتے۔ نسخہ اکثر اوقات مفردات پر مبنی ہوتا تھا، لیکن ساتھ میں کچھ مرکب ادویات بھی تجویز فرماتے۔

نسخہ نویسی میں مفردات کی تجویز و ترتیب کی شد بد ہم نے استاذ محترم سے ہی سیکھی، نسخہ نویسی کی اصطلاحات سے بھی ہم لوگ اُنہی کے درس سے واقف ہوئے، اپنے نسخوں میں وہ ہمیشہ ان اصطلاحات کا استعمال کرتے مثلاً درصرہ بستہ، کوفتہ بیختہ آمیختہ، صاف نمودہ، حل کردہ، درآب جوشانیدہ، قدرے قدرے بلیسند وغیرہ وغیرہ۔

اپنے مجربات بڑی فراخدلی کے ساتھ اپنے طلباء تک پہنچاتے، تاکہ

طلباء، طبیب بن کر عوام الناس کی بہترین خدمت انجام دے سکیں۔ اُن کے چند مجربات جو مجھے یاد ہیں، اِس مضمون کے ذریعہ قارئین تک پہنچانا اپنا فرض اولین سمجھتا ہوں۔

میرے ایک عزیز دوست، جو ہم جماعت ہونے کے ساتھ میرے روم پارٹنر بھی تھے، زود حساسی التہاب انف والتہاب تجاویف انف [Allergic Rhinitis & Sinusitis] سے متاثر تھے۔ نہا کر جب کمرے میں آتے، چھینکوں کا ایک دورہ سا پڑتا تھا، پے در پے چھینکیں آتی تھیں، بڑی مشکل سے سکون ہوتا۔ استاذی محترم سے رجوع کیا گیا، اُنہوں نے مندرجہ ذیل نسخہ تجویز کیا:

۷ عدد کچے انار، ایک عدد دھتورہ کا پھل اور ۷ عدد فلفل سیاہ، سب کو پیس کر یکجا کر کے مونگ کے دانہ کے برابر حبوب تیار کرنے اور ایک گولی صبح اور ایک گولی شام دینے کی ہدایت کی گئی۔

ایک ہفتہ کے استعمال کے بعد سے افاقہ ہونا شروع ہو گیا اور کچھ عرصہ کی مداومت کے بعد یہ مرض جاتا رہا، الحمدللہ آج تک وہ ٹھیک ہیں۔

زحیر مزمن کے مریضوں میں سفوف تریاق زحیر کا استعمال کراتے نیز ہندوستانی دواخانہ کے تیار کردہ دو شربت نیکو اور سیکو اسپتال میں مہیا رہتے تھے، نیکو ورم معدہ وامعاء میں اور سیکو امراض صدر ریہ میں استعمال کراتے۔

ورم معدہ وامعاء مزمن میں ایک نسخہ مفردات پر مبنی تجویز کرتے:

زیرہ سفید، پودینہ خشک، قسط شیریں، مکوء خشک، بادیان، تمام دواؤں کا جوشاندہ حب رال دو عدد کے ساتھ صبح شام استعمال کراتے۔ اسی مرض میں جوارش عود ترش کا استعمال بھی کراتے تھے۔

ادرارِ حیض کے لیے مندرجہ ذیل نسخہ تجویز کرتے:

تخم کلونجی، تخم کرفس، ڈوڈہ کپاس، پوست خربزہ، مشکطرامشیع، تخم قرطم، پرسیاؤشاں۔ زحیر میں سفوف مقلیا ثا کا تذکرہ کرتے اور کہتے کہ اس مرکب سے میں اس مرض میں ہمیشہ اجتناب کرتا ہوں۔

کم سے کم دواؤں سے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنے میں اُنہیں ملکہ حاصل تھا، ہندوستانی دواخانے کی محدود رسد کے باوجود اپنا مطب کامیابی کے ساتھ چلاتے تھے، جب کہ اس زمانہ میں اُن کی او پی ڈی میں مریضوں کا زبردست مرجوعہ رہتا تھا کیونکہ وہ اس زمانہ میں دہلی کے معروف اور کامیاب ترین طبیب شمار کیے جاتے تھے۔ ان کے مریضوں میں غرباء ومساکین سے لے کر امراء اور بلند پایہ سیاست داں بھی ہوتے تھے جن میں متعدد وزراء بھی شامل تھے، کتنے آئی اے ایس، آئی پی ایس اور سکریٹری اُن سے مشورے کے لیے وقت کا تعین چاہتے تھے۔

نزلہ زکام اور کھانسی میں جب کوئی دوا موجود نہ ہوتی تو مریض کو یہ نسخہ تجویز فرماتے: برگ امرود، فلفل سیاہ، سبوس گندم کا جوشاندہ۔

اس نسخہ سے مریضوں کو خاطر خواہ فائدہ ہوتا نیز خشک کھانسی میں مغز بادام ۵ عدد کو توے پر بھون کر ۳ عدد فلفل سیاہ کے ساتھ چبا کر کھانے کو کہتے اور بغیر پانی پیے ہوئے سو جانے کی ہدایت کرتے۔ اس نسخہ سے بھی مریضوں میں فائدہ دیکھا گیا۔

ضیق النفس میں معجون راح المومنین اور نفسیاتی مریضوں میں معجون نجاح کا استعمال بکثرت کراتے، سفوف مؤلف بھی ایک پسندیدہ مرکب تھا، جس کو وہ مرض جریان میں استعمال کراتے۔

امراضِ جلد، خاص طور پر بثور لبنیہ کے مریضوں میں گندھک مصفٰی، آملہ خشک اور برگ بنج ہموزن حبوب بنا کر ۲-۲ عدد صبح شام استعمال کراتے، جس کے نہایت عمدہ نتائج دیکھنے کو ملتے۔

کثرتِ طمث کی مریضوں میں ریشۂ برگد اور گیرو سے بنی ہندوستانی دواخانہ کی 'حبوب شانتی' کا استعمال کراتے۔

مطب میں کبھی کبھی اُن کی بذلہ سنجی سے بھی واسطہ پڑتا تھا۔ باڑہ ہندوراؤ جو قرول باغ کے قریب ہے، وہاں سے کسی مدرسہ کے طلبہ ایک ٹولی کی شکل میں اپنی خاص وضع قطع کے ساتھ مطب میں جیسے ہی داخل ہوتے، چپکے سے ہم لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے! دیکھئے یہ جریانی پارٹی آ گئی اور واقعی وہ لوگ عام طور پر جریان کی شکایت ہی بتاتے تھے۔

میرے ایک ہم جماعت اور عزیز دوست بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حکیم صاحب نے ایک واقعہ اس طرح بیان کیا کہ حکیم صاحب کے ایک قریبی دوست کے عزیز دہلی کے ایک بڑے ہسپتال میں داخل تھے، شدید یرقان کا شکار تھے۔ بہت دنوں تک علاج کے باوجود بھی کوئی افاقہ نہ تھا، اُنہوں نے حکیم صاحب سے تذکرہ کیا۔ حکیم صاحب نے آبِ مروقین تجویز کیا، جو مریض کو بہ آسانی پانی کی طرح دیا جا سکتا تھا۔ اُنہوں نے اس کا التزام کیا اور دو چار روز میں ہی مریض میں خاطر خواہ تبدیلی دیکھنے کو ملی، ہسپتال کے ڈاکٹر بھی حیران تھے۔

اپنے معمولات میں دریدۂ افسنتین کا بھی بخوبی استعمال کراتے تھے۔ شقیقہ کے مریضوں میں اسطوخودوس، فلفل سیاہ اور کشنیز خشک ہموزن کا سفوف ۳-۳ گرام تجویز کرتے تھے اور مریض صحت یاب ہوتے تھے۔

حکیم صاحب ایک نہایت شفیق اور ہمدرد استاذ تھے ،جن کی شفقتیں تمام طلبہ کے لیے یکساں ہوتی تھیں۔ میں نے اُنہیں بہت کم کسی سے ناراض ہوتے ہوئے دیکھا، جب وہ کسی بات پر غصہ بھی کرتے یا کسی طالب علم کو ڈانٹتے ،تب بھی ایسا معلوم ہوتا گویا محبت سے سمجھا رہے ہیں۔ اپنی سیاسی عدیم الفرصتی کے باوجود بھی کلاس پابندی سے لیتے تھے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ استاذی محترم جناب حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب ایک عظیم المرتبت انسان، ایک حاذق طبیب ،جن کا شہرہ دور دور تک تھا، ایک لائق و فائق شفیق استاذ ،ایک بہترین منتظم تھے۔ اپنی بات ارباب حل و عقد تک پہنچانے اور اُن کو مطمئن کرنے میں اعلیٰ درجہ کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ایک استاذ کی حیثیت سے اُنہوں نے نہ جانے کتنے طلبہ کو معالجات کے اطلاقی نکات سے ہمکنار کرایا، جو بعد میں مختلف اداروں میں طبیب، استاد و محقق بن کر قوم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس دور میں نسخہ نویسی کا فن اپنے شاگردوں تک بلا تامل پہنچایا، جس کے سبب آج ہندوستان میں نہ جانے کتنے طبیب علاج بالمفردات کے ذریعہ امراض کا کامیاب علاج کر رہے ہیں ۔حکیم صاحب کا یہ احسان کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ اللہ رب العزت ان کی مغفرت فرمائے۔

●●●

غزل

پھولوں سے رسم وراہ کیے جا رہا ہوں میں
امرت سمجھ کے زہر پئے جارہا ہوں میں

اِک اُنس ہوگیا ہے غم عاشقی کے ساتھ
دانستہ اِک گناہ کیے جارہا ہوں میں

جس کی مجھے زمانے سے قیمت نہ مل سکی
وہ کائناتِ درد لیے جا رہا ہوں میں

مانا کہ زندگی مری ناکام ہے مگر
کوئی تو بات ہے کہ جئے جارہا ہوں میں

لاکھوں ستم اُدھر سے، اِدھر ایک خامشی
دنیا کو اِک پیام دئے جارہا ہوں میں

دیوانگی میں فرض شناسی نہیں گئی
دامانِ گل کے چاک سئے جا رہاہوں میں

مظہرؔ کسی کے چشمِ تغافل کے باوجود
اُمیدِ التفات کیے جارہاہوں میں

طب وادب کا مظہر — حکیم مظہر سبحان عثمانی

☆حکیم اشہر قدیر

نام : مظہر سبحان عثمانی

جائے ولادت اور سنِ ولادت: موضع صمد پور، ضلع گورکھپور، اتر پردیش۔ یکم جولائی ۱۹۳۸ء

جائے وفات اور سنِ وفات : نئی دہلی، ۱۵؍جنوری ۲۰۱۳ء

منصبِ کمال : پروفیسر اور صدر شعبہ معالجات کی حیثیت سے ۱۹۹۸ء میں آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی سے سبکدوش ہوئے۔

شخصیت:

طبّی حلقوں میں حکیم مظہر سبحان عثمانی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ طب یونانی کے تعلق سے موصوف طبیبِ دوراں تھے۔ ان کے مطب کو دیکھ کر طب یونانی کی اہمیت وافادیت پر ایمان لانا پڑتا تھا۔ نبض شناسی میں کمال حاصل تھا، اصولِ علاج اور طریقۂ علاج پر گہری نظر تھی۔ اسی لیے ان کے تجویز کردہ نسخے تیر بہ ہدف ہوتے تھے۔

معالجات ان کا مضمونِ خاص تھا، طب کے بنیادی اصول وضوابط اور اصطلاحات پر ملکہ رکھتے تھے۔ بحیثیت مدرس، ماہیئتِ مرض، اسباب وعلامات، تشخیصِ مرض اور تجویز پر ان کا ایک لیکچر سو کتابوں کے مواد پر بھاری ہوتا تھا۔

سانحۂ ارتحال:

حکیم صاحب اپنے دستِ مسیحائی سے بے شمار مریضوں کو جام شفاء پلانے کے بعد اپنے لیے کوئی مسیحا تلاش کرنے سے قاصر رہے اور وقت پیری نقصِ صحت سے دوچار رہنے کے بعد بالآخر ۱۵؍جنوری ۲۰۱۳ء کو آخری سانس لی۔

تعلیم وتربیت:

جناب مظہر کی ولادت یکم جولائی ۱۹۳۸ء کو موضع صمد پور، ضلع گورکھپور [یوپی] کے ایک متوسط زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ گھر کے علمی ماحول نے حصولِ علم کی طلب پیدا کردی۔ مختلف مدارس سے دینی اور لسانی علوم پر مشتمل تعلیم حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ کا رُخ کیا اور ۱۹۵۹ء میں مشہور طبّی درسگاہ تکمیل الطب کالج میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوئے۔ یہ وہ دور تھا کہ جب تکمیل الطب میں داخلہ آسان نہیں تھا، داخلہ کے لیے طلبہ کو سخت امتحان سے گزرنا پڑتا تھا، عربی وفارسی پر عبور لازمی شرائط میں سے تھا۔ عثمانی صاحب نے امتیازی کامیابی کے ساتھ پانچ سالہ ایف، ایم، بی، ایس ڈگری کورس کی تکمیل کی۔ عملی مطب اور نسخہ نویسی کی مشق نابغۂ روزگار طبیب شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین لکھنوی کے زیر تربیت حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ بقول آپ کے اپنے اساتذہ میں وہ حکیم شکیل احمد شمسی سے بے حد متاثر تھے اور انہی کے نقش قدم پر چل کر فن طبابت میں ایک مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

فرائضِ منصبی:

لکھنؤ سے طبّی تعلیم وتربیت کی تکمیل کے بعد ۱۹۶۴ء میں نقل مکانی کی اور طب کے دبستانِ اوّل دہلی کی گلی قاسم جان میں واقع طب کی تاریخی درسگاہ، جامعہ طبیہ میں بحیثیت لیکچرر اور انچارج دواخانہ تقرری پائی۔

☆ صدر شعبۂ کلّیات، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

بطور طبیب حاذق بہت جلد ان کا شہرہ ہو گیا اور ان کا مطب دارالشفاء کہلایا۔ پانچ سال تک جامعہ طبیّہ کے شفا خانے میں بحیثیت طبیب سکّہ جمانے کے بعد ۱۹۶۹ء میں ان کا تقرر حکیم اجمل خاں کے ذریعہ قائم شدہ دہلی کی مشہور طبّی درسگاہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیّہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی میں بطور انچارج دواخانہ ہو گیا۔ وہاں بھی ان کی صلاحیتیں رنگ لائیں اور بہت جلد سینیئر لیکچرر معالجات کے منصب پر فائز ہو گئے۔ ان کے تعلق سے خاص بات یہ بھی رہی کہ انہوں نے ذاتی مفادات کو مدنظر رکھ کر موقع اور محل کے اعتبار سے اپنے مضمونِ خاص معالجات سے کبھی کنارہ کشی نہیں کی اور بحیثیت طبیب اور مدرس اسی میدان میں نام کمایا۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ کلاس میں درس فرماتے تو طلبہ ہمہ تن گوش رہتے اور آنکھ کو جنبش نہ ہوتی۔ مطب میں بھی یہی حال ہوتا۔ دائیں بائیں شاگردوں کا جمگھٹ اور سامنے مریضوں کا ہجوم ایک عام بات ہوتی۔ نسخہ نویسی میں ان کو کمال تھا۔ ان کا نسخہ نقطہ کی حد تک حشو وزوائد سے پاک ہوتا تھا۔ غرض کہ کسی طالب علم کے لیے آپ کا شاگرد ہونا بھی باعث فخر بات ہوتی۔

طبّی قیادت:

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے مختلف پلیٹ فارم سے طبِ یونانی کی قیادت انتہائی بے باک انداز میں کی۔ اپنے لائقِ صد احترام استاذ حکیم شکیل احمد شمسی کی خواہش پر آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس سے منسلک ہوئے اور ۱۹۶۶ء میں اس کے نامزد ممبر قرار پائے۔ طبِ یونانی کے حق میں اس حد تک گئے کہ جب ایک میٹنگ میں طبِ یونانی کو جدید لب ولہجہ سے پڑھانے سے متعلق بحث ہو رہی تھی تو اپنے استاذِ محترم حکیم شکیل احمد شمسی سے بھی اتفاق رائے نہ کی اور طبّی طرزِ تعلیم میں تبدیلی لانے کی پُر زور وکالت کرتے رہے۔ شاگرد اور استاذ کے مابین تلخی پیدا ہو گئی یہاں تک کہ میٹنگ کے اختتام پر سلام وجواب تک کی نوبت نہ آئی۔ لیکن اسی دن شام کو جب شمسی صاحب دہلی سے لکھنؤ جانے کے لیے ریلوے اسٹیشن روانہ ہونے کو تھے کہ تبھی حسبِ سابق عثمانی صاحب اپنے استاذ کی خدمت میں رکشہ لے کر حاضر ہو گئے۔ استاد کا سامان اٹھایا اور لکھنؤ میل میں سوار ہونے تک ساتھ رہے۔

بقول مظہر صاحب:

> ''وقت رخصت شمسی صاحب آبدیدہ ہو کر مجھ سے لپٹ گئے اور فرمایا مجھے تم جیسے شاگردوں پر فخر ہے، جو اپنے ہر فرض کو بلا جھجک انجام دینے سے نہیں چوکتے۔''

حکیم عثمانی صاحب طبّی کانفرنس کے ہی قریب نہیں تھے، بلکہ صدر کانفرنس حکیم عبدالحمید قبلہ کے بھی قریبی تھے۔ فنّی مسائل کی عقدہ کشائی کے لیے صدر محترم، حکیم عثمانی صاحب سے اکثر رائے لیتے اور اس کو وزن بھی دیتے۔

طبّی کانفرنس کے علاوہ ہر طبّی تنظیم اور تحریک سے ان کا تعلق رہتا۔ جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ جس جگہ وہ نہ ہوتے وہاں کچھ کمی سمجھی جاتی۔ ان کی شرکت کامیابی کی ضمانت ہوتی، چنانچہ طبّی امور کی حامل سرکاری اور غیر سرکاری متعدد مجالس کے وہ رکن رہے اور جہاں بھی رہے طبِ یونانی کے پرچم کو بلند رکھا۔

حُسنِ کلام:

زبان و بیان کے دھنی تھے۔ عربی، فارسی اور اردو کے الفاظ کو برتنا جانتے تھے۔ آواز میں دم تھا۔ تاریخ طب کے باب ان پر وا تھے، اس لیے ان کا خطاب پُر اعتماد اور حوالہ کے ساتھ ہوتا، بالخصوص حکیم محمد اجمل خاں کے دور کی طبّی تاریخ پر غیر معمولی درک تھا۔

کوئی عام خطاب ہو یا خاص مذاکرہ، وہ جب بھی مخاطب ہوتے سامعین ہمہ تن گوش ہو کر سنتے تھے۔ کسی بھی محفل میں کچھ سوچ کر نہیں جاتے تھے، بلکہ موقع ومحل کے مطابق خطبہ تراشتے تھے۔ اردو محاوروں اور اشعار کا برمحل استعمال بخوبی فرماتے۔ تقریباً بارہ سال قبل دورانِ خطاب اصغر گونڈوی کا ایک شعر انہوں نے پڑھا تھا، جو مجھے آج تک یاد ہے۔

یہاں کوتاہیٔ دستِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

زورِ قلم:

طبّی اور غیر طبّی دونوں طرح کی نگارشات پر زورِ قلم صرف کیا، ان کے لکھے ہوئے مکتوبات بھی ادب کا حصّہ ہیں۔ ان کی تحریروں میں علم وادب کا امتزاج تعادل سے مشتق ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

اقتباس اوّل[1]

> ''بہار زمانۂ قدیم سے علم وحکمت کا مرکز رہا ہے۔ نہ صرف علم وحکمت بلکہ اصول جہاں بانی اور شانِ حکمرانی میں بھی اس نے دنیا کو نئی راہ دکھلائی ہے۔ چندر گپت موریہ اور اشوک اعظم جیسے فرمانرواؤں کا

تعلق اسی سرزمینِ ہند سے تھا۔ بین الاقوامی اہمیت کی حامل نالندہ یونیورسٹی بھی یہیں پر ہوا کرتی تھی۔ بہار کا قدیم نام 'ویہار' تھا جو کہ درس گاہ یا مدرسہ کا ہم معنیٰ لفظ ہے۔ طبقات ناصری میں ہے:

'ویہار بلغت ہندی اسم مدرسہ باشد' چونکہ زمانہ قدیم میں اس خطہ ہند میں ویہاروں یعنی درس گاہوں کا ایک وسیع و عریض جال پھیلا ہوا تھا اس لیے یہ علاقہ اس نام سے موسوم ہوا۔''

اقتباس دوم [۲]

''ذرا تصور کیجیے ۱۹۴۷ء کا وہ زمانہ جب تقسیمِ وطن کے نتیجہ میں دہلی آگ و خون کے دریا میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لوگ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جائے پناہ کی تلاش میں بھاگ رہے تھے۔ اس وقت حکیم عبدالحمید اپنے خوابوں کے ایک گلستانِ علم و حکمت کی تلاش و تعبیر میں تغلق آباد کی خاردار جھاڑیوں کی خاک چھان رہے تھے۔ یہ وہی سرزمینِ علم و حکمت ہے جہاں آج خوبصورت اور بلند عمارتوں کا شہر، جامعہ ہمدرد، دور جدید کے ایک نئے شاہ جہاں کی یاد دلا رہا ہے۔ استقامت و یقینِ محکم کی یہ ایک ایسی مثال ہے جو صدیوں تک تنازع للبقاء کے میدان میں مسلمانوں کے لیے مشعل راہ بنی رہے گی۔''

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے طب کے موضوع پر بھی ایک کتاب بعنوان 'ٹیپو سلطان کے معالجات اور تکنیکی تجربات' قلمبند فرمائی۔ جو ان کی طبِ اطلاقی سے غیر معمولی رغبت کی دلیل ہے۔

ادبی ذوق:

جب لب کشا ہوتے تو معلوم ہوتا کہ انہوں نے دبستانِ لکھنؤ سے محض تعلیم ہی حاصل نہیں کی بلکہ وہاں کی تہذیب کو بھی اپنی تربیت کا مبداء بنایا جس کا وافر اثر ان کے لب و لہجہ میں سما گیا۔ عام بول چال میں بھی ایک امتیاز حاصل تھا، ان کے منہ سے نکلنے والے کچھ جملے سماعت سے گزر کر ذہن میں محفوظ ہو جاتے۔ ایک بار آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے صدر دفتر واقع، لال کنواں، دہلی میں چند لوگوں کے درمیان تشریف فرما تھے۔ کسی نے ماضی کے تار چھیڑ دیے۔ اس وقت حکیم صاحب نے لکھنؤ میں گزرے وقت کو یاد کرتے ہوئے جو اندازِ بیان اختیار کیا وہ ادب کا شاہکار ہے، راقم کے حافظہ میں جو رہ گیا ملاحظہ ہو:

''تقسیم کے سانحہ نے سب کے دماغوں میں سودا بھر دیا تھا حتّٰی کہ اہل لکھنؤ نے بھی تہذیب کا دامن چھوڑ کر ایک دوسرے کا گریبان پکڑ لیا۔ رنجش اتنی تھی کہ پرند بھی شاخوں پر مل بیٹھ کر چہچہانے کے بجائے اپنے آشیانوں میں دبکے رہتے، صبح دبے پانو کب آتی اور کب چلی جاتی پتہ ہی نہ چلتا۔ حضرت گنج جیسا ضو بار علاقہ شام کو بھی کساد بازاری کا شکار رہتا۔ ہم نے ایسا لکھنؤ دیکھا ہے کہ ایک طرف سے خشت باری ہوتی تو دوسری طرف سے سنگ باری۔ اگر جسموں میں کچھ لہو بہنے سے رہ جاتا تو پولس کی ناطقہ بندی سے خشک ہو جاتا۔ ہم کیسے بچے بس خدا کی پناہ۔''

سخن طرازی:

حکیم صاحب کے تعلق سے یہ بات کم لوگوں کے علم میں ہوگی کہ وہ ایک کامیاب سخن ور بھی تھے، زخمیؔ تخلص فرماتے۔ وہ اسی طبّی درس گاہ تکمیل الطب کالج، لکھنؤ سے فارغ التحصیل تھے کہ جہاں سے مشہور شاعر مجروحؔ سلطان پوری نے طب کی سند حاصل کی تھی۔ مجروحؔ جب درد کو رفع کرنے میں ناکام رہے تو درد کو موضوع بنا کر سخن سازی کرنے لگے لیکن زخمیؔ کے دستِ شفاء کے آگے درد کی ایک نہ چلی اور زخمیؔ صاحب ایک حاذق طبیب بن کر اُبھرے اور ایک طبیب کی مصروفیت نے ان کو بزمِ سخن سے دور رکھا لیکن انہوں نے جو کہا خوب کہا۔ راقم السطور کو بہ نفسِ نفیس ان کا کلام سننے کا شرف حاصل ہے۔ ۱۴ر ستمبر ۲۰۱۲ء کو حکیم عبدالحمید مرحوم کے یومِ ولادت کے موقع پر غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر خالد صدیقی، سابق ڈائریکٹر جنرل سی۔ سی۔ آر۔ یو۔ ایم، کے اصرار پر حکیم مظہر سبحان عثمانی بھی بحیثیت زخمیؔ تشریف لائے اور بزم کی صدارت فرمائی۔ اس وقت ترنم سے جو غزل آپ نے پیش کی اس پر خالد محمود، شہپر رسول، متین امروہوی، تابش مہدی، ندیم ضیائی وغیرہ جیسے اربابِ سخن بھی 'مکرّر ارشاد' کی صدائیں بلند کرنے لگے۔ وہ غزل یہ ہے ؎

میرے نہ ہوئے مجھے اپنا نہ کیجیے — لیکن مذاق حسن کو رسوا نہ کیجیے
دیوانۂ حیات بناتی چلی گئی — ایسی نگاہ سے ہمیں دیکھا نہ کیجیے
دل تو یہ کہہ رہا ہے کہ اس سے گلہ کروں — غیرت یہ کہہ رہی ہے کہ شکوہ نہ کیجیے
ہے آج تیز دھوپ میں ہمّت کا امتحاں — اس وقت آپ زلف کا سایہ نہ کیجیے
زخمیؔ کے واسطے کوئی دست دعا بھی ہو — مرہم ہر ایک ہاتھ میں، ایسا نہ کیجیے

جیسا کہ عرض کیا اللہ تعالیٰ نے حکیم صاحب کو خدمتِ خلق کے لیے منتخب کر لیا، اس لیے آپ مشقِ سخن سے کافی حد تک گریزاں رہے۔ لیکن

شاعری ایسی شئے ہے کہ 'چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'۔ چنانچہ کبھی نہ کبھی کچھ کہہ ہی دیتے۔ حکیم عبدالحمید کی ذات بالا صفات سے متاثر ہوکر یہ قطعہ کہا:[۳]

الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے
سرخی بھی بدل جائے زمانہ بھی بدل جائے
باتوں سے نہ بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ
اپنے کو بدل لو تو زمانہ بھی بدل جائے

کیفِ طبع:

حکیم مظہر سبحان عثمانی خوش مزاجی کا پیکر تھے، جہاں ہوتے وہاں دو چار قہقہے ضرور لگتے۔ بر جستہ کلامی پر بھی قدرت تھی جو اکثر لطیفہ سنج ہوتی۔ ایک محفل میں سوال اٹھا کہ ڈاکٹر اور حکیم کے نبض دیکھنے میں کیا فرق ہے۔ ان کی جانب سے فوراً جواب آیا:

''ڈاکٹر نبض پر ہاتھ رکھتا ہے اور حکیم دکھتی رگ پر''۔

ایک مریض نے ان سے پوچھا۔ ''کیا دوا دودھ ہی سے لینا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

''جی دودھ پلانے کے لیے ہی یہ دوا دی جارہی ہے''۔

طبیب اور مریض کے درمیان رازداری پر بات ہورہی تھی۔ انہوں نے فرمایا:

''ہم اطبّاء سے زیادہ راز دار اور کون ہوگا، مریض گرتے بال کی شکایت لے کر آتا ہے اور سرعت انزال کی دوا لے جاتا ہے۔''

عثمانی صاحب ذیابیطس شکری کے شکار تھے۔ ایک دعوت میں کھانے کے بعد جب گلاب جامن پیش کی گئیں تو فرمایا:

''اسے کھانے سے جان پر آفت اور نہ کھانے سے ایمان پر آفت، کیونکہ ایمان یہ ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے۔''

عثمانی صاحب اور میں:

راقم السطور کی ان سے ملاقات اکثر رہتی۔ طبّی تقریبوں میں تو ملنا جلنا ہوتا ہی تھا، جب کبھی طبیّہ کالج، قرول باغ جانا ہوتا تو ان کی خدمت میں حاضری ضرور دیتا۔ ہر بار انتہائی شفقت سے پیش آتے۔ خیر و عافیت کے بعد میری مصروفیت کے بارے میں ضرور پوچھتے۔ ایک بار انہوں نے فرمایا ''میں آپ کے کام سے متاثر ہوں، کچھ نیا پن ہے''۔ یہ وہ سند ہے جو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ قرول باغ سے اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہوگئے تو گھر تو جانا نہیں ہوا، لیکن مجالس میں ملاقات ہوتی رہی۔

۲۰۱۲ء کے وسط میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر، نئی دہلی میں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی تھی، اہم معاملات پر اظہار خیال فرمانے کے لیے موصوف وہاں تشریف لائے تھے۔ راقم السطور بھی وہاں موجود تھا۔ اس وقت بھی ان کی طبیعت ناساز تھی۔ میٹنگ قدرے تاخیر سے شروع ہوئی، میں نے موقع غنیمت جان کر ان کا ایک انٹرویو کیا، اس مقالے میں درج بیشتر معلومات اسی انٹرویو پر مشتمل ہیں۔

آخری ملاقات:

۱۴ر ستمبر ۲۰۱۲ء کو مذکورہ محفلِ مشاعرہ میں ان سے آخری بار ملاقات ہوئی۔ جہاں انہوں نے یہ شعر بھی پڑھا۔

ٹوٹے گا کب نفس کا تسلسل خبر نہیں　　چلتی ہوئی ہوا کا بھروسہ نہ کیجیے

یہ غالباً آگہی کا شعر تھا، اُس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ شمعِ محفل ایک چراغ سحری ہے۔ آج حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب تو ہمارے درمیان نہیں، لیکن ان کی مثالی شخصیت قصۂ پارینہ سے مستثنیٰ رہے گی۔ اس شعر پر بات کو تمام کرتا ہوں۔

گر وہ نہیں ہیں روبرو تو ہم کو دیکھئے　　باقی ہے اُن کا عکس ہماری نگاہ میں

حواشی

۱- حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب سے براہِ راست گفتگو اور ملاقاتوں پر مبنی۔
۲- حکیم مظہر سبحان عثمانی، زبدۃ الحکماء حکیم محمد کبیر الدین، حکیم محمد کبیر الدین حیات اور کارنامے، ۱۹۹۵ء۔ ص ۱۳
۳- حکیم مظہر سبحان عثمانی، الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے، پیکر فکر و عمل: حکیم عبدالحمید، ۲۰۱۲ء۔ ص ۱۶۰
۳- ایضاً۔ ص ۱۶۲

کتابیات

۱- حکیم محمد کبیر الدین حیات اور کارنامے، مرتبہ مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی، وزارت صحت و خاندانی بہبود، حکومت ہند، نئی دہلی ۱۹۹۵ء
۲- پیکر فکر و عمل: حکیم عبدالحمید، مرتبہ۔ ڈاکٹر محمد خالد صدیقی، مطبع گریٹو انٹر پرائزز، جی ۳۰، سریتا وہار، نئی دہلی، ۱۰۱۲ء

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی طبّی نگارشات

☆حکیم محمد رضی الاسلام ندوی

حکیم مظہر سبحان عثمانی [۱۹۳۸- ۲۰۱۳ء] کو ایک معالج اور معلّم کی حیثیت سے شہرت حاصل رہی ہے۔انھوں نے لکھنؤ سے ایف ایم بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔ وہ حکیم شکیل احمد شمسی کے خاص تلامذہ میں سے رہے ہیں۔ انھوں نے جامعہ طبیہ دہلی، ہمدرد طبی کالج دہلی اور آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج نئی دہلی میں طویل عرصہ تک تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ہاسپٹل طبیہ کالج، نئی دہلی اور ہندوستانی دوا خانہ دہلی کے انچارج بھی رہے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے ذاتی طور بھی ہزاروں مریضوں کو اپنی طبی حذاقت سے فیض پہنچایا ہے۔

جس میدان میں حکیم عثمانی کو کسی قدر کم شہرت حاصل ہے وہ تصنیف وتالیف کا میدان ہے۔معلوم ہوا ہے کہ وہ جس زمانے میں لکھنؤ میں تھے، وہاں کے بعض رسائل میں پابندی سے لکھا کرتے تھے،لیکن وہ تحریریں راقمِ سطور کی دست رس میں نہیں ہیں۔ طب میں ان کا ایک کتابچہ اور چند مضامین راقم کو مل سکے ہیں۔ان کا تعارف ذیل میں کرایا جارہا ہے۔

۱- ٹیپو سلطان کے معالجات وتکنیکی تجربات:

یہ کتابچہ، جو ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے، مجلس تحقیقات طبّی دہلی سے دسمبر ۱۹۷۶ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ مجلس کے سلسلۂ مطبوعات کی پہلی علمی کاوش ہے۔کتابچہ کے آخر میں مجلس کے یہ اغراض ومقاصد بیان کیے گئے ہیں:

۱- طب یونانی کے کلاسیکی لٹریچر کی قدر و قیمت کو اجاگر کرنا۔

۲- قدیم وجدید مختلف فیہ طبی نظریات کے متعلق تحقیق وتطبیق کا کام انجام دینا۔

۳- قدیم منقولات کو عصری معقولات کی روشنی میں پیش کرنا۔

۴- طب یونانی کی فنی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے اسے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنانا۔

۵- تشخیص وعلاج کے میدان میں جدید انکشافات، رموزِ مطب اور مجربات کی اشاعت سے معالجین کی رہ نمائی کرنا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم مظہر عثمانی نے ذاتی طور پر یہ مجلس قائم کی تھی، جس کے تحت اس کتابچہ کی اشاعت ہوئی تھی۔ یہ تحقیق نہیں ہوسکی کہ اس مجلس سے کچھ اور کتابیں بھی شائع ہوسکی تھیں یا نہیں؟

کتابچہ کے حرفِ آغاز میں حکیم عثمانی نے لکھا ہے کہ انھوں نے یہ مضمون آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے سالانہ اجلاسِ بنگلور [جنوری ۱۹۷۳ء] میں پیش کرنے کے لیے لکھا تھا۔اس موقع پر انھیں میسور اور سرنگا پٹم بھی جانے اور آثارِ سلطانی کو دیکھنے کا موقع ملا تو ان کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہ مضمون اربابِ نظر کے مطالعہ سے گزرا تو انھوں نے غیر معمولی پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کا مشورہ دیا۔اس کی تعمیل میں اسے شائع کیا گیا ہے۔کتابچے کا انتساب حکیم عبدالحمید کی جانب کیا گیا ہے۔اس کا تعارف کویراج برہم دت شرما [سابق پرنسپل آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، نئی دہلی] نے اور پیش لفظ حکیم علی کوثر [کوثر چاند پوری] مؤلف

☆ سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

'اطبائے عہدِ مغلیہ' نے لکھا ہے ۔ ان حضرات نے موضوع کی اہمیت و انفرادیت بیان کی ہے، مؤلف کی خداداد صلاحیت و ذہانت، غیر معمولی قوتِ مطالعہ اور جدّتِ ذہن کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اور ان کی اس علمی تحقیق اور کاوش کو سراہا ہے۔

کتابچہ کا آغاز مؤلف نے سلاطینِ ہند کے علمی و طبی ذوق کے تذکرے سے کیا ہے۔ اس کے بعد اٹھارہویں صدی عیسوی کے ہندوستان کا نقشہ کھینچا ہے۔ پھر ٹیپو سلطان کی ولادت اور خاندان کی کچھ تفصیلات تاریخی حوالوں سے پیش کی ہیں، ٹیپو کے بارے میں ہندوستانی اور انگریز مؤرخین کے متعصّبانہ بیانات نقل کیے ہیں۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان کی مذہبی عقیدت اور علمی شغف کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ٹیپو سلطان کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''ٹیپو سلطان کی فرماں روائی ہندوستان کے بہت سے عظیم المرتبت بادشاہوں کی جاہ و حشمت اور وسعتِ مملکت کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، مگر اس کی شخصیت صرف ہندوستان، بلکہ ایشیا کے دورِ انحطاط کا بہت ہی دل آویز مرقع ہے۔ اس کی طباعی، جدّت پسندی اور تجسسِ علمی اسے دنیا کے ان معدودے چند صاحبِ نظر تاج داروں کے ہم سر و ہم پلہ قرار دیتی ہے جو تاریخ کے ہر دور میں خراجِ عقیدت لیتے رہیں گے۔'' [ص۱۵]

مؤلف نے سلطان کے علمی ذوق کی خاصی تفصیل فراہم کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ سلطان نے 'جامع العلوم' کے نام سے ایک یونی ورسٹی قائم کی تھی، جس میں تمام علومِ نافعہ کی تعلیم کا نظم تھا اور اس میں شعبۂ طب کو خاص اہمیت حاصل تھی، جس کے سربراہ اس عہد کے مشہور طبیب حکیم محمد بیگ تھے[ص۳۷]۔ اس یونی ورسٹی سے ملحق ایک معملِ کیمیاوی بھی تھا، جہاں من جملہ دیگر تحقیقی تجربات کے یونانی دوا سازی بھی کرائی جاتی تھی۔ اس یونی ورسٹی سے وابستہ ایک بیش قیمت کتب خانہ بھی تھا۔ اس کے علاوہ سلطان کا ایک ذاتی کتب خانہ بھی تھا، جس کے قلمی نوادرات میں مذہبی کتابوں کے بعد سب سے زیادہ ذخیرہ کتبِ طبیہ کا تھا[ص۳۸]۔ سلطان کے علمی ذوق کے ثبوت کے طور پر مؤلف نے اس کے کچھ خطوط نقل کیے ہیں اور سلطان کے کتب خانے کی ماہیت، کتابوں کی تعداد اور ان کے موضوعات، کتابوں کی دیکھ بھال اور تنظیم و ترتیب کے بارے میں انگریز اور ہندوستانی مؤرخین کے اقتباسات نقل کیے ہیں۔[ص۲۹-۳۴] حکیم عثمانی نے لکھا ہے کہ سلطان کی تصنیف کردہ کتاب 'فتح المجاہدین' کا ضمیمہ خاص طور پر لائقِ توجہ ہے، جس میں سگِ دیوانہ، سانپ، بچھو وغیرہ زہریلے جانوروں کے کاٹ کھانے کا علاج بیان کیا گیا ہے۔[ص۳۴] انھوں نے سلطان کے بیان کردہ کچھ نسخے بھی تحریر کیے ہیں جو سمیات اور دیگر امراض میں کام آتے ہیں۔[ص۳۴-۴۳]

مؤلف نے ٹیپو سلطان کے علمی شغف کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے دل میں بچپن ہی سے تحقیق اور علمی جستجو کا جذبہ موج زن تھا۔ اس کے اس غیر معمولی علمی انہماک کو دیکھتے ہوئے اس کے باپ نواب حیدر علی کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں اس کا جانشین سپاہیانہ جوہر سے محروم نہ ہو جائے۔[ص۴۵] سائنسی ریسرچ کی لگن اور ایجاد و اختراع کے جذبے کا اظہار اس کے متعدد خطوط سے ہوتا ہے، جن کے اقتباسات مؤلف نے نقل کیے ہیں۔[ص۴۶-۵۰]

ٹیپو سلطان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے حکیم عثمانی نے لکھا ہے:

> ''ٹیپو سلطان کی فکری بالیدگی اور ذہنی ارتقاء کا یہ ایک بہت ہی دل کش پہلو ہے کہ وہ ایک طرف جدید ترقیات اور سائنسی انکشافات سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا تو دوسری طرف اپنی کلاسیکی میراث پر جان بھی نچھاور کرتا تھا۔ دراصل وہ جدید سائنسی طرزِ فکر کو سامنے رکھ کر اپنے قومی طریقۂ علاج کے اصول اور اساس کو باقی رکھتے ہوئے اس کی نشأۃ ثانیہ چاہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر وہ مقیاس الحرارت کی تکنیکی معلومات چاہتا ہے یا اپنی ریسرچ لیبارٹری کے لیے فرانس سے ماہر طبیب اور فارماکولوجسٹ حاصل کرنا چاہتا ہے تو سختی سے یہ حکم بھی دیتا ہے کہ اس کے ملک میں صرف دیسی ادویات استعمال کی جائیں۔'' [ص۵۲]

مؤلف نے کتابچہ کے آخر میں سلطان کا ایک خط نقل کیا ہے جسے اس نے خوجہ اعتمادی کے نام لکھا تھا: ''تمھاری مرسلہ ادویات میں چند ایسے عطریات کے نام مندرج پائے گئے جو یورپین ممالک کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا حکیم محمد بیگ سے مشورہ کر کے تم ان کے بجائے یونانی ادویات تجویز کرو۔'' اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حکیم عثمانی نے اپنے کتابچے کو ان الفاظ پر ختم کیا ہے:

> ''سلطان ٹیپو کی یہ تحریر حرزِ جان بنائے جانے کے قابل ہے اور اس

کے اس جذبۂ مقدّس کا ایک نمایاں عکس ہے جو اپنے ملک کے علوم و فنون اور خاکِ وطن کی پنہاں دولتوں کے متعلق اس کے دل میں موج زن تھا۔ ٹیپو کی مذکورہ بالا تحریر کو اس کی فنی عصبیت پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ مغربی نہجِ تحقیق اور جدید طرزِ استدلال کے تئیں ٹیپو کی غیر معمولی دل چسپی سے جو کچھ ہمارے سامنے آیا ہے اس سے علم و سائنس کی بابت اس کی کشادہ قلبی پوری طرح عیاں ہے۔ دراصل ٹیپو، جو خود بھی معالجانہ ذوق رکھتا تھا، ہندوستان میں طب یونانی کا فروغ چاہتا تھا۔ اس حیثیت سے ٹیپو ہماری قومی اور طبی تاریخ کا ایک نہایت ہی زریں اور تابناک نام ہے، جس کے کارنامے ہمیں اپنی گزشتہ علمی عظمت کی یاد دلاتے رہیں گے۔'' [ص۵۹-۶۰]

خلاصہ کہ یہ کتابچہ حکیم عثمانی کے تحقیقی ذوق اور مزاج کا مظہر ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی کتابیات آٹھ[۸] فارسی، تیئیس[۲۳] اردو اور تیرہ[۱۳] انگریزی کتابوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ حکیم اجمل خاں کا قومی تصور اور انقلابی کردار:

یہ مضمون آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کے سالانہ میگزین ۹۲-۱۹۹۱ میں شائع ہوا ہے۔ اس میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کی شخصیت اور خدمات کے بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کے آغاز میں حکیم عثمانی نے حکیم اجمل کی ہمہ جہت شخصیت کا بہت عمدہ انداز میں تعارف کرایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''حکیم اجمل خاں کی زندگی کے مختلف باب ہیں اور ہر باب میں ان کی عظمت اور انفرادیت کے بے شمار آثار ہیں۔ وہ ہندوستان کے طبیب اعظم تھے، حاذق معالج اور قادر الکلام شاعر تھے، سحرِ بیان خطیب تھے، جنگ آزادی کے صفِ اول کے رہ نما تھے، انڈین نیشنل کانگریس کے صدر اور ہندو مسلم اتحاد کے داعی اعظم تھے، راجوں مہاراجوں کے معتمد اور محترم لارڈوں اور نوجوانوں کے رفیق و پہلو نشین تھے اور غریبوں و بے کسوں کے محبوب و مشفق تھے۔ سرکارِ انگریزی نے انھیں حاذق الملک کا خطاب دیا۔ قوم نے مسیح الملک کہہ کر اس اعزاز کو ان کے نام کا جزء لازم بنا دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے انھیں بے تاج بادشاہ کہا، دیش پتا گاندھی جی نے 'خاموشی کا دیوتا' کہہ کر پکارا، لارڈ ہارڈنگ انھیں 'میگنٹ آف انڈیا' کہا کرتے تھے، ریونیڈ اینڈ روز کو ان کی زندگی کی تمثیل انجیل مقدس میں نظر آئی۔ وہ کیا تھے اور کیا نہ تھے۔ لفظوں کی صناعی اور حرفوں کی مینا کاری سے ان کی شخصیت کا ایسا خاکہ کھینچنا، جیسا کہ حق ہے، از بس کہ مشکل ہے۔'' [ص۱]

آگے فاضل مضمون نگار نے حکیم صاحب کے انقلابی کردار کی جھلکیاں دکھائی ہیں اور ان کی خدمات کے مختلف پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے امتیازات کو نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''مسیح الملک اجمل خاں اگرچہ ایک روایتی طرز کے انسان تھے، مگر ان کا ذہن انقلابی تھا۔ وہ اطباء کے ذہن میں، جہاں نہ کوئی روزن تھا نہ دروازہ، جو ایک گنبدِ بے در بنا ہوا تھا، نئی فضا اور نئی ہوا کی تازگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ معلومات کو سمیٹ کر نتائج اخذ کرنا اور تلاش و تحقیق سے ذہن کو منوّر کرنا ان کا علمی موقف تھا۔ طبیہ کالج کی درسیات میں مفید اضافات ہوں یا اس کے شعبۂ ریسرچ کے مقاصد، مجلس تحقیقات طبی کی غرض و غایت ہو یا نصابی اصلاحات کی مساعی ہوں یا یونانی دوا سازی کی صنعت کو سائنٹفک راہ پر لانے کے لیے ہندوستانی دواخانہ کی تشکیل، ہر جگہ ان کا نقطۂ نظر انقلابی نظر آئے گا۔'' [ص۱]

اس مضمون میں حکیم عثمانی نے تفصیل سے حکیم اجمل کے تصورِ قومیت سے بحث کی ہے۔ ان کے بہ قول 'اجمل اعظم کی زندگی کا سب سے روشن پہلو ان کا قومی تصور ہے۔' ثبوت کے طور پر انھوں نے حکیم اجمل کے اقوال وارشادات، طبی اور غیر طبی اجلاسوں میں ان کے خطبات، روزنامچوں میں درج تاثرات، ان کے رفقاء کے بیانات اور سوانح نگاروں کے تبصروں کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حکیم صاحب متحدہ قومیت کے زبردست داعی تھے۔ یہ ان کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس وقت جب کہ قومی یک جہتی اور نیشنل انٹگریشن کا نعرہ ہماری سیاسی ڈکشنری میں اپنی جگہ بھی نہ پا سکا تھا، حکیموں اور ویدوں کے رشتۂ فنی اور اخوت باہمی کے منجمد سرچشمے کو متحدہ قومیت کے جوئے رواں میں تبدیل کر دینا مسیح الملک کا وہ کارنامہ ہے جسے ملک بھلانا بھی چاہے تو تاریخ بھولنے نہ دے گی۔'' [ص۲]

حکیم اجمل نے اپنے تصورِ قومیت کو عملی جامہ پہناتے ہوئے طبیہ کالج میں یونانی اور ویدک دونوں کی تعلیم کا نظم کیا، اس لیے کہ وہ دونوں میں فرق کرنے کے روادار نہ تھے۔ وہ ویدوں اور طبیبوں کو یک جا کر کے قومی

اتحاد کی تاب ناک مثال قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے حکیم عثمانی نے لکھا ہے:

''طبیہ کالج میں یونانی اور ویدک طبوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دے کر حکیم اجمل خاں نے فنی رواداری اور طبی یک جہتی کے ساتھ قومی تاریخ میں وسعت ظرفی اور کشادہ دلی کی ایک نا قابل فراموش روایت قائم کی ہے۔ حکیم صاحب طب یونانی اور ویدک کو ایک ہی ماخذ کی دو شقیں سمجھتے تھے۔ ویدوں اور طبیبوں کے اتحاد کو وہ 'مدافعتی اتحاد' کے بجائے قومی اتحاد بنانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ اتحاد محض برائے حصول مقصد نہ تھا، بلکہ فی نفسہ مقصود بالذات تھا، جسے انھوں نے اپنے دل کی آواز اور انسانی عقیدہ سمجھ کر اختیار فرمایا تھا۔''[ص۳]

قومی اتحاد میں صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو شامل کرنا حکیم اجمل کے پیش نظر نہ تھا، بلکہ ملک کے تمام طبقات اور گروہوں کو وہ اس میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ زبان، علاقائیت، مذہب اور کلچر کے اختلافات ان کے نزدیک چنداں اہمیت نہ رکھتے تھے۔ ان چیزوں کو وہ قومی ترقی میں مانع سمجھتے تھے۔ اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے حکیم عثمانی لکھتے ہیں:

''حکیم صاحب کے نزدیک ہندوستانیوں کے اتحاد کا مفہوم صرف ہندو مسلم اتحاد نہیں، بلکہ قوم کی تمام اکائیوں کا اتحاد تھا۔ زبان کے اختلافات ہوں، صوبوں کے جھگڑے ہوں یا شمال و جنوب کی کشیدگی، غرض یہ کہ ہر طرح کے اختلاف و انتشار کو وہ قومی ترقی میں مانع سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپس میں ہندو ہندو کے فساد اور مسلمان مسلمان کے جھگڑے کو بھی وہ ہندوستان کے قومی ارتقاء کے خلاف سمجھتے تھے۔''[ص۶]

یہ مضمون، جو سالانہ میگزین، آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ کے دس [۱۰] صفحات پر مشتمل ہے، حکیم اجمل خاں کے شخصیت کے اہم گوشوں پر قیمتی معلومات فراہم کرتا ہے۔

۳۔ حنینِ ہندی زبدۃ الحکماء علامہ حکیم محمد کبیر الدین:

یہ مضمون مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی [CCRUM] کی جانب سے شائع کردہ کتاب 'حکیم محمد کبیر الدین۔ حیات اور کارنامے' میں شامل ہے۔ اس مجموعے میں معروف حکماء اور طبی مصنفین کے چودہ مضامین اور حکیم کبیر الدین کی ایک درجن نادر تحریریں ہیں۔ حکیم عثمانی نے اپنے مضمون میں، جو بڑی تقطیع کی کتاب کے پانچ صفحات پر مشتمل ہے، حکیم کبیر الدین کی علمی خدمات اور خاص طور پر ان کے تراجم کا تعارف کرایا ہے۔

ابتداء میں انھوں نے صوبۂ بہار، جو حکیم صاحب کا وطن تھا، کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈالتے ہوئے، ان کی ولادت، ابتدائی تعلیم، طبی تعلیم، تدریسی خدمات اور وفات وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ ان کی وسعتِ علم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''قدیم و جدید نظریاتِ طب کے تعلق سے علامہ کا تقابلی مطالعہ بہت ہی وسیع و عمیق تھا۔ عربی، فارسی اور اردو لسانیات پر ان کو قدرتِ کاملہ حاصل تھی، لاطینی زبان بھی جانتے تھے۔ انگریزی زبان و ادب پر بھی ان کو عبور حاصل تھا۔''[ص۱۴]

بعض حضرات نے حکیم کبیر الدین کی علمی خدمات کو کم تر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ابھی تک علامہ کی طبی خدمات کی اہمیت کا کما حقہ جائزہ نہیں لیا گیا۔ بعض لوگ یہ کہہ کر کہ وہ چند یونانی کتب کے مترجم تھے، ان کے علمی قد کو چھوٹا کرنے کی مکروہ کوششیں کرتے نظر آئیں گے، مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر علامہ کی تخلیقی کاوشوں کو حذف کر دیا جائے تو یونانی طب کا اردو سرمایۂ ادب تہی دامن ہو جائے گا۔ کلیات، تشریح، منافع الاعضاء، علم الادویہ، صیدلہ، علم الکلیس، مرکبات، معالجات، جراحیات، علم الجراثیم، لغاتِ طب، کون سا موضوع ہے جو علامہ کے رشحاتِ قلم کا شرمندۂ تالیف نہیں ہے۔''[ص۱۴]

طبی ترجمہ نگاری کے میدان میں حکیم کبیر الدین کی خدمات کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علامہ نے یونانی طب کی قدیم کتابوں کا صرف ترجمہ ہی نہیں کیا ہے، بلکہ اس پر اپنی جودتِ فکر کی گہری چھاپ بھی چھوڑی ہے۔ بلاشبہہ انھوں نے برصغیر ہند کے طبی کارواں کی علمی قیادت کی ہے۔ علامہ کی بعض تخلیقی کاوشیں نہ صرف طبع زاد ہیں، بلکہ ہندوستان کے طبی سرمایۂ ادب کی آبرو کہے جانے کی مستحق ہیں۔ کتاب الاخلاط، کلیاتِ ادویہ، افادۂ کبیر، ارمغان جیسی کتابیں اسی فہرست میں شامل ہیں۔''[ص۱۵]

حکیم کبیر الدین حکیم محمد اجمل خاں کے شاگردِ خاص تھے۔ حکیم اجمل ہی نے انھیں طبی تالیف اور ترجمہ کی جانب مائل کیا تھا۔ حکیم عثمانی نے اس

پہلو پر بھی تفصیل سے لکھا ہے اور حکیم کبیر الدین کی تصنیف 'کتاب الادویہ' کے دیباچہ سے طویل اقتباسات نقل کیے ہیں۔اس سلسلے میں انھوں نے حکیم اجمل اور ان کے رفقاء کے قائم کردہ 'مجلسِ تحقیقات' کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مسیح الملک کے ان رفقاءِ کار میں ایک نام علامہ حکیم محمد کبیر الدین کا بھی تھا۔ مسیح الملک کے سانحۂ انتقال کے بعد مجلسِ تحقیقات کا شیرازہ بکھر گیا، مگر منشأ استاد کی تکمیل کی تڑپ نے علامہ کو خود اپنی ذات میں ایک 'مجلس' بنا دیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری چند برسوں کو چھوڑ کر، جن میں کہ ضعف وعلالت نے انھیں صاحبِ فراش بنا دیا تھا، تمام زندگی مسیح الملک کے مشن پر گام زن رہے۔''[ص۱۶]

مضمون کا خاتمہ حکیم عثمانی نے حکیم کبیر الدین کی سادہ اور بے ریا زندگی کے تذکرہ پر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''وہ اپنی ذاتی زندگی میں سادہ صفت انسان تھے۔ نمود ونمائش سے بہت دور رہتے تھے۔ جب بھی مجھے ان کے دولت کدہ پر حاضری کا موقع ملا، ان کو کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول پایا۔ تلامذہ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ بہت سے نادار اور غریب طلبہ کی خفیہ طور پر مالی مدد بھی کرتے تھے۔''[ص۱۷]

۴- الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے [حکیم عبدالحمیدؒ]:

یہ مضمون حکیم عبدالحمید کی حیات وخدمات کے تعارف کے لیے لکھا گیا تھا۔ یہ حکیم محمد خالد صدیقی سابق ڈائرکٹر جنرل مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی [CCRUM] نئی دہلی کے مرتب کردہ مجموعۂ مضامین بہ عنوان 'پیکرِ فکر وعمل: حکیم عبدالحمید' میں شامل ہے۔ اس مجموعے میں تیس [۳۰] سے زائد مضامین ان معروف اصحابِ قلم کے شامل ہیں جو حکیم صاحب کے کاروانِ علم وفن میں شامل، ان کی جولانیوں کے مشاہد اور ان کی فکر وعمل سے متاثر رہے ہیں۔ حکیم عثمانی نے اپنے مضمون میں حکیم عبدالحمید کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ان کے بارے میں اپنے کچھ تاثرات بھی لکھے ہیں اور ان کے ساتھ بیتے کچھ واقعات کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ مضمون صرف چار صفحات پر مشتمل ہے۔

مضمون کی ابتدا حکیم عثمانی نے ان الفاظ سے کی ہے:

''اولو العزمی، منصوبہ بندی، خود اعتمادی، وضع داری، تحقیق وعلم پروری، طمانیت قلب و خدمتِ خلق جیسی صفاتِ عالیہ کے حسن امتزاج کا نام حکیم عبدالحمید ہے۔ نوّر اللہ مرقدہ۔ لفظوں کی مینا کاری اور حرفوں کی صنّاعی سے اس شخصیت کی معنویت کا ایسا خاکہ کھینچنا جیسا کہ حق ہے، ایک مشکل کام ہے۔''[ص۱۵۹]

آگے مختلف علوم وفنون میں ان کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے طبّی تعلیم کے میدان میں انجام دی جانے والی خدمتِ جلیلہ [جامعہ ہمدرد] کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:

''ذرا تصور کیجیے، ۱۹۴۷ء کا وہ زمانہ جب تقسیمِ وطن کے نتیجے میں دہلی آگ وخون کے دریا میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لوگ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جائے پناہ کی تلاش میں بھاگ رہے تھے۔ اس وقت حکیم عبدالحمید اپنے خوابوں کے ایک گلستانِ علم وحکمت کی تلاشِ تعبیر میں تغلق آباد کی خاردار جھاڑیوں کی خاک چھان رہے تھے۔ یہ وہی سرزمینِ علم وحکمت ہے جہاں آج خوب صورت اور بلند عمارتوں کا شہر [جامعہ ہمدرد] دورِ جدید کے ایک نئے شاہ جہاں کی یاد دلا رہا ہے۔ استقامت اور یقینِ محکم کی یہ ایک ایسی مثال ہے جو صدیوں تک تنازع للبقاء کے میدان میں مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ بنی رہے گی۔''[ص۱۶۰]

حکیم عبدالحمید کی زندگی کے مختلف مراحل پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی سادگی اور درویشی کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

''وہ اپنے وقت کے طبیبِ اعظم تھے۔ باوجود اس کے کہ ان کو ہر طرح کے آرام وتعیش کے وسائل حاصل تھے، مگر انھوں نے عافیت پسندی سے اپنے آپ کو بہت دور رکھا۔ موسم گرما میں وہ زمین پر چٹائی بچھا کر سوتے تھے اور سردیوں کے موسم میں بستر کے طور پر ہلکی توشک کا استعمال کرتے تھے۔ شدت کی سردیوں میں بھی وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کیا کرتے تھے۔ زیادہ تر وہ اپنے کپڑے خود دھوتے تھے۔ اپنے جوتوں پر خود پالش کرتے تھے۔ زندگی انتہائی سادہ تھی اور غذا بھی بہت سادہ استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کی زندگی ایک درویش اور بوریا نشین جیسے شخص کی تھی۔''[ص۱۶۰-۱۶۱]

حکیم عثمانی نے حکیم عبدالحمید کے بارے میں اپنے بعض مشاہدات بھی لکھے ہیں۔ انھیں یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں ہے۔ حکیم عثمانی شاعر بھی تھے۔ مضمون کا خاتمہ انھوں نے حکیم صاحب کے بارے میں اس قطعہ پر کیا ہے:

الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے
سرخی بھی بدل جائے، فسانہ بھی بدل جائے
باتوں سے نہ بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ
اپنے کو بدل لو تو زمانہ بھی بدل جائے

۵-تذکرۂ استاذ[حکیم شکیل احمد شمسیؒ]:

یہ مضمون مجموعۂ مضامین بہ عنوان 'حکیم شکیل احمد شمسی :شخصیت اور خدمات' مرتبہ حکیم محمد عبدالرزاق ،شائع کردہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، دہلی، ۱۹۸۷ء میں شامل ہے۔عنوان کے بہ موجب اس سے استاد و شاگرد کے رشتے پر روشنی پڑتی ہے۔دونوں نہ صرف تکمیل الطب لکھنؤ کے تعلیم یافتہ تھے، بلکہ حکیم عثمانی حکیم شمسی کے عزیز ترین شاگرد تھے۔یہ تعلق تاحیات قائم رہا۔حکیم صاحب نے مضمون کا آغاز ان جملوں سے کیا ہے:

''ہر طالب علم کو تحصیل علم کے مختلف مراحل میں متعدد اساتذۂ فن سے کسبِ فیض کا موقع ملتا ہے،مگر ایسے اساتذہ کم ہوتے ہیں جو مدارس و جامعات کی مقررہ میعاد ختم ہوجانے کے بعد بھی اپنے تلامذہ کی علمی سطح اور فکری رجحان کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے دمِ آخر تک چشمۂ فیض بنے رہتے ہیں۔ایسے ہی اساتذۂ فن کی صف میں ایک قد آور اور دل آویز شخصیت میرے استاذ شکیل احمد شمسی کی بھی تھی۔استاذ مرحوم سے اپنے تلمذانہ تعلق کے گزشتہ تیس سال کے طویل زمانے پر نظر ڈالتا ہوں تو ان کی پرفیض رفاقت، بے پایاں محبت اور گراں مایہ سرپرستی کے آگے سرِ نیاز خم ہوجاتا ہے۔یوں تو ہزاروں فرزندانِ طب کو حکیم صاحب کی شاگردی پر ناز ہوگا۔ہونا بھی چاہیے،مگر جو قرب و اعتماد مجھے حاصل تھا اس پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔''[ص ۱۳۸]

آگے حکیم عثمانی نے حکیم شمسی کے متعدد خطوط نقل کیے ہیں جو انھوں نے مختلف مواقع پر اپنے عزیز شاگرد کو لکھے تھے۔ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ان پر کتنا اعتماد کرتے تھے۔آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کا پرنسپل بن کر لکھنؤ سے دہلی جانے کا موقع ہو یا گروہی سیاست کا شکار ہونے پر آزردگی کا معاملہ ہو، ہر موقع پر انھوں نے اپنے شاگرد کو یاد کیا اور شاگرد نے نیازمندانہ ان کی پکار پر لبیک کہا۔

حکیم شکیل شمسی کے بارے میں حکیم صاحب نے متعدد پہلوؤں سے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ایک جگہ لکھا ہے:

''حکیم شکیل احمد شمسی کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔طب کے قدیم ذخائر پر عبور کامل حاصل تھا۔قدیم و جدید کے متصادم تصورات میں وہ غضب کی تطبیقی صلاحیت رکھتے تھے۔''[ص ۱۴۷-۱۴۸]

استاذ و شاگرد کی یکسانیتِ مزاج اور اتحادِ فکر کی ایک مثال اس مضمون سے یہ بھی فراہم ہوتی ہے کہ دونوں شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے تھے۔چنانچہ اس میں حکیم عثمانی نے حکیم شمسی کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں اور اسی مضمون کے اپنے اشعار بھی۔

اس مضمون سے حکیم عثمانی کی بعض اور تحریروں کا بھی علم ہوتا ہے۔مثلاً حکیم شکیل شمسی کی خواہش پر حکیم عثمانی نے تکمیل الطب کالج کے ابنائے قدیم کی تنظیم قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے لیے مشرقی اضلاع اور لکھنؤ کے اسفار بھی کیے تھے۔اس کی رپورٹ مشرق[گورکھ پور] کی ۷/فروری ۱۹۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔حکیم بی، این، شرما، جنرل سکریٹری آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا ایک مضمون بہ عنوان 'شدھ کا تصور۔طب اور سائنس میں' ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوا، جس میں ایلوپیتھی اور یونانی کے انضمام کی وکالت کی گئی تھی۔شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کی خواہش پر حکیم عثمانی نے اس کا جواب لکھا تھا، جو پندرہ روزہ 'مسیحا' بمبئی کی یکم دسمبر ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں 'طب میں شدھ کا تصور اور اس کا پس منظر' کے عنوان سے شائع ہوا۔یہ مضمون تیرہ[۱۳] صفحات پر مشتمل ہے۔

۶-حکیم عبدالرزاق۔ایک مقناطیسی شخصیت:

اس مضمون میں حکیم محمد عبدالرزاق[۱۹۳۱-۱۹۹۲ء] کے بارے میں تاثرات ظاہر کیے گئے ہیں۔اسے حکیم صاحب نے مرحوم کے پہلے میموریل لیکچر کے موقع پر ۹/اپریل ۱۹۹۳ء میں انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں پیش کیا تھا۔ اصل لیکچر ڈاکٹر سید ظہور قاسم نے Relevance of the Unani System of Medicine in Modern Times کے موضوع پر دیا تھا۔حکیم عثمانی کی یہ تحریر اور اس کا انگریزی ترجمہ پہلے، میموریل لیکچر کی پروسیڈنگ میں شائع ہوا، بعد میں اس کی اشاعت مجموعۂ مضامین 'مجاہدِ طب حکیم محمد عبدالرزاق' [مرتبین: حکیم ام الفضل، حکیم سید غلام مہدی]، حکیم محمد عبدالرزاق ریسرچ فاؤنڈیشن برائے یونانی میڈیسن، حیدرآباد، ۲۰۱۰ء میں شامل ہوکر ہوئی۔یہ مضمون چار صفحات پر مشتمل ہے۔

مضمون کے آغاز میں انھوں نے لکھا ہے:

''حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم کی ساری زندگی اور ان کی جدوجہد، ان کے کارنامے، ان کے شب و روز کا سفر، ان کا حضر، ایک مسلسل

رواں دواں زندگی کی مانند تھا۔ انھوں نے زندگی کے آخری لمحہ تک فنِ طب کی بقا اور ترویج کے لیے صرف کیا۔'' [ص ۷۵]

آگے انھوں نے مرحوم کی طالب علمی، ملازمت، طب یونانی کے مختلف سرکاری اداروں کی سربراہی اور دوسرے مواقع پر ان کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرحوم طب کی ارتقاء کے لیے ہر ممکن جدوجہد کرتے رہتے تھے۔ ان کی کوششوں سے ملک کے مختلف حصوں، مثلاً بنگلور، کشمیر، علی گڑھ وغیرہ میں طبی اداروں کے لیے وسیع قطعہ آراضی حاصل ہوئی اور عالم عرب میں بھی طب کا تعارف ہوا اور کئی ادارے قائم ہوئے۔ سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کی ڈائرکٹر شپ کے زمانے میں بہت سے لوگوں کو ان کے ذریعے فیض پہنچا۔

مرحوم حکیم عبدالرزاق کے بارے میں حکیم صاحب نے لکھا ہے:

''دورِ حاضر میں حکیم عبدالرزاق ایک مقناطیسی شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے اندر بے پناہ کشش تھی۔ ایک اثر تھا۔ ان کی بات میں، ان کی گفتگو میں۔ جو مخاطب ہوا کرتا تھا، ان کی بات کو مان لیا کرتا تھا۔'' [ص ۷۷]

۷- یونانی طب میں استفراغ وتنقیہ کی اہمیت:

حکیم مظہر عثمانی کی جو تحریریں دست یاب ہیں ان میں سے بیش تر طبی شخصیات کی سوانح اور خدمات سے متعلق ہیں۔ علاج معالجہ کے میدان میں طویل تجربہ ہونے کی وجہ سے ان سے امید تھی کہ وہ اگر طبی موضوعات پر لکھتے تو ان کے قلم سے بہت مفید مضامین سامنے آتے اور ان کے گہرے مشاہدے اور وسیع تجربے سے نئی نئی معلومات حاصل ہوتیں۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوسکا۔

استفراغ وتنقیہ کے موضوع پر ان کا یہ مضمون صرف چار صفحات پر مشتمل ہے۔ ان میں متعلقہ عنوان پر مختصر اور بنیادی باتیں پیش کی گئی ہیں۔ مضمون کے آغاز میں انھوں نے بتایا ہے کہ طب یونانی میں تمام مزاجی امراض کا علاج دو طریقے پر کیا جاتا ہے۔ ایک تعدیل وتبدیل مزاج اور دوسرا تنقیہ واستفراغِ مادہ۔ پہلا طریقہ سوءِ مزاج سادہ میں برتا جاتا ہے اور دوسرا طریقہ سوءِ مزاج مادی میں۔ آگے انھوں نے لکھا ہے کہ جب کسی سبب سے بدنی رطوبات میں فساد لاحق ہوجاتا ہے تو اعضاء بدن سے موادِ مرض کا تنقیہ وصفائی کے لیے تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ تنقیہ واستفراغ کی حکیم صاحب نے دو صورتیں بتائی ہیں: ایک یہ کہ بدن سے آلاتِ نافضہ [فضلات کو دفع کرنے والے اعضاء] کی قوتِ دفع کے فعل میں تحریک پیدا کرکے مواد خارج کیا جائے۔ دوسری صورت وہ ہوتی ہے جس میں اعضاء کے فعل طبعی میں تحریک نہیں پہنچائی جاتی، بلکہ اعضاء کو کاٹ کر اور شگاف دے کر موذی اور فاسد مواد کو بہا دیا جاتا ہے۔ اسہال، ادرار، تعریق پہلی صورت کی مثالیں ہیں اور فصد، بزل، اور جراحت کاری کے ذریعے دموی اور صدیدی مواد کو خارج کردینا دوسری صورت کے استفراغی اعمال ہیں۔

آگے حکیم صاحب نے استفراغ کے قوانین کلی اختصار کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ پھر استفراغی اعمال گناتے ہوئے لکھا ہے:

''اگرچہ ریاضت، دلک، حمام گرم جیسے اعمال بھی [جن میں حرارت بدنیہ بڑھ جاتی ہے اور قوت مغیرہ پیدا ہوجاتی ہے] استفراغی مقاصد کے حصول کا ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن اسہال، ادرار، قے، تعریق، تعلیق اور حجامت استفراغی عملیات کی خاص صورتیں ہیں، جن کے ذریعہ بدن کے فضلات اور فاسد مواد کو خارج کیا جاتا ہے۔''

آگے انھوں نے اسہال، قے اور تعریق کی مختصر وضاحت کی ہے، لیکن ادرار، فصد، تعلیق اور حجامت پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ یہ مضمون کی پہلی قسط ہے، بقیہ اعمالِ استفراغ کا بیان دوسری قسط میں ہوا ہے یا حکیم صاحب اس موضوع پر صرف اتنا ہی لکھ سکے تھے۔

اس مضمون سے حکیم صاحب کی بعض تحقیقات سامنے آتی ہیں۔ مثلاً انھوں نے جراثیم اور مادۂ مرض کے نظریات میں یوں تطبیق دینے کی کوشش کی ہے:

''جراثیم اور مادۂ مرض کے نظریات میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جراثیم کی دریافت نے طبِ قدیم کے نظریۂ مادۂ مرض کی تشریح کو اور بھی آسان اور قابل فہم بنا دیا ہے۔ یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ حدوثِ امراض میں جراثیم کا بلاواسطہ کوئی رول نہیں ہے، بلکہ جراثیم کی سمیت کاری کے لیے بدن میں موافق عمل ماحول اور قابلِ کاشت مزرع [culture media] کا ہونا ضروری ہے۔ فضلات اور فاسد رطوبات کا اجتماع جراثیمی سمیت [Toxin] کا حامل بن کر مرضی کیفیات کو جنم دیتا ہے۔ تنقیہ اور استفراغ کا مقصد دراصل بدن کے استحالاتی اور تغیراتی اعمال کو تیز کرنا ہوتا ہے، تاکہ طبیعت نضج اور دفعِ مواد پر پوری طرح قادر ہوجائے۔''

۸- اطبائے قدیم کے سہل الاستعمال مجربات:

یہ مضمون ہمدرد طبی کالج کے سالانہ میگزین ۷۷-۱۹۷۶ء میں شائع ہوا ہے۔ اسے حکیم صاحب نے اس وقت لکھا تھا جب وہ کالج میں لیکچرر

تھے۔اس میں انھوں نے چوالیس[۴۴] مجربات تحریر کیے ہیں۔ یہ مجربات جن اطباء کے ہیں ان کے نام یہ ہیں: جالینوس،طبری، مجوسی، رازی، ابن سینا،انطا کی، ابن ہبل، سمرقندی، سویدی، قمری وغیرہ۔

ان کے بتائے ہوئے چند نسخے درج ذیل ہیں:

- چقندر کے ساتھ خردل کا استعمال شب کوری میں نفع عجب بخشتا ہے[جالینوس، رازی، سویدی]
- شلجم کا مداومت کے ساتھ کھانا بہت زیادہ مقوی بصر ہے۔ [ابن سینا، قمری]
- سرکہ اور نمک کا استعمال داڑھ کے درد کے لیے بہت ہی مفید ہے۔[رازی، مجوسی، سویدی]
- گندھک مسفوف کو زردیٔ بیضۂ مرغ نیم برشت میں ملا کر کھانا سعال بارد میں غایت درجہ نفع بخش ہے۔[ابن سینا]
- پوستِ نارنج مروڑ، قے، متلی، کو روکنے کے لیے غایت درجہ مفید ہے۔[انطا کی]

اس مضمون میں حکیم عثمانی کی تحریروں کے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں ان سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اردو زبان وادب پر ان کی اچھی گرفت تھی، لکھنے کا انھیں سلیقہ آتا تھا، مافی الضمیر کو وہ بہت عمدہ اور مؤثر اسلوب میں ادا کرتے تھے۔تحریر وتصنیف کے میدان میں اگر وہ اپنی جولانیاں دکھاتے تو ان کے قلم سے بڑی مفید اور قیمتی تصنیفات منظر عام پر آتیں، مگر تعلیم و تدریس اور علاج معالجہ اور خطابت کے میدانوں میں اپنی زندگی وقف کر دینے کے نتیجے میں وہ تصنیف وتالیف کی جانب خاطر خواہ توجہ نہ دے سکے۔ 'و کان أمر الله قدراً مقدوراً'

اظہارِ تشکر:

حکیم مظہر عثمانی کی ان تحریروں تک راقم سطور کی رسائی ممکن نہیں تھی۔ حکیم احمد سعید[حکیم اجمل خاں انسٹی ٹیوٹ فار ہسٹوریکل اینڈ لٹریری ریسرچ ان یونانی میڈیسن، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی] نے ان کی فراہمی میں بڑی جدوجہد کی۔اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

●●●

تبصرہ — شفاء الامراض

حکیم شمس الآفاق صدیقی کا نام طبّی دنیا کے لیے محتاج تعارف نہیں ہے طبّی فہم وفراست کا قابل قدر ذوق رکھتے ہیں، ان کی زیر طبع کتاب کا مسودہ جو 'شفاء الامراض' کے نام سے موسوم ہے میرے پیش نظر ہے جو مواد، معیار، اور اسلوب بیان کے لحاظ سے طبّی لٹریچر میں ایک مفید ترین کاوش ہے جسے عالمانہ انداز بیان سے بوجھل بنانے کے بجائے عوام اور خواص کی ضرورت واقعی کو پیش نظر رکھ کر آسان پیکر تحریر میں پیش کیا گیا ہے جو طلباء واساتذہ طب کے ساتھ ساتھ یونانی علم علاج سے دلچسپی رکھنے والے عام قارئین کے لیے بھی ایک قابل قدر تحفہ ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں طب یونانی کے مختلف موضوعات پر کچھ کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئی ہیں مگر معالجات کی ایسی کتاب جیسی کہ شفاء الامراض ہے میری نظر سے نہیں گزری۔اس میں علاج امراض کے لیے جو نسخے تحریر کیے گئے ہیں وہ نہ صرف معمول مطب ہیں بلکہ سہل الحصول وسہل الاجزاء بھی ہیں۔ان کی ترتیب میں حکیم صاحب موصوف کی طباعی وجدت طرازی صاف عیاں ہے۔

بعض اہم اور کثیر الوقوع امراض مثلاً سلعہ دماغ، عسر البلع، وجع القلب، ورم غشاء القلب، ورم بطانہ قلب، دبیلہ ریہ، سرطان ریہ، سرطان معدہ، سرطان کبد، تلیف الکبد، امراض غدد لاقناتی، امراض غدہ قدامیہ، سقوط الکلیہ، فقر نطاف، فقدان نطاف وغیرہ کا ذکر اس کتاب میں نہیں ہے میرا خیال ہے معالجات کے نصابی موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے ان امراض کا بیان 'شفاء الامراض' میں ہونا چاہیے تھا۔ امید کرتا ہوں کہ یہ اضافات طبع اول کے وقت ہی یا کم از کم طبع ثانی کے موقع پر کر لیے جائیں گے۔ میں حکیم صاحب کو اس سعی جلیل پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی

۲۶/جنوری ۲۰۰۳ء

حکیم مظہر سبحان عثمانی — وہ جن کو دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں

☆خوشنود حسن قدوسی

۱۹۶۷ء کی بات ہے، دہلی میں پہلی بار بھارتیہ جن سنگھ دہلی میٹرو پولیٹن انتخابات میں فتح یاب ہوئی تھی، انور علی دہلوی اس کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے اکلوتے مسلمان امیدوار تھے۔ میٹرو پولیٹن کونسل کے چیف اکزیکٹیو کونسلر وجے کمار ملہوترہ کی جانب سے مسلمانوں اور ان سے وابستہ اداروں کی شکایات رفع کرنے کی ذمہ داری انور صاحب کے کاندھوں پر تھی جسے وہ بحسن وخوبی انجام دے رہے تھے۔

ایک روز انور صاحب کے دفتر میں ایک خوب رو اور خوش لباس نوجوان داخل ہوا، چہرے پر ہلکی داڑھی تھی، عینک کے پیچھے سے جھانکتی آنکھیں فکر وشعور کی بالیدگی اور چہرے سے پھوٹتی روشنی باطنی اعتماد کی فراوانی کی غماز تھی۔ تعارف ہوا تو پتہ چلا کہ موصوف مظہر سبحان عثمانی ہیں، پیشہ سے طبیب ہیں، کم خرچ زود اثر مفرد دواؤں سے علاج ان کا امتیاز ہے۔ حیرت ہوئی کہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہونے کے باوصف حکیم اجمل خاں کے قائم کردہ ہندوستانی دوا خانہ کے مطب سے وابستہ ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔ عقدہ کھلا کہ چہرہ کی تابناکی صرف وہبی نہیں کسبی بھی ہے۔ روش سے الگ اپنی راہ منتخب کرنے کا حوصلہ وہی کرسکتا ہے جسے اپنے خوابوں کی صداقت کا اس قدر یقین ہو کہ آبلہ پائی کے باوجود راہِ پرخار دیکھ کر حصولِ منزل کی چاہت بے مہار ہو جائے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر

ساری زندگی دہلی مطب کے مستحسنات سے وہ لکھنؤ مطب کی تنگ دامانی کا در ماں کرتے رہے اور یونانی طب کی اس دو آتشہ شراب سے دکھی انسانیت کی خدمت کرتے رہے۔ حیرت میں اس وقت اور اضافہ ہوا جب عثمانی صاحب نے بتایا کہ یہ خدمت وہ بلا معاوضہ انجام دیں گے، فن کے تئیں ان کے جذبہ کی حرارت کو میں آج بھی محسوس کرتا ہوں۔

لاکھوں ہی مسافر چلتے ہیں منزل پہ پہنچتے ہیں دو ایک
اے اہل زمانہ قدر کرو نایاب نہ ہوں کم یاب ہیں ہم

حکومت کی اجازت کے بعد دوا خانہ میں عثمانی صاحب کے مطب کا سلسلہ شروع ہوا۔ دست شفا اور حذاقت نے جلد ہی مرجع خلائق بنا دیا۔ دہلی واطراف کے مریضوں کا تانتا لگنے لگا، لمبی لمبی قطاریں روزمرہ کا معمول بن گئیں اور بے سروساماں یونانی طب کو دہلی میں ایک نیا ٹھکانہ مل گیا۔ بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں کے پہلے دہے میں عثمانی صاحب نے مطب ومعالجہ کی روایات کی جس طرح پاسداری کی وہ اطبا کی نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہے۔ ایک سال کی بلا معاوضہ خدمت کے بعد جب اس کی خبر دہلی کے وزیر اعلیٰ کو لگی تو انہوں نے طبیہ کالج بورڈ کے چیئرمین ہردیال دیوگن کو ہدایت کی کہ ان کے تقرر کو مستقل کیا جائے۔ ترقی کے منازل طے کرتے ہوئے عثمانی صاحب طبیہ کالج، قرول باغ میں لکچرار ہو گئے اور انہیں کالج کے کیمپس ہی میں رہائش مہیا کرائی گئی، میری خوش بختی کہ ان کا مکان میری

☆سابق منیجر ہندوستانی دوا خانہ، دہلی

رہائش کے عین مقابل تھا۔ امتداد وقت کے ساتھ عثمانی صاحب سے میرے تعلقات مستحکم ہوتے گئے، شاید ہی کوئی صبح ایسی گزری ہوگی کہ ان کے لان میں ہم نے ساتھ بیٹھ کر چائے نوشی نہ کی ہو۔ دنیا جہان کی باتیں سیاسیات، معاشیات، اسلامیات، طبّی اور حتیٰ کہ خانگی۔

عثمانی صاحب کا مطب نہایت شاندار تھا، کتنے ہی عسیر العلاج مریض ان کے ہاتھوں شفایاب ہوئے۔ سیکڑوں ایسے واقعات میری نظروں سے گزرے ہیں کہ ملک کے نامی گرامی شفا خانوں سے مایوس مریض عثمانی صاحب کے زیر علاج آئے اور چند ہفتوں میں ہی صحت یاب ہوگئے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ایک جاں بلب مریض کو اس کے اہل خانہ چنڈی گڑھ سے بذریعہ کار دہلی لائے، گھر والوں نے بتایا کہ ہم پانچ سالوں سے پریشان ہیں، ملک کے تمام موقر اداروں سے رجوع کیا لیکن کوئی افاقہ نہیں۔ استفسار سے معلوم ہوا کہ کسی بھی قسم کی غذا ہضم نہیں ہوتی، مریض جو بھی کھاتا ہے، قے کے ذریعہ خارج ہوجاتا ہے، نقاہت اور ضعف کا یہ عالم ہے کہ چند قدم چلنا بھی محال ہے۔ میرے سامنے ہی عثمانی صاحب نے نسخہ لکھا اور فرمایا کہ پندرہ دنوں تک استعمال کرو۔ جسم میں شدید خارش ہوئی، کئی دنوں تک جب افاقہ نہ ہوا اور مرض بڑھتا ہی گیا تو عثمانی صاحب سے مشورہ کیا انہوں نے داخلی اور خارجی استعمال کے لیے دوائیں تجویز کیں، دس دنوں کے استعمال سے مرض جاتا رہا۔ مسیحائی کی یہ داستان اگر مرتب کی جائے تو مطب و معالجہ سے جڑے لوگوں کے لیے کام کی چیز ہوگی۔

عثمانی صاحب کے بیشتر شاگردوں سے میرا ربط رہا ہے۔ ان کی نگاہ ہمیشہ محنتی اور محبّ فن طالب علموں کی متلاشی رہا کرتی تھی۔ جس کسی میں بھی یہ جوہر دیکھ لیتے اسے کندن بنانے میں لگ جاتے تھے، اس تپش کو جو برداشت کر لیتا وہ ان کا چہیتا بن جاتا۔ ان کے شاگردوں میں جس شخص نے مجھ کو بے حد متاثر کیا، اسی کے اصرار پر میں اپنے جذبات قلمبند کر رہا ہوں۔ میں اس نرم و نازک پودے کے تناور درخت بننے تک کے سفر کا گواہ ہوں۔ مخالف تیز ہواؤں میں بھی اپنا دیا روشن رکھنے کی جدوجہد کرنا پروفیسر رئیس الرحمٰن نے اپنی ماں اور حکیم عثمانی صاحب سے سیکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قد کو اور بلند کرے۔

اللہ تعالیٰ نے عثمانی صاحب کو عزم و استقلال کی دولت بے پایاں سے بھرپور نوازا تھا۔ حالات کتنے ہی مخالف اور صبر آزما ہوں، انہوں نے حوصلے کی پتوار کو ہمیشہ تھامے رکھا، اپنے قریبی رفقا سے بھی کسی قسم کی مدد کے طالب نہ ہوئے۔ ان گنہگار آنکھوں نے وہ نظارہ بھی دیکھا ہے، جب جوان بیٹے منظر مرحوم کا جنازہ ان کے سامنے رکھا گیا، ویران آنکھوں سے میرا دوست اس کے چہرے کو تکتا رہا، آنسو کا ایک قطرہ بھی اس حادثے کا گواہ بننے کی جرات نہ کرسکا۔ کہاوت ہے کہ دنیا میں سب سے بڑا بوجھ باپ کے کندھوں پر جوان بیٹے کے جنازے کا ہوتا ہے، اس جانکاہ حادثے کو بھی جس جوانمردی سے انہوں نے انگیز کیا اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ ایمرجنسی کے دور میں سیاسی بنیادوں پر جب ان کو طبیہ کالج، قرول باغ سے علاحدہ کیا گیا تو اس مشکل دور کو بھی انہوں نے بڑے حوصلے سے گزارا اور کبھی کسی سے مدد کی درخواست نہیں کی۔ حکیم عثمانی صاحب کثیر العیال تھے، لیکن انہوں نے بچوں کی بہترین پرورش کی، بیٹیاں بیاہ کر اپنے گھروں میں خوش ہیں، چھوٹے بیٹے دانش پیشے سے طبیب ہیں اور حکومت دہلی میں ڈرگ انسپکٹر [یونانی] کے باوقار عہدہ پر فائز ہیں۔ عثمانی صاحب کو مجھ پر حد درجہ اعتماد تھا، علالت کے دوران انہوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ ان کی تجہیز و تکفین میں میں دانش سلمہ کی مدد کروں، مرحوم دوست سے کیے گئے وعدہ کی میں نے حتیٰ الوسع پاسداری کی۔

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا
ہم ہی سوگئے داستاں کہتے کہتے

●●●

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی

☆ڈاکٹر اسلم جاوید

انسان فانی ہے، بلکہ خلاّقِ دوعالم کے طے کردہ نظام کے مطابق ''ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے''۔یہی اس فانی دنیا کی حقیقت ہے۔ ہر روز نہ جانے کتنے لوگ دنیا کو خیر باد کہتے ہیں اور اسی طرح لاکھوں انسان اس دھرتی پر روزانہ آنکھیں کھولتے ہیں۔ان میں سے ہر ایک اپنی تقدیر اور اکتسابی صلاحیت کے مطابق اسی کرۂ ارض پر ایسے ایسے کارنامے انجام دیتا ہے، جس سے اس کا نام رہتی دنیا تک کے لیے اَمر ہو جاتا ہے۔آپ روئے زمین پر انسانیت کی دنیوی واخروی خدمات کے حوالے سے کیے جانے والے انسانی کارناموں اور کمالات کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ جان کر مبہوت رہ جائیں گے کہ تمام تر نامساعد حالات کے باوجود بنی نوعِ انسان نے اپنی محنت ولگن سے خلاء کا سینہ چیر کر ہزاروں، لاکھوں میل کی مسافت کو چند گھنٹوں میں طے کرنے کا سامان تیار کیا ہے۔مگر یہ سب اسی صورت میں ممکن ہے جب کوئی سچی لگن اور دھن کا پکا انسان اپنی اندرونی صلاحیتوں کا استعمال کر کے دنیا کو حیران کر دینے کے جذبہ صادق سے لبریز ہو۔انسان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے علوم ومعارف سے دوسروں کو مستفید ہونے اور اکتسابِ فیض کا بھرپور موقع میسر ہو۔ورنہ اس فانی دنیا نے ایسے لاکھوں افراد کو چلتا پھرتا، جیتا جاگتا ہوا دیکھا ہوگا، جنھوں نے عروج ملنے کے بعد اپنے گرد نا قابلِ تسخیر حصار کھینچ لیا، جسے مسخر کر کے دوسروں کا اُن تک پہنچنا اور مستفید ہونا مشکل ترین اَمر ہو کر رہ گیا۔

آزادی کے بعد ہندوستان میں جن نابغۂ روزگار شخصیات نے مختلف شعبۂ حیات میں اپنی صلاحیتوں اور کارناموں کا لوہا منوایا ہے، اُن میں آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کے پروفیسر اور معروف سیاسی رہنما، نامور یونانی معالج اور مخلص ومشفق مدرس، استاذ الحکماء حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کی فنی حذاقت ومہارت ہمیشہ نمایاں رہے گی۔ استاذ الحکماء حکیم مظہر سبحان عثمانی کی سب سے بڑی خوبی صلاحیتوں کی شناخت اور آدم گری تھی۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ توپ وتفنگ اور جہاز سازی سے زیادہ دقت طلب اگر کوئی کام ہے تو یہی انسان سازی کا کام ہے۔جس میں آدمی کو اندر سے پہچان کر اس کی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور اسے ڈھالنے کا فریضہ انجام دینا پڑتا ہے۔ اس راہ میں ناقبلِ تسخیر چٹانیں بھی آتی ہیں اور شعبہ جاتی مخاصمت کے طعنے بھرے تیروں کا نشانہ بھی بننا پڑتا ہے۔حکیم مظہر سبحان عثمانی اپنی اسی اہم خوبی کے حوالے سے رہتی دنیا تک یاد رکھے جائیں گے۔ مردم سازی اور صلاحیتوں کی شناخت مرحوم کی وہ خوبی ہے، جسے فراموش کرنا مشکل ہے۔معروف طبیب ڈاکٹر شمس الآفاق صدیقی حکیم عثمانی صاحب کے اوصاف کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''مرحوم بلا کے جوہر شناش تھے، ہر شخص کی صلاحیت سے واقف رہتے اور ان کی صلاحیت کے مطابق کام لینے کا ملکہ بھی اُن میں تھا۔ حکیم صاحب ظرافت، بذلہ سنجی اور اخلاقِ حمیدہ سے پُر تھے۔ یونانی کی حالتِ زار سے افسردہ بھی رہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہماری طب کی بربادی کی سب سے بڑی اور اہم وجہ ہماری غفلت اور ہمارا جمود ہے۔ یہی وہ سبب ہے جو قوموں کو عروج سے زوال اور بلندی

☆یونانی ہربل کلینک، ۸۴، سی، خضر آباد، نئی دہلی-۲۵

سے پستی کی طرف لے جاتا ہے۔ مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ جب تک ہمارے اطباء کی دماغی قوتیں اِن فنون کی خدمت گزاری کے لیے متحرک رہیں اور جب تک ہمارے دست و بازوان دماغی قوتوں کے سایے میں کام کرتے رہے، اس وقت تک ہم برابر ترقی کرتے رہے، کبھی سستی کے ساتھ اور کبھی تیزی کے ساتھ قدم بڑھاتے رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب ہم نے اپنی سعی اور جدوجہد سے ہاتھ اٹھایا، اسی وقت سے ترقی طب نے بھی ہمارا ساتھ چھوڑ دیا اور ہماری حالت اس تلوار سی ہوگئی جو میدان جنگ سے اٹھا کر میان میں رکھ دی جاتی ہے۔''

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی یہی خوبی تھی، جو طلبہ کو اُن کا گرویدہ بنا لیتی تھی۔ وہ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کراتے اور اپنے اخلاص سے طالب علم کے اندر بے پناہ محبت پیدا کر دیتے۔ نتیجۂ کار اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے والے طلبہ اُن کے غلامِ بے دام بن جانے میں فخر محسوس کرتے۔ راقم الحروف خود اس بات کا گواہ ہے کہ اُنہوں نے ہماری جماعت کے سبھی طلبہ کی ایک مخلص باپ، مشفق استاذ اور مربی کے طور پر بھرپور تربیت فرمائی۔ آدم گری کے علاوہ مرحوم کے اندر طبِ یونانی کی ترویج و ترقی کی فکر ہمیشہ دامن گیر رہتی تھی۔ وہ طبِ یونانی کو اس کے قابل فخر ورثہ سے مربوط کرانے کے لیے ہی سیاست سے وابستہ ہوئے تھے۔ اس وقت دہلی میں بی جے پی برسر اقتدار تھی اور مدن لال کھورانہ وزیر اعلیٰ۔ اُنہوں نے دہلی میں طبِ یونانی کو فعال اور مستحکم بنانے کے لیے مسٹر کھورانہ سے کئی بار خصوصی ملاقاتیں کیں۔ بی جے پی کے درجنوں سینئر لیڈروں کے گھروں پر حاضری دیتے رہے اور ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ کسی طرح بھی طبِ یونانی کو اس کا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل ہو جائے۔ یہ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ اُن کی بیشتر سیاسی میٹنگوں کا حصہ بننے کا موقع ملا۔ بی جے پی اقلیتی مورچہ کے صدر رہتے ہوئے بھی اُنہوں نے طبِ یونانی کی ترویج و ترقی اور سربلندی کی فکر سے خود کو فارغ نہیں کیا۔ اٹل بہاری واجپئی کے زیر قیادت این ڈی اے کے دورِ حکومت میں اُن کو اقلیتی کمیشن کا وائس چیئرمین منتخب کیا گیا۔ اس دوران طبِ یونانی کے فروغ کے لیے اُنہوں نے متعدد مرکزی وزراء سے ملاقاتیں اور میٹنگیں کیں۔ کئی میٹنگوں میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ ہم کہنا یہ چاہ رہے ہیں کہ خوردنوازی کا جو عظیم جذبہ قدرت کی جانب سے عطا کیا گیا تھا، اُس کا اثر حکیم عثمانی صاحب کی زندگی میں ہمیشہ نمایاں رہا۔

مرحوم کا وطن موضع صمد پور، ضلع گورکھپور، اتر پردیش ہے، جو اُن کے مورثِ اعلیٰ شاہ عبدالصمد رحمۃ اللہ علیہ کے نامِ نامی و اسمِ گرامی سے منسوب ہے۔ آباء و اجداد کو نوابینِ اودھ سے بائیس مواضعات کی جاگیر ملی ہوئی تھی، جس پر قبضہ و تصرّف آزادیٔ وطن کے بعد خاتمۂ زمینداری تک باقی تھا۔ مرحوم کی ابتدائی تعلیم اُن کے آبائی وطن صمد پور میں ہی ہوئی۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی فنی صلاحیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی کے ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر رئیس الرحمان تحریر فرماتے ہیں:

> ''لکھنے پڑھنے کا شوق [اُنہیں] طالب علمی کے زمانہ سے تھا، ان کے رشحات قلم، بالخصوص طبّی میدان میں گرانقدر اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں، تفصیل کے ساتھ ضبطِ قلم کرنے کی میری ناقص معلومات اجازت نہیں دیتی، البتہ ایک نگارش ''ٹیپو سلطان کے معالجات'' میری نظروں سے گزری ہے، جو طبّی اور فنی نگارش کا بہترین مظہر ہے۔ اساطین، خصوصاً حکیم عبدالحمید مرحوم، حکیم عبدالرزاق، پروفیسر محمد طیب اور حکیم محمد خالد صدیقی سے بڑا والہانہ تعلق تھے، اکثر علمی و فنی نشستوں میں آپ کی رائے کو اعتبار حاصل تھا''۔

علمی و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ سیاسی میدان میں بھی نمایاں مقام رکھتے تھے، بھارتیہ جنتا پارٹی کی مشہور شخصیات، اٹل بہاری واجپئی، لال کرشن اڈوانی، مدن لال کھورانہ، وجئے ملہوترہ اور ساہنی کے ساتھ دیرینہ روابط تھے، بی جے پی کے قومی اقلیتی مورچہ کے صدر کی حیثیت سے کام کیا، صوبائی اکائی کے بہت سے عہدوں پر فائز رہے، مرکزی اکائی کی عاملہ کے ممبر بھی رہے۔ ۲۰۰۳ء میں نیشنل کمیشن فار مائنارٹیز کے وائس چیئرمین ہوئے اور ۲۰۰۶ء تک اس عہدہ پر فائز رہے۔

راقم الحروف کے ساتھ حکیم صاحب گہری نسبت اور والہانہ تعلق رکھتے تھے۔ نہ صرف وہ ہمارے مشفق، بلکہ محسن و مربی کی حیثیت سے تھے اور اپنے ذاتی معاملات میں بھی شریکِ مشورہ کرتے تھے اور گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے سلوک کرتے تھے، ان کی بے پناہ شفقتوں اور محبتوں کے اظہار کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

حکیم عثمانی مرحوم برسوں حکیم اجمل خاں میموریل سوسائٹی [رجسٹرڈ]

کے سرپرست رہے اور اُن کی سرپرستی میں سوسائٹی نے بے شمار خدمات انجام دیں اور متعدد سمینار، کانفرنس اور ورک شاپ کرائی گئیں۔ اُن کے خاص شاگردوں میں ڈاکٹر رئیس الرحمٰن، ڈاکٹر ایس پی بھٹناگر اور راقم سطور کا نام غالباً سرفہرست ہے۔ اُن کے صاحبزادے ڈاکٹر دانش عثمانی ماشاء اللہ دہلی حکومت میں ڈرگ انسپکٹر [یونانی] کے عہدہ پر فائز ہیں۔

دسمبر ۲۰۱۲ء کے آخری ہفتہ بروز اتوار مجھے اپنی رہائش گاہ 'روہنی' میں بلوایا، ساتھ میں کھانا تناول فرمانے کے بعد بہت سے نجی معاملات پر گفتگو کرنے کے بعد، مجھے کچھ ذمہ داریاں تفویض کیں اور آخر میں وصیت کی کہ دانش کا خیال رکھنا۔ یہی ملاقات ہمیشہ کے لیے آخری ہوگئی اور وہ ۱۵ر جنوری ۲۰۱۳ء کو اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

یقیناً حکیم مظہر سبحان عثمانی سے اکتساب فیض کرنے والے لوگ آنے والے وقت میں یہ شعر فخر کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، جس کے خالق مرحوم کے ہی ہم وطن رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری ہیں۔

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو!
جب یہ دھیان آئے گا اُن کو تم نے فراقؔ کو دیکھا تھا
سے ذکر کروگے ہم نے فراقؔ کو دیکھا ہے

شمیمؔ حنفی صاحب فی زمانہ اردو کے ممتاز ترین ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔

بس اس شعر میں فراقؔ کی جگہ حکیم عثمانی مرحوم کا نام یاد رکھ لیں۔ ماشاء اللہ اُن کی چار بیٹیاں ہیں، جو اپنی ازدواجی زندگی میں شاداں وفرحاں ہیں۔ اللہ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ ان کو خالق کائنات صبر جمیل عطا فرمائے، اس عظیم نقصان کو برداشت کرنے کی طاقت دے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور اُن کی رحلت سے طب یونانی اور مسلم سیاست میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اُس کی بھرپائی فرمائے۔ آمین!

●●●

غزل

اور کوئی نہیں ہمارا ہے
اِک تیری یاد کا سہارا ہے
دل بن گیا زباں، ہلے نہیں لب
ہم نے یوں بھی تجھے پکارا ہے
جو ترے در سے دور گذری ہے
مجھ کو اس زندگی نے مارا ہے
زندگی کیا ہے اِک تسلسل ہے
امتحانِ وفا ہمارا ہے
ہمتِ دل تری قسم اکثر
ہم کو منزل نے خود پکارا ہے
ہم کو اِک آپ کی خوشی کے لیے
ہر غمِ زندگی گوارا ہے
اہل ہمت کو ہر جگہ ہے سکوں
جو ہے طوفاں وہی کنارا ہے
دوست دامن بچا گئے مظہرؔ
وقت پر ہم نے جب پکارا ہے

ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات — ایک مطالعہ

☆حکیم محمد فضیل

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی زیر مطالعہ 'ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات' نامی کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اہم اور منفرد ہے۔ اس میں میسور کے فرمان روا ٹیپو سلطان [تخت نشینی: ۲۰ محرم الحرام ۱۱۹۶ ہجری مطابق ۱۷۸۳ عیسوی — شہادت: ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۱۳ ہجری مطابق ۲ مئی ۱۷۹۹ عیسوی] کے احوال اور علمی آثار پر اختصار اور جامعیت کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور پس منظر کے طور پر دیگر سلاطینِ ہند کے علمی و طبّی ذوق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ٹیپو سلطان کے بارے میں حکیم مظہر سبحان عثمانی لکھتے ہیں:

> ''ابوالفتح فتح علی ٹیپو [جس کے معالجات اور تکنیکی تجربات ہماری اس کتاب کا زیب عنوان ہے] کی فرمان روائی ہندوستان کے بہت سے عظیم المرتبت بادشاہوں کی جاہ و حشمت اور وسعتِ مملکت کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتی، مگر اُس کی شخصیت نہ صرف ہندوستان، بلکہ ایشیاء کے دورِ انحطاط کا بہت ہی دل آویز مرقع ہے۔ اُس کی طبّاعی، جدت پسندی اور تجسس علمی اُسے دنیا کے اُن معدودے چند صاحبِ نظر تاجداروں کے ہمسر و ہم پلّہ قرار دیتی ہے، جو تاریخ کے ہر دور میں خراجِ عقیدت لیتے رہیں گے۔''[۱]

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی کتاب 'ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات' سلسلۂ مطبوعات مجلس تحقیقاتِ طبّی دہلی، مطبوعہ الجمعیۃ پریس دہلی، دسمبر ۱۹۷۶ء کی کسی قدر دھندلی فوٹو کاپی ہمارے مطالعہ میں ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے مشتملات درج ذیل ہیں:

۱- مؤلف کے بارے میں
۲- انتساب
۳- تعارف: کویراج برھم دت شرما
۴- پیش لفظ: علی کوثر چاندپوری
۵- حرفِ آغاز
۶- سلاطین ہند کا علمی و طبّی ذوق
۷- اٹھارہویں صدی کے حالات
۸- ٹیپو سلطان کی مذہبی عقیدت
۹- جامع العلوم
۱۰- ٹیپو سلطان کا علمی ذوق
۱۱- فتح المجاہدین [کتاب]
۱۲- علاج مارگزیدہ
۱۳- سگِ دیوانہ کے کاٹ کھانے کا علاج
۱۴- خط بنام سید محمد قلعہ دار سرنگا پٹم
۱۵- خط بنام محمد غیاث خاں سفیر سلطنت خداداد
۱۶- خط بنام چشتی یار خاں
۱۷- ٹیپو سلطان کی تعلیم
۱۸- تحقیق و ریسرچ کی حقیقی تڑپ
۱۹- علمی انحطاط کے اسباب
۲۰- خط بنام خواجہ اعتمادی
۲۱- کتابیات
۲۲- مجلس تحقیقاتِ طبّی کے اغراض و مقاصد

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی اِس کتاب کا سرورق پر مندرج نام 'ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات' اور اندرونی صفحہ پر درج تفصیلی نام 'سلطنتِ خداداد میسور کے فرمانروا ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات' ہے۔ مضامین کی فہرست کے بعد پانچویں صفحہ پر 'مؤلف کے بارے میں' عنوان کے تحت مؤلف کا نام، پیدائش، وطن، تعلیم، نسبت تلمذ خصوصی، ملازمتِ سابقہ، مشغلۂ حال اور موجودہ رہائش کا اجمالیہ ہے۔ کتاب کا انتساب حکیم عبدالحمید دہلوی

☆ ریسرچ آفیسر انچارج، حکیم اجمل خاں انسٹی ٹیوٹ فار لٹریری اینڈ ہسٹوریکل ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی

کے نام ہے۔ 'تعارف' کویراج برہم دت شرما [سابق پرنسپل] آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، نئی دہلی کے قلم کا رہینِ منت ہے۔ 'پیش لفظ' حکیم علی کوثر چاند پوری کا تحریر کیا ہوا ہے اور 'حرفِ آغاز' خود حکیم مظہر سبحان عثمانی کا لکھا ہوا ہے اور یہ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اِن عنوانات کے ذیل میں مؤلفِ کتاب کی شخصیت اور خدمات پر بھی کسی قدر روشنی پڑتی ہے۔

کتاب میں 'فتح المجاہدین' کا ضمیمہ، ٹیپو سلطان کی طبّی دانشوری کا غماز ہے۔ اس میں سگِ دیوانہ کے بارے میں تحریر ہے:

''جس شخص کو سانپ نے کاٹا ہو، اس کو انکولے کی جڑ، جس میں کانٹے نہ ہوں، ایک ہون پانی میں گھس کر پلائیں اور وہی جڑ پیس کر زخم پر لیپ کریں۔''[۲]

''شالی کی جڑ سوکھی ہوئی ہو یا کچی، دھو کر صاف کر کے کوٹ کر شیرہ نکالیں اور مارگزیدہ کو پلائیں۔ یہ جڑ ایک کدہ سے زیادہ نہ استعمال کریں۔ ایک کدہ سے زیادہ ہو تو یہ زہر کی خاصیت پیدا کرتا ہے اور انسان مرجاتا ہے۔''[۳]

''سمندر پھل ایک ہون ٹھنڈے پانی میں گھس کر مارگزیدہ کو کھلائیں اور جس جگہ سانپ نے کاٹا ہو، وہاں گھس کر لگائیں۔''[۴]

پاگل کتے کے کاٹے کا یہ علاج درج ہے:

''چھوٹے سیاہ ببول، جس کی پھلی چار انگل کی مقدار کے برابر ہوتی ہے اور پھول زرد رنگ ہوتا ہے۔ یہ پھل مع پوست و بیج گائے کے دہی میں پیس کر صبح کے وقت پانچ دن تک کھلائیں، غذا وہی کھائیں اور پیاس کے وقت وہی پئیں، پانی سے قطعی پرہیز کریں۔[۵]

بچھو کاٹے کا یہ علاج درج ہے:

''اگر کسی شخص کو بچھو نے کاٹ لیا ہو تو تین پتے کسوندے [ی] کے کھلائیں اور تھوڑی مقدار میں ہاتھ سے مل کر زخم پر لگائیں۔''[۶]

ٹیپو سلطان کے مجوزہ نسخوں میں بعض دواؤں کے نام، طریقہ تیاری اور اوزان جنوبی ہند کی زبان میں ہیں، جن کو قدیم کتابوں کے حوالے سے منقح کرنے کا کام حکیم مظہر سبحان عثمانی نے بڑے تحقیقی انداز میں کیا ہے۔

مذہبی رواداری:

ٹیپو سلطان کے مزاج میں مذہبی رواداری تھی، جو اُس کو اپنے اجداد سے ورثہ میں ملی تھی۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی لکھتے ہیں:

''ٹیپو سلطان کی طبیعت میں مذہبی پہلو بہت نمایاں تھا، اس کے باوجود دیگر مذاہب، بالخصوص ہندوا کابر و معابد کے تئیں عقیدت مندی اور رواداری کا جو طرزِ عمل اُس کے یہاں ملتا ہے، وہ حیرت انگیز بھی ہے اور لائقِ تحسین بھی۔ کبھی وہ تختِ ہما پر بیٹھا ہوا شاردا دیوی کی مورتی کے لیے پالکی بھیجتا ہے تو کبھی عالمِ خواب میں کسی شکستہ مندر کو دیکھ کر اس کی تعمیر کا حکم دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے یا کسی مندر کے مینار کو بقعۂ نور بنا ہوا دیکھ کر اظہارِ مسرت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔'' [۷]

ٹیپو سلطان کی مملکت خداداد میں متعدد ایسے علاقے تھے، جہاں مختلف مذاہب کی مقدس عبادت گاہیں تھیں۔ سری نگری بھی اُنہیں میں سے ایک تھی۔ اس کے بارے میں حکیم مظہر سبحان عثمانی لکھتے ہیں:

''سری نگری کو ہندوؤں کی مذہبی تحریک شنکر اچاریہ کے مرکز اور مقامِ آغاز کی حیثیت سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ جگہ جنوبی ہند میں وہی درجہ رکھتی ہے جو شمالی ہند میں وارانسی کی ہے۔ یہاں کے گرو جنوبی ہند کی قدیم ہندو سلطنت وجہانگر اور راجگان میسور کے مذہبی پیشوا ہوا کرتے تھے۔''[۸]

سری نگری اور وہاں کے مندروں کی حرمت کے تحفظ اور اُن کی نگہداشت کو ایک فریضہ کے طور ٹیپو سلطان اور اُن کے والد سلطان حیدر علی نے برتا تھا اور اس طرح کے دو درجن سے زیادہ فرامین اور خطوط اس وقت کی میسور گورنمنٹ کے آرکیولوجیکل ڈیپارٹمنٹ کی سالانہ رپورٹ ۱۹۱۶ء میں شامل ہیں۔ بقول حکیم مظہر سبحان عثمانی:

''ان خطوط میں سلطان نے معمول کے خلاف سری نگری کے گرو کا نام اور لقب پہلے لکھا ہے اور خود اپنے نام کے ساتھ کوئی لقب نہیں استعمال کیا ہے۔ سلطان کے ان خطوط میں ایک خاص عقیدت اور نیازمندی کا انداز پایا جاتا ہے۔''[۹]

یہاں حکیم مظہر سبحان عثمانی کی کتاب 'ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات' کے حوالہ سے اسی لب ولہجہ کے چند خطوط نقل کیے جا رہے ہیں:

''آپ جگت گرو ہیں۔ آپ دنیا کی بھلائی کے لیے ہمیشہ عبادت وریاضت میں غرق رہتے ہیں۔ جس ملک میں آپ جیسی مقدس ہستی موجود ہو، اس ملک میں خدا کی رحمت ہوتی ہے، بارش اچھی اور فصلیں عمدہ ہوتی ہیں۔''[۱۰]

جگت گرو نے سلطان ٹیپو کو ایک خط کے ذریعہ یہ اطلاع دی کہ مرہٹہ فوج کے سپاہیوں نے مندر کی بے حرمتی کی ہے اور مال وزر لوٹ لیا ہے۔ اس کے جواب میں ٹیپو سلطان لکھتے ہیں:

''اُن لوگوں کو، جو مقدس مقامات کی بے حرمتی سے باز نہیں آتے یقین ہے کہ اس کلجگ میں اُنہیں بہت جلد اپنے کرتوتوں کا خمیازہ ملے گا۔ لوگ بدی کا کام ہنستے ہوئے کرتے ہیں، لیکن خمیازہ روتے ہوئے بھگتیں گے۔ گروؤں سے دغابازی خود اپنی نسل کو منقطع کرنا ہے۔'' [۱۱]

ٹیپو سلطان نے مذہبی مقامات کو جو عطیات دیئے تھے۔ تسخیر سرنگا پٹم کے انگریز کمیشن کو اس کی جو رپورٹ بھیجی گئی تھی، اس کے مطابق:

''[۱] ہندوؤں کے مندروں کو دی جانے والی سالانہ رقم ۱۹۳۹۵۹ پگوڑا [۲] برہمنوں کے مٹھوں کو دی جانے والی سالانہ رقم ۲۰۰۰۰ پگوڑا [۳] مسلم درگاہوں اور مسجدوں کو دی جانے والی سالانہ رقم ۲۰۰۰۰ پگوڑا۔''[۱۲]

مختلف مذاہب کے مقدس مقامات کے عطیات کی محولہ بالا رقم کو مدِنظر رکھتے ہوئے ٹیپو سلطان کی مذہبی رواداری، وسیع القلبی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ تمام عقیدت مندیوں، عطیات اور داد و دہش کے باوجود بقول حکیم مظہر سبحان عثمانی:

''ٹیپو سلطان کی مذہب پرستی اُس کے خلاف سیاسی حربے کے طور پر نفرت آمیز پروپگنڈے کا ایندھن ثابت ہوئی۔ فرنگیان کمپنی نے ٹیپو سلطان کو بدنام کرنے اور اہلِ ملک کو تاریکی میں رکھنے کی غرض سے گمراہ کن کتابیں لکھیں اور لکھائیں، تاکہ ٹیپو سلطان کی شخصیت کے تابناک پہلو ہمارے سامنے نہ آسکیں۔''[۱۳]

لیکن حق اور سچ لکھنے والوں کی اِس دنیا میں کمی نہیں ہے۔ کیپٹن لٹل، جو میسور کی تیسری جنگ میں شریک تھا، لکھتا ہے:

''گزشتہ چند سالوں سے انگریزی زبان کے ان تمام الفاظ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا جارہا ہے، جس سے ٹیپو سلطان کو بدنام کیا جاسکے۔ لغات میں ذلیل سے ذلیل الفاظ سلطان کی مذمت کی غرض سے تلاش کر کے نکالے جارہے ہیں۔ باوجود اس کے بہت سے لوگوں کو رنج ہے کہ زبان میں اس قدر وسعت نہیں ہے کہ ٹیپو سلطان کو دل بھر کر گالیاں دی جائیں، اس لیے یہ لوگ نئی اصطلاحات وضع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔''[۱۴]

جی آر جوسیر نے بھی ٹیپو سلطان کی شخصیت کو مسخ کرنے والوں کا احتساب کیا ہے، لیکن اُنہوں نے بھی دیگر مذاہب سے اُس کی عقیدت کے بیانیہ سے صرفِ نظر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''وہ صرف دنیادار نہیں تھا، اپنے مذہب سے اس کو حد درجہ محبت تھی۔ ظلم ہے کہ مذہبی محبت کو بھی جرم قرار دیا جائے۔ تعجب ہے کہ ایک انسان کے مرجانے کے بعد بھی اس کی صرف برائیاں ہی دکھائی جائیں اور اس کے کیرکٹر کے روشن پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جائے۔''[۱۵]

کتابیات:

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے اپنی تالیف میں جس قدر دادِ تحقیق دی ہے، اُس کا اندازہ 'کتابیات' پر نظر ڈالنے سے ہوتا ہے۔ اس میں فارسی، اردو اور انگریزی زبان کے مصادر شامل ہیں۔ ان میں فارسی کی آٹھ کتابوں سے اکتساب کیا ہے، جس میں تین مخطوطے ہیں، اسی طرح اردو کے مصادر کی تعداد ۲۳، اور انگریزی مآخذ کی تعداد ۱۳ ہے۔ ۶۴ صفحات پر مشتمل متن کے لیے اس قدر مصادر سے رجوع کرنے کے باوجود حکیم مظہر سبحان عثمانی کا شوقِ تحقیق 'ھل من مزید' کا تقاضا کرتا ہے، لکھتے ہیں:

''افسوس کہ سلطان ٹیپو کی علمی شخصیت جس ہمہ گیر مطالعہ کی متقاضی تھی، نہ اس کا وقت ملا، نہ وسائل و ذرائع مہیا ہو سکے نیز اہم مواد ایسی زبانوں میں ہیں، جن سے میں واقف نہیں ہوں، اس لیے بہتر یہی معلوم ہوا کہ 'سکونِ فردا' کے مزید انتظار کے بجائے، جو کچھ ہے اور جیسا کچھ بھی ہے، شائع کر دیا جائے۔'' [۱۶]

کسی بھی محقق کا اپنی تحقیق میں ایک آنچ کی کسر کا احساس اُس کی تحقیق کو اعتبار کے مرتبہ تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے اور بلاشبہ حکیم مظہر سبحان عثمانی کو اسی احساس نے اعتبار بخشا ہے اور اس طرح اُن کی یہ تحریر موضوع کے اعتبار سے اردو کی اہم اور معتبر تحریروں میں شمار کی جاتی ہے۔

حوالہ جات

۱- ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات: ص ۱۵
۲- ایضاً: ص ۳۴
۳- ایضاً: ص ۳۴
۴- ایضاً: ص ۳۵
۵- ایضاً: ص ۳۶
۶- ایضاً: ص ۳۶
۷- بائیسواں و اکتیسواں خواب، خواب نامہ: بحوالہ ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات، ص ۲۴
۸- ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات: حاشیہ ص ۲۲
۹- ایضاً: ص ۲۲
۱۰- ایضاً: ص ۲۲
۱۱- ایضاً: ص ۲۳
۱۲- میسور گزیٹر: ص ۶۸۰، بحوالہ ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات: حاشیہ ص ۲۳
۱۳- ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات: ص ۲۴
۱۴- ماڈرن میسور: ص ۲۲۰، بحوالہ ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات۔ ص ۲۴
۱۵- تاریخ سلطنتِ خداداد: ص ۵۷۲، بحوالہ، بحوالہ ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات، ص ۲۵
۱۶- حرفِ آغاز، ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات: ص ۱۱

●●●

میرے پاپا

☆ڈاکٹر دانش ریحان عثمانی

کسی نعمت کی قدر و قیمت اس کے زوال کے بعد معلوم ہوتی ہے۔ میرے پاپا جب تک حیات تھے یہی احساس ہوتا تھا کہ ان کی شفقت، ان کی سرپرستی، ان کی چاہت اور ان کا پیار ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اچانک وہ ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ ۱۵ جنوری ۲۰۱۳ء کو وہ ہمیں بے سہارا چھوڑ گئے۔ ان کی زندگی میں مجھے نہ کسی ذمہ داری کا احساس ہوا نہ ان کی خدمت گزاری کا جذبہ پیدا ہوا حالانکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بے حد قریب تھے۔ میں جب ان کے سامنے ہوتا تو بے اختیار بچہ بن جاتا اور وہ مجھے ننھے بچے کی طرح چھیڑتے، میں اپنی کوئی خواہش پوری کرنے کے لیے بال ہٹ کا مظاہرہ کرتا تو وہ مجھے ستاتے، چھیڑتے، ان کے چہرے پر ایک شوخ سی مسکراہٹ ہوتی اور جب میں روٹھ جاتا تو مجھے مناتے اور میری ضد پوری کر دیتے۔

میرے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں تھا، جس سے پاپا کی محبت کی پیمائش کرتا، بس اتنا معلوم ہے کہ ان کی محبت کی بارشوں میں ہمیشہ شرابور رہتا۔ آج جب وہ ہمارے پاس نہیں ہے تو ان کے بارے میں ہر آرزو حسرت بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی سوچتا ہوں کاش کہ پاپا ہوتے تو کتنا خوش ہوتے کہ میں ایک ذمہ دار شخص بن گیا ہوں۔ میں ان کی خدمت کرتا ان کا ہر کام دوڑ دوڑ کر کرتا، ان کے پاؤں دباتا، سر میں تیل لگاتا، وہ مجھے جس منزل پر پہنچانا چاہتے تھے، وہاں تک پہنچنے میں جان کی بازی لگا دیتا مگر حیف کہ وہ پہلے ہی رخصت ہو گئے۔ میرے پاپا مجھے کتنا چاہتے تھے اس کا اندازہ ان کی موت کے بعد ہوا۔ بابر اور ہمایوں کی محبت کی داستان کو پاپا کی زبانی کئی مرتبہ سنا ہے۔ بابر اپنے بچوں میں ہمایوں کو سب سے زیادہ چاہتا تھا، اس کی شدید خواہش تھی کہ اس کے بعد ہمایوں ہی تخت و تاج کا وارث بنے۔ ایک بار ہمایوں سخت بیمار ہوا، ہر قسم کے علاج کے باوجود مرض بڑھتا گیا، اس کی بیماری کی وجہ سے بابر سخت مضطرب اور فکر مند تھا، اس نے دعا کی کہ اے اللہ اگر جان کی قیمت جان ہو سکتی ہے تو میری جان لے لے اور ہمایوں کو شفایاب کر دے۔ اسے اتفاق کہیے یا بابر کی دعا کا اثر کہ ہمایوں صحت مند ہو گیا اور بابر ایسا بیمار پڑا کہ اس کو صحت واپس نہ مل سکی اور اس کا انتقال ہو گیا۔ باپ بیٹے کی یہ محبت تاریخ کا مشہور فسانہ بن گئی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے پاپا بھی مجھ سے بابر ہی کی طرح محبت کرتے تھے اور میں بھی ٹوٹ کر انہیں چاہتا تھا۔ یہ محبت ایسا جذبہ ہے جسے زبان و قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔

عہد طفولیت کی باتیں تو یاد نہیں مگر چار بہنوں اور بھیا منظر کے بعد میری پیدائش پاپا کے لیے کس قدر خوشیاں لائی ہوگی اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں صاحب اولاد ہوا۔ گھر میں سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے ممی، پاپا اور بہنوں، سب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ ممی بتلاتی ہیں مجھے چھینک بھی آ جاتی تو گھر میں زلزلہ آ جاتا۔ پاپا ایک ایک فرد کو لکچر پلایا کرتے

☆ ڈرگ انسپکٹر [یونانی]، این سی ٹی، حکومت دہلی

تھے۔ احساس وشعور کی دنیا میں داخل ہوا تو پاپا نے میرے مستقبل کی پوری منصوبہ بندی کر لی تھی، انہوں نے میرے بارے میں زرتار خواب بنے تھے، وہ مجھے ایک بڑا طبیب بنانا چاہتے تھے۔ اس وقت ہم لوگ قرول باغ میں رہائش پذیر تھے، وہاں پنجابی کلچر کا بول بالا تھا، انہیں تشویش تھی کہ کہیں میں اس تہذیب میں ضم نہ ہو جاؤں اور اپنی تہذیب وثقافت کی قدر و قیمت نہ کھودوں، پاپا نے دل پر جبر کر کے مجھے بنگلور میں میری بہن کے پاس بھیج دیا۔ فرصت نکال کر بذریعہ فلائٹ مجھ سے ملنے کے لیے پہنچ جاتے۔ پاپا کو احساس ہو گیا کہ وہ خود سے مجھے دور نہیں رکھ سکتے ہیں، بیٹے کی جدائی ان کی مشغولیات میں حارج ہونے لگی، بالآخر سال بھر کے بعد ہی مجھے واپس بلا لیا گیا۔ میری تعلیم کے لیے اسکول کے انتخاب کا مرحلہ بڑا دشوار گزار تھا، انہیں یہی فکر لگی ہوئی تھی کہیں میرا لاڈلا بگڑ نہ جائے بہت غور وفکر، احباب سے مشوروں کے بعد جامعہ ملیہ اسکول میں مجھے داخل کیا گیا اور حکم ملا کہ تمہیں یہاں کے ہوسٹل میں رہنا ہے، مسلم بچوں کے درمیان تمہاری اچھی تربیت ہوگی۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے گھر سے دور تھا۔ پڑھائی میں دل کیا خاک لگتا، یار دوستوں کے ساتھ مارا مارا پھرتا، پڑھنے میں تیز نہیں تھا تو خراب بھی نہیں تھا، ہوسٹل کی زندگی نے محبتوں کو ہلکا کر دیا پہلے پاپا کو دیکھے بغیر چین نہیں پڑتا تھا مگر اب وہ جذبے سرد پڑ رہے تھے۔

پاپا نے اپنی زندگی کئی خانوں میں بانٹ رکھی تھی۔ کالج میں پڑھانا، مریضوں کو دیکھنا، دوست احباب کی محفلوں کو لالہ زار بنانا۔ اس پر مستزاد سیاسی مصروفیات۔ بچوں کی دیکھ بھال کا ویسے ہی کم موقع ملتا تھا، مجھ کو ہوسٹل میں رکھ کر وہ بے فکر ہو گئے۔ پاپا کی پوری زندگی بڑے شہروں میں بسر ہو رہی تھی لیکن وہ اپنی مٹی سے ہمیشہ جڑے رہے۔ اعزہ واقربا کا آنا جانا ہمیشہ لگا رہتا۔ زمین دارانہ معاشرت ان کے رگ وریشے میں سرایت تھی۔ لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم کے وہ قائل نہیں تھے، اس لیے مناسب تعلیم دلا کر سب کو ان کے گھر رخصت کر دیا گھر آتا تو بولا یا پھرتا، باہر کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی اجازت نہ تھی، جامعہ بورڈ مکمل کرنے کے بعد علی گڑھ طبیہ کالج میں میرا داخلہ کروایا۔ میری ممی اور بہنوں کا خیال تھا کہ پاپا کی جیب سے پیسہ نکلوانا بڑا مشکل کام ہے، مگر میرے لیے ان کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ دوران تعلیم کبھی پیسے کی تکلیف نہیں ہونے دی، میری ہر خواہش پوری کی، اس سلسلے میں ایک واقعہ آج تک نہیں فراموش نہیں کر پایا۔ پاپا نے ایک موٹی رقم میرے اکاؤنٹ میں ڈلوادی کہ میرے لاڈلے کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ میں نے وہ رقم ایک بزنس میں لگا دی، رقم ڈوب گئی، پاپا کی ناراضگی کا سخت خوف تھا، وہ ناراض تو ہوئے مگر صرف اتنا کہہ کر رہ گئے: صاحب زادے کو دیکھو، ''پڑھیں فارسی، بیچیں تیل''۔ ان کی صرف ایک آرزو تھی کہ میں ان کی علمی میراث کا سچا جانشیں بنوں مگر ''توفیق باندازہ فطرت ہے ازل سے''۔

میرے پاپا کی طبّی اور سیاسی حلقوں میں ایک اعلیٰ امیج تھی۔ معاصرانہ چشمکیں، حاسدانہ نظریں اور ظرف کی پستی کیا کیا گل کھلاتی ہے، اس سے ہم نابلد نہیں ہیں۔ پاپا کو دور سے دیکھنے والے ان کی شخصیت کو پرکھ نہیں سکے، جن لوگوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے وہ حقیقت سے خوب واقف ہیں۔ ممکن ہے کہ مصالح اور منافع نے زبانوں پر تالے لگا دیئے ہوں اور حق بات کہنے کی ان میں جرأت نہ ہو۔ میرے پاپا ایک خوددار اور بے باک انسان تھے۔ قوم وملت کے بارے میں ان کا اپنا نقطہ نظر تھا، جس کا وہ برملا اظہار کرتے تھے، نہ وہ افواہوں سے ڈرتے تھے، نہ انگشت نمائی اور نکتہ چینیوں کی انہیں پرواہ تھی۔ جن لوگوں نے ان کی شبیہ کو داغدار کرنے کی کوشش کی حقائق نے انہیں ان کی اوقات بتادی۔ یہی افسوس ہوتا ہے ان لوگوں کی ذہنیت پر جو ان کے حاشیہ بردار تھے، بیشتر اوقات پاپا کی جی حضوری میں گزارا کرتے تھے، پاپا سے نہ صرف فائدہ اٹھایا بلکہ ان کے اثر و رسوخ کا بے جا استعمال کیا۔

پاپا کے جانے کے بعد یہ لوگ مستحسن انداز میں ان کا ذکر بھی گوارہ نہیں کرتے ہیں، بشری کمزوریوں سے کوئی مبرا نہیں؟ کسی میں کم کسی میں زیادہ، کسی کے عیوب پر پردے پڑے ہوتے ہیں، لوگ اس کی پاکبازی کی قسمیں کھاتے ہیں۔ میرے پاپا میں بھی بشری کمزوریاں تھیں، مگر وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے، قوم وملت کا درد رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے کچھ اصول بنائے تھے، وہ سختی سے اپنے اصولوں پر کاربند تھے۔ اپنی ذات کی گرہوں کو کھولنا مجھے پسند نہیں ہے، مگر بات میرے پاپا کی ہے، میری پوری دنیا صرف انہیں کے گرد طواف کرتی تھی، میں ان کے خوابوں کو شرمندہ تعبیر نہیں کر سکا، مگر ان کی جانب سے دفاع کرنے کا مجھے حق ہے۔

پاپا نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت میں دینی پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، وہ اسلاف، بزرگوں اور علمائے کرام کا احترام کرتے تھے۔ انہوں نے

دینی بیزاری کا اظہار نہیں کیا، ان کی تحریروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت میں وہ کیا تھے اور خلق خدا نے انہیں کیا بنا دیا۔

سیاست سے دلچسپی پاپا کی سرشت میں تھی۔ تعلیم کے دوران ہی ان کی قائدانہ صلاحیت ابھر کر آئی تھی۔ سیاست سے لگاؤ ہی کی وجہ سے انہوں نے صحافت کے میدان کا انتخاب کیا تھا، وہ قوم وملت کی خدمت کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت تھی۔ میں سیاست کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا ہوں، اتنا ضرور ہے کہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے پلیٹ فارم سے انہوں نے طب یونانی کے لیے وہ سب کچھ کیا جو شاید انفرادی طور پر یا کسی اور سیاسی پارٹی سے وابستہ ہو کر نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرنے کے بجائے ان کا مواخذہ کرنا یا طنز وتشنیع سے نوازنا شائستگی کے خلاف ہے۔

میرے پاپا طب یونانی سے والہانہ شیفتگی رکھتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انہوں نے خلوص نیت کے ساتھ خود کو طب کے لیے وقف کر دیا تھا، ان کی دلی آرزو تھی کہ یونانی پیتھی جدید طریقۂ علاج سے کسی طرح پیچھے نہ رہے۔ وہ ایک طرف تدریس کی مسند لگائے طلباء کو فیض یاب کرتے تھے تو دوسری طرف مطب کے ذریعہ عوام کی خدمت کرتے تھے۔ طب کی کانفرنسوں، اداروں اور تنظیموں کو فروغ دینے میں کلیدی رول ادا کر رہے تھے، بیک وقت کئی سمتوں میں کام کرنے والی ہستیاں کم ہی پیدا ہوتی ہیں۔ وہ ایک بہترین نباض تھے، معالجات کی دنیا میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، ان کی مسیحائی کے بے شمار قصے ہیں۔ ان میں سے ایک آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں میں بی یو ایم ایس کرنے کے بعد پاپا کی کلینک سے وابستہ ہو گیا، جدید طریقۂ علاج سے بھی واقف تھا، میڈیکل رپورٹس پر زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ گورکھپور سے ایک شخص پاپا کے پاس آیا، پاپا نے اسے نسخہ لکھ دیا اور دوا دے کر میرے پاس بھیج دیا، میں اس کی رپورٹس دیکھ کر چونک پڑا، اس سے کہا تم کو اپینڈی سائٹس ہے فوراً آپریشن کرواؤ ورنہ مر جاؤ گے کیونکہ اس مرض کی ساری علامات موجود تھیں۔ اس نے کہا کہ باڑہ ہندوراؤ اسپتال والوں نے بھی یہی بتایا ہے۔ پھر پاپا کے پاس گیا، میں نے پوچھا: پاپا آپ نے کیا تجویز کیا ہے؟ انہوں نے کہا بھئی اسے پیٹ میں درد ہے پیٹ میں کیڑے ہیں دوا سے گر جائیں گے، میں بگڑ کر کہتا گیا پاپا اس طرح تو وہ مر جائے گا اس کو اپینڈی سائٹس ہے اور فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔ مسکرا کر کہنے لگے اچھا تم ہی علاج کرو، میں نے اسے ساری ہدایات دے کر واپس بھیج دیا۔ بیس دن کے بعد وہ واپس آیا میں نے خوش ہو کر پوچھا آپریشن کرا لیا کہ نہیں؟ کہنے لگا نا جی نا میں نے تو حکیم جی کی دوا کھائی تھی کیڑے نکلے ٹھیک ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد پاپا کو پھر کبھی چیلنج کرنے کی جرأت نہ کی۔

کہتے ہیں کہ ہر بڑے شخص کی کامیابی کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے۔ پاپا کی کامیابی اور سکون سے کام کرنے میں میری ممی کا پورا تعاون حاصل تھا۔ ہمارے یہاں ہر وقت لوگوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ ممی سب کی ضیافت کرتیں، کھانا کھلاتیں۔ گاؤں سے اعزاء واقارب بکثرت آتے تھے ممی ان کی ہر طرح خدمت گزاری کرتی تھیں۔ وہ دوا سازی میں پاپا کی پوری طرح مددگار رہوتیں، اس کے ساتھ بچوں کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری بھی انہیں کی تھی۔ پاپا غصہ کے تیز تھے یہ بھی ڈر لگا رہتا کہ کہیں کوئی کام بگڑ نہ جائے۔ ممی کا بھرپور تعاون اگر نہ ملتا تو پاپا کا اپنی مشغولیات اور ذمہ داریوں سے عہد برآ نا مشکل ہو جاتا۔ میں ممی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ایک مشرقی عورت ہونے کا حق ادا کر دیا۔

مضمون نامکمل رہ جائے گا اگر میں پاپا کے شاگردوں کا ذکر نہ کروں۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے پاپا سے فیض اٹھایا تھا۔ کئی ایک پاپا کے چہیتے تھے۔ یہ لوگ پاپا کو اپنا مرشد اور روحانی باپ سمجھتے تھے اور پاپا کے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ میں یہاں اپنے برادر محترم پروفیسر رئیس الرحمٰن کا ذکر کروں جو پاپا کے عزیز اور چہیتے شاگرد تھے۔ پاپا کی زیارت کیے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے شاگردی کا پورا پورا حق ادا کیا۔ پاپا کی بیماری اور پھر وفات کے بعد میں پریشان تھا کہ کیسے ان کی قیمتی وراثت کو سنبھالوں گا۔ پاپا کی زندگی میں سیر سپاٹے کے علاوہ کچھ اور نہیں کیا تھا۔ ان حالات میں برادرم رئیس الرحمٰن صاحب تھے جنہوں نے ہمارا حوصلہ بڑھایا۔ موصوف کی خوش اخلاقی، احسان شناسی اور اعلیٰ ظرفی سے میں اور میرا خاندان آج بھی پہلے کی طرح مستفید ہے۔

●●●

شاہدِ شمع فروزاں

☆حکیم احمد سعید

تاریخ صرف انہیں لوگوں کو یاد رکھتی ہے جو تاریخ کے دھارے میں بہتے نہیں، بلکہ اسے موڑنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اپنی صلاحیت، ذہانت وفطانت اور جہد مسلسل سے خود اپنی شناخت بناتے ہیں، ایسے لوگوں کو تاریخ گوہر گراں مایہ سمجھ کر اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے اور انہیں حیات دوام عطا کرتی ہے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی بھی ایک ایسے شخص تھے، جنہوں نے ہندوستان میں طب یونانی کو نئی جہت دی، نئی شناخت دی، نئی زندگی دی، وہ متنوع اور متضاد صلاحیتوں اور صفات کے مالک تھے۔

عثمانی صاحب مشہور ومعروف معالج، مشرقی تہذیب کے مسند نشیں حکیم اجمل خاں کی طبّی روایات کے امین، شعلہ بار خطیب، حکومتی ایوانوں میں طب یونانی کے ترجمان اور آزادی کے بعد سیاسی افق پر نمودار ہونے والے درخشندہ ستارے تھے۔ وہ دلکش، پرُ وقار شخصیت کے مالک تھے، ان کے مزاج میں خودداری اور قلندری تھی۔

ضلع گورکھپور کے ایک تاریخی قصبہ صمد پور میں آپ پیدا ہوئے۔ آپ کے جد امجد شاہ عبدالصمد کے نام پر یہ قصبہ صمد پور کے نام سے معروف ہے، شاہ عبدالصمد صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے، عہد اکبری کے دستاویزات میں ان کا تذکرہ ملتا ہے اورنگزیب نے اس سرزمین سے گزرتے ہوئے اسے جائے ولایت قرار دیا۔ فارسی کے مشہور شاعر اور انشاپرداز منشی مادھو رام کا تعلق بھی اسی علاقہ سے تھا، منشی مادھورام کی کتاب 'انشائے مادھورام' ایک زمانہ تک ہندوستان میں داخل نصاب تھی۔ عہد عالم گیری میں عثمانی صاحب کے اسلاف کو ان کی علمی خدمات اور بزرگی کی وجہ سے جاگیریں عطا ہوئیں۔

شاہ عبدالصمد کے علمی خانوادے کے چشم و چراغ عثمانی صاحب یکم جولائی ۱۹۳۸ء میں پیدا ہوئے۔ زمینداری تو حصوں بخروں میں تقسیم ہوگئی تھی مگر زمین دارانہ ٹھاٹ باٹ باقی تھا، مروجہ روایات کے مطابق مکتب کی تعلیم منشی عاشق علی کی نگرانی میں مکمل ہوئی، جو آپ کی خاندانی زمینوں کے منتظم تھے، اس کے بعد مدرسہ ناصر العلوم، گھوسی میں داخل کیا گیا۔ مدرسہ ناصر العلوم میں کتنے سالوں تک آپ نے تعلیم حاصل کی یہ معلوم نہیں ہوسکا، اس زمانے میں گورکھپور میں جارج اسلامیہ کالج کی بڑی شہرت تھی، خوش قسمتی سے آپ کے خالو مولوی سید غلام محی الدین اسلامیہ کالج میں فارسی کے استاد تھے، آپ نے ثانوی درجات کی تعلیم کے لیے مذکورہ کالج میں داخلہ لے لیا اور ان کی رہنمائی اور سرپرستی میں ثانویہ کی تعلیم مکمل کی۔ عثمانی صاحب کے ادبی ذوق اور تحریری صلاحیت پیدا کرنے میں آپ کے خالو کا اہم کردار تھا۔

مزید تعلیم کے لیے اعظم گڑھ کے مختلف دینی مدارس میں داخلہ لیا، مگر مدارس کی فضا اور شدید بندشوں اور پابندیوں کی وجہ سے کہیں ٹک کر نہیں رہ سکے۔ مدرسہ بیت العلوم، اعظم گڑھ میں داخلہ لیا، مگر بھاگ کھڑے ہوئے۔ دینی تعلیم کا آخری پڑاؤ مدرسہ کنز العلوم، فیض آباد تھا۔ ذہانت اور ذکاوت فطری تھی، طبیعت میں تجسس تھا، تحقیق وجستجو سرشت میں تھی، بحث ومباحثہ میں طاق تھے، خود ان کی روایت ہے کہ ''اصول فقہ کی مشہور کتاب نور الانوار کا درس جاری تھا، تقلید کے مبحث میں استاذ سے الجھ گئے اور کہا کہ کتاب میں جو تقلید کی تعریف کی گئی ہے، اس سے تو شرک کی بو آتی ہے، استاذ محترم نے

☆ ریسرچ آفیسر [یونانی]، اجمل خاں انسٹی ٹیوٹ فار لٹریری اینڈ ہسٹوریکل ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی

بہت سے دلائل دیے مگر میں مطمئن نہ ہوسکا۔ مدرسہ میں ہنگامی صورت پیدا ہوگئی، طلباء بھی دو گروہوں میں بٹ گئے، آٹھ روز تک بحث ومباحثہ چلتا رہا اور دستار بندی سے قبل ہی مجھے مدرسہ سے فارغ کر دیا گیا۔

اس کے بعد عثمانی صاحب وطن واپس آ گئے مگر اعلیٰ تعلیم کی لگن نے خاموش نہ بیٹھنے دیا۔ گاؤں میں قیام کے دوران سرشتہ تعلیم عربی و فارسی کے امتحانات مولوی اور عالم پاس کر لیا، اہل تشیع کے عقائد کا گہرا مطالعہ کیا اور اہل سنت پر ان کے اعتراضات کے جواب میں ایک مدلل کتاب بڑی دیدہ ریزی سے تصنیف کی۔ قرب وجوار میں عثمانی صاحب اور ان کی کتاب کے چرچے ہونے لگے۔ مسلکی ہم آہنگی مسموم ہونے لگی۔ خاندان کے بزرگوں نے باہمی مشورے سے حکیم صاحب کو حکم دیا کہ کتاب ضائع کر دی جائے، آپ نے حکم کی تعمیل میں اسے کنواں میں ڈال دیا اور مناظرانہ فکر کا رنگ پختہ ہونے سے پہلے اتر گیا۔

عالم کے امتحان میں آپ نے طب کا مضمون بھی منتخب کیا تھا، اس سے طب یونانی میں دلچسپی پیدا ہوئی اور تعلیمی سفر کو دوبارہ جاری رکھنے کی خواہش انگڑائی لینے لگی، وسائل کی کمی کی وجہ سے دل مسوس کر رہ گیا، والد کا انتقال صغرسنی میں ہو چکا تھا، زمین شکمی کی نذر ہو چکی تھیں، والدہ سے ذکر کیا، انہوں نے ہمت اور حوصلہ دلایا، چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کے خوابوں کو پورا کرنے کا بیڑہ اٹھایا، شریک حیات نے اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ دیا اور وفا شعار بیوی ہونے کا حق ادا کیا اور ان کی راہوں کے کانٹے خود چن لیے۔

بالآخر ۱۹۵۵ء میں آپ نے برصغیر کی ممتاز طبّی دانش گاہ 'تکمیل الطب کالج لکھنؤ' میں داخلہ لے لیا۔ یہ دنیا آپ کے لیے نئی تھی، کھلی فضا اور حسین ماحول میں اپنی فکر ونظر کو وسیع کرنے کا سنہری موقع ملا، تحریر وخطابت کے جوہر کو جلا ملی، صلاحیتیں بکھر گئیں آپ کی تقریریں اور تحریروں نے اپنی سمت پہچان لیا تھا، وہاں آپ کی شخصیت اساتذہ اور طلباء دونوں میں مقبول رہی، آپ کی تقریروں اور تحریروں نے پورے کالج میں دھوم مچا دیا۔

نومبر ۱۹۵۹ء میں آپ ایف، ایم، بی ایس کی سند لے کر خوش گوار یادوں کے ساتھ وطن مالوف صمد پور واپس آ گئے اور گاؤں کے قریب بازار میں اپنا مطب کھول لیا، یہ آپ کی عملی زندگی کا آغاز تھا، مگر یہ آپ کا خواب نہیں تھا۔ آپ کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ خواب جو دوران تعلیم آپ نے بنا تھا، شرمندہ تعبیر ہونے سے قبل بکھر جائے گا، آرزوئیں دم توڑ دیں گی، مطب سے اتنی بھی آمدنی نہیں ہو رہی تھی کہ آپ اہل خانہ کی کفالت خوش اسلوبی سے کر لیتے، محرومی قسمت پر ترس بھی آتا اور جھنجھلاہٹ بھی ہوتی، مفلسی، کسمپرسی اور غریبی کے اس دور کو آپ کبھی فراموش نہیں کر سکے۔

مطب چلنے کی جب کوئی صورت نہیں نظر آئی تو ملازمت کا خیال آیا۔ گورکھپور میں ہمدرد ایجنسی کے مطب میں بطور طبیب تقرری کی سبیل نکل آئی، آپ نے اس ملازمت کو غنیمت جانا اور گورکھپور چلے آئے۔ اسی ایجنسی میں حکیم ابوالکلام بھی مصروف عمل تھے۔ دونوں حکیم شکیل احمد شمسی کے شاگرد تھے، ان کی مرافقت اور مصاحبت آپ کو راس آئی۔

گورکھپور مشرقی یوپی کے اہم شہروں میں سے ایک ہے، اس کی اپنی ثقافتی اور مذہبی تاریخ ہے، آریہ ورت کا تہذیبی مرکز رہا ہے۔ گوتم بدھ کی جائے پیدائش ہونے کا اسے شرف حاصل ہے۔ آج بھی بودھ مذہب کے پیروکار اور عقیدت مندوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ سادھوؤں، سنیاسیوں اور جوگیوں کی یہ پسندیدہ سرزمین ہے۔

گورکھپور میں مسلم تہذیب کے اثرات سید سالار مسعود غازی کی فتوحات کے بعد ہی نمایاں ہونے لگے تھے۔ اگرچہ عہد مغلیہ سے قبل مسلم تہذیب کے حوالہ سے اس کی کوئی اہم شناخت نہیں بن سکی تھی۔ اکبر نے اس شہر پر خاص توجہ دی اور انتظامی وحکومتی امور کی انجام دہی کے لیے اسے مختلف حصوں میں تقسیم کیا اورنگ زیب نے بھی اسے عنایت خاص سے نوازا۔ برطانوی سامراجی عہد میں اہالیان گورکھپور جذبہ حریت اور آزادی کی جدوجہد میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ علم وکمال، تہذیب وثقافت اور ادبی ذوق کے لیے گورکھپور خاصا معروف ہے۔

گورکھپور میں تعلیمی بیداری اور ادبی تحریک کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر میں ہو چکا تھا۔ اپنی ملازمت کے سلسلے میں سرسید احمد خاں یہاں قیام پذیر ہوئے، نارمل اسکول میں سرسید نے یادگار لکچر دیئے، خوابیدہ قوم نے انگڑائی لی، سرسید کے مشہور مخالف علی بخش شرر بدایونی بھی یہیں مقیم تھے۔ دونوں کے حامیان اور مخالفین کے جلسہ، اجتماعات اور معرکہ آرائیوں نے گورکھپور کے باشندوں کے قومی شعور کو بیدار کیا، ڈپٹی نذیر احمد کی آمد نے یہاں کے ماحول کو دوآتشہ کر دیا، مولوی سبحان اللہ فخر وعظیم گورکھپوری جیسے مربیان علم و ادب کی موجودگی نے ادبی فضا بندی کی، ریاض خیرآبادی عشرت گورکھپوری، عنبر گورکھپوری، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری نے گورکھپور کو ادب کا مستقل مرکز بنا دیا، منشی پریم چند اور مہدی افادی کی

موجودگی نے نثر نگاری کے میدان کو وسیع کیا۔ گورکھپور کی سرزمین سے قد آور ادبا، شعراء، نقاد اور افسانہ نگاروں کی ایک ایسی نسل سامنے آئی جس نے اردو ادب کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔

یہ تھا، گورکھپور کا وہ ادبی ماحول جس میں عثمانی صاحب نے شعور کی آنکھیں کھولیں، ثانوی تعلیم یہاں مکمل کی۔ یہ آزادی سے قبل کا زمانہ تھا۔ گورکھپور میں دو مشہور دانش گاہیں تھیں، جارج اسلامیہ کالج اور اینڈریوز کالج دونوں کا ماحول خالص علمی اور ادبی تھا۔ جویان علم اور طالبان فن نے ادبی رنگ و نور کی برسات کر دی تھی، ڈیبیٹ، مباحثے، شعری نشستیں دونوں کالج اور معزز شہریوں کی سرشت بن چکی تھیں۔

عثمانی صاحب اپنے گاؤں سے شہر منتقل ہوئے تو ان کے لیے یہ ماحول اجنبی اور نامانوس نہیں تھا۔ علم کے موتی جمع کرنے کا آغاز انہوں نے یہیں سے کیا تھا۔ علمی مذاق اور شعری ذوق اور خطاب کے میدان میں جھنڈے گاڑنے کی لگن کو بامراد کرنے کے مواقع گورکھپور میں متوفر تھے۔ ہمدرد ایجنسی میں حکیم ابوالکلام صاحب کا ذوق بھی ادبی تھا۔ ہم مذاقی نے آپ کی مہم کو آسان کر دیا۔ آپ ایک طرف سیرت کے جلسوں میں واعظ بن کر عوام کی داد و تحسین وصول کرنے لگے۔ خطیبانہ جوہر ایسے ملے کہ خطیب بے بدل بن گئے۔ دوسری طرف گورکھپور کی شعری اور ادبی انجمنوں کے لازمی جز بن گئے، آپ کی شرکت کے بغیر یہ مجلسیں بے رونق معلوم ہونے لگیں، آپ کا بیشتر شعری سرمایہ اسی عہد کی یادگار ہے۔ عثمانی صاحب زخمی کرتے تھے، لیکن بطور تخلص مظہر بھی اشعار میں استعمال کرتے تھے۔ آپ نے زخمی تخلص کا شان ورود بھی بتلایا کہ ''طالب علمی کے دور میں مجروح سلطان پوری سے متاثر تھا، متاثر ہونا صرف ان کی شاعری کی وجہ سے نہیں تھا، میری طرح مجروح بھی فراغت سے قبل ہی مدرسہ سے نکال دیے گئے، انہوں نے بھی میری طرح مولوی، عالم کا امتحان اور طبیہ کالج کا رخ کیا اور فارغ التحصیل ہوئے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ میرے سب سے محبوب استاذ حکیم شکیل احمد شمسی کے ہم نوالہ اور ہم پیالہ تھے۔

عثمانی صاحب گورکھپور کی ادبی انجمن 'مرکز ادب' کے روح رواں اور نائب صدر تھے۔ شہر کی بیشتر ادبی ہستیاں اسی انجمن سے منسلک تھیں آپ کے حلقہ اور معاصرین و بزرگوں میں احمر گورکھپوری، محمود الٰہی، ایم کوٹھیاوی راہی [مشہور افسانہ نگار] مسلم انصاری، وحید اللہ ہندی گورکھپوری، مسلم واحدی، محسن گورکھپوری [طبیب و شاعر] ظفر گورکھپوری، شبنم گورکھپوری، گرگٹ گورکھپوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

گورکھپور میں حکیم عثمانی صاحب کا قیام دو سال سے زیادہ نہیں تھا۔ ذہین اور طباع شخصیتوں کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ سالوں کا فاصلہ مہینوں اور ہفتوں میں طے کر لیتے ہیں ان کا دل و دماغ غضب کا اخّاذ ہوتا ہے۔ مشاہدے کی گہرائی، فکر کی بلندی اور نقاد طبیعت برق رفتاری سے اشیائے محسوسہ اور غیر محسوسہ کو ذہن کے پردے پر مرتسم کر لیتی ہے۔ عثمانی صاحب کی جولانی طبع جلد ہی بے قرار اور بے چین رہنے لگی وہ گورکھپور کے علمی اور ادبی فضا کا عرق کشید کر چکے تھے، ان کا رہوار قلم ٹاپیں مارنے کے لیے بے تاب تھا، لکھنؤ ان کا معہد علمی تھا۔ طالب علمی کا سنہری دور یہیں گزرا تھا، یہاں دوستوں اور رفقا کا دائرہ وسیع تھا سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے آئیڈیل اور مثالی استاذ حکیم شکیل احمد شمسی یہاں تھے۔

حکیم شمسی صاحب دبستان لکھنؤ کے آخری بڑے نمائندہ طبیب تھے۔ آپ کے دست شفا سے لاکھوں مریض صحت یاب ہوئے، اسلامی علوم کے ماہر تھے، علماء اور بزرگان دین کے فیض یافتہ تھے، لکھنؤی اور رامپوری تہذیب کے مرقع تھے، مولانا ابوالحسن علی میاں ندوی سے بڑی قربت تھی، آپ شاعر، مصنف، اچھے صحافی، بہترین منتظم اور مردم ساز تھے، طب یونانی کے علم بردار اور طبّی تحریکوں کے سرگرم اور فعال کارکن تھے۔ آزادی کے بعد طب یونانی کے فروغ و ترویج کے لیے آپ کی خدمات اور کدوکاوش کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حکیم عثمانی صاحب کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور ان کی کردار سازی میں حکیم شمسی کا سب سے بڑا ہاتھ تھا، یہی وجہ ہے کہ عثمانی صاحب کو اپنے استاذ سے بے کراں محبت اور والہانہ عقیدت تھی۔ گزشتہ بیس سالوں میں جب بھی میں عثمانی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ نے اپنے استاذ کا ذکر نہ کیا ہو اور ان کے ذکر میں نہ کھوئے ہوں، لکھنؤ جانے کے لیے عثمانی صاحب بار بار بے قرار ہوئے، ایک فکر انہیں روکے ہوئے تھی۔ ہم نے مانا کہ دلی میں رہیں، کھائیں گے کیا۔

۱۹۵۷ء میں لکھنؤ سے پندرہ روزہ 'برادری' نکلنا شروع ہوا۔ جس کے اہداف و مقاصد بڑے وسیع تھے۔ جلد ہی اس رسالہ نے اردو صحافت کی دنیا میں اپنا مقام بنا لیا۔ اس رسالہ کے خاص مقاصد میں اسلامی اخوت اور مساوات کی ترویج اور صالح سیاسی اور بامقصد اصلاحی لٹریچر کی اشاعت تھا، برادری کے خصوصی شمارے اور سالنامے کافی مشہور ہوئے، عثمانی صاحب نے بھی اپنی صحافتی زندگی کا آغاز اسی رسالے کے انسلاک سے کیا اور رسالہ

کے جوائنٹ ایڈیٹر بنے۔ مجلس ادارت میں تین اہم شخصیتیں شامل تھیں۔ حافظ عبدالحفیظ صدیقی جو برادری کے ایڈیٹر تھے اور اسلامیات کے کالم لکھتے تھے، ادبیات کا موضوع مولانا ابوالمجاہد زاہد کے ذمہ تھا، اداریہ اور فکاہیہ کالم حکیم عثمانی صاحب لکھتے تھے اور شذرات کے تحت حالات حاضرہ پر تبصرہ اور سیاسی مضامین بھی عثمانی صاحب ہی لکھتے تھے۔

صحافتی تاریخ کا یہ سنہری باب اب بند ہو چکا ہے۔ برادری کی فائلیں بھی کمیاب ہیں۔ مولانا ابوالمجاہد زاہد کے گھرانے سے میرے خاندانی مراسم تھے۔ میرے دادا مولانا ابوالخیر صاحب فاروقی سے مولانا ابوالمجاہد زاہد کے قریبی تعلقات تھے، دونوں جماعت اسلامی سے وابستہ تھے، مولانا زاہد کے صاحب زادے ڈاکٹر خالد احمد مرحوم، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ میں میرے ہم جماعت اور دوست تھے۔ غالباً ۱۹۹۶ء میں مولانا سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا، برسبیل تذکرہ میں نے عثمانی صاحب کے بارے میں دریافت کیا، آپ نے بڑی تفصیل سے اس عہد کی باتیں بتلائیں اور پرانی یادوں کو شیئر کیا، لیکن اچانک کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ میں ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تھوڑے سے وقفے کے بعد انہوں نے فرمایا ''اگر عثمانی صاحب سیاست کی پرخار جھاڑیوں میں اپنا دامن نہ پھنساتے اور صرف صحافت پر توجہ دیتے تو مولانا عثمان فارقلیط کے ہم پلہ ہوتے''۔ میں نے کئی بار سوچا کہ رام پور جا کر برادری کے شمارے ان کے پاس سے لے آؤں مگر افسوس، ان کی حیات میں یہ ممکن نہ ہو سکا اور جب گیا تو یہ قیمتی سرمایہ سامان اور مکان کی منتقلی کی نذر ہو چکا تھا، بہرحال 'برادری' کے چند شمارے مجھے مل گئے جن میں عثمانی صاحب کے متعدد مضامین مطبوعہ ہیں، ان کی سیاسی بصیرت، گہری فکر اور اسلوب نگارش تک رسائی کے لیے میں ان کے مضامین کے اقتباسات قارئین کی نذر کر رہا ہوں۔

آزادی کے بعد کانگریس صرف ایک حکمراں پارٹی بن کر ابھری، اقتدار کی ہوس میں وہ اندھی ہو چلی تھی۔ مسلمانوں کے بارے میں ان کے رویہ میں کافی تبدیلی آ چکی تھی، پرانے بادہ خوار اٹھ چکے تھے صرف ایک نہرو کی ذات تھی جن سے مسلمانوں کی امیدیں لگی ہوئی تھیں اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا ہے۔ دیگر سیاسی پارٹیوں کی طرح ان کے قول اور عمل میں بڑا فرق آ گیا تھا۔ یہی وجہ ہے عثمانی صاحب شروع سے کانگریس کے نکتہ چیں رہے، ان کی دوررس نگاہوں نے کانگریس کی بدلتی نظروں کو بھانپ لیا تھا۔ کانگریس کی دوغلی پالیسی پر وہ لکھتے ہیں:

''نہرو کی اقلیت نوازی چاہے کتنی ہی پرکشش کیوں نہ ہو اور کانگریس کا نظریہ جمہوریت خواہ کتنا ہی جاندار کیوں نہ ہو ہمیں تو اسے دیکھنا ہے جو ہمارے ساتھ واقعات اور عمل کی دنیا میں پیش آیا ہے۔ نہرو کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ''گفتہ او گفتہ کانگریس بود'' کا۔ نہرو سینکڑوں مخالفتوں کے باوجود یوپی کی وزارت علیا اپنے کسی منظور نظر کو سونپ سکتے ہیں اور سارے بنگال کی مخالفتوں کے باوجود بیروباڑی پاکستان کو منتقل کر سکتے ہیں مگر وہ اُردو کو اس کا غصب شدہ حق واپس نہیں دلا سکتے۔ مسلمانوں کے ساتھ زیادتیوں اور بے انصافیوں کا سدباب نہیں کر سکتے۔ کہنے کو نہرو سارے ہندوستان کے ڈکٹیٹر ہیں مگر مسلمانوں کے معاملات میں زبانی تسلیوں اور لفظی غمگساریوں کے سوا ہر معاملہ میں بے بس و مجبور!''

وہ مسلم لیڈران کی مصلحت پسندی اور مجرمانہ بے حسی پر رقمطراز ہیں:

''جب فری پریس جنرل، ہندوستان ٹائمز، اسٹیٹمین، نیشنل ہیرالڈ اور بلٹز جیسے غیر مسلم اخبارات درد و کراہ کی روشنائی سے اپنے ادارتی کالموں کا پیٹ بھر رہے تھے نیز جب ڈانگے، بھوپیش گپتا اور انتھونی، ظلم و بربریت کے خلاف بیانات دے رہے تھے۔ کچھ لوگ 'ردائے وزارت' تانے ہوئے استراحت فرما رہے تھے۔ یہ انزیل حافظ حمد ابراہیم ہیں، یہ سید ہمایوں کبیر ہیں، یہ کیپٹن شاہ نواز ہیں یہ جناب عابد علی، یہ احمد محی الدین اور یہ مسٹر سعادت علی خاں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں...''۔

جبل پور میں بھیانک فرقہ وارانہ فساد ہوا تھا، سیاسی رہنماؤں نے چنگاری کو شعلہ بنانے میں بدترین رول ادا کیا۔ عثمانی صاحب ''تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں'' کے عنوان سے حقائق سے پردہ اٹھاتے ہیں:

''محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا واسطہ ایک ایسی قوم سے آ پڑا ہے جس کی گھٹی میں اگر ہندوستان کے سارے مسلمان اپنا آخری قطرۂ خون بھی ٹپکا دیں تو بھی ان کی ''رواداری'' مشکوک ہی رہے گی۔ میجر ہڈسن کی ظالمانہ ذہنیت سے بڑھی چڑھی پولیس جب مسلمانوں کے جان و مال کو تباہ و برباد کرنے میں خود بھی چنگیز و ہلاکو کا پارٹ ادا کرنے لگے تو مسلمان یہ کیونکر سوچیں کہ آبرو کی حفاظت کا یہ تاریک ترین دور کبھی اچھے مستقبل سے بدل بھی سکے گا...''۔

عثمانی صاحب کے قلم کا زور دیکھیے اور ملت کا درد، کن الفاظ میں وہ بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی مسلمانوں کو صبر کی تلقین کرتے ہیں فسطائی طاقتوں کو کس انداز میں جرح کرتے ہیں۔ آپ کی یہ حروف یقیناً آب زر سے

لکھے جانے کے لائق ہے:

''مسلمانوں کو ہندوستان چھوڑ دینے کی دھمکی دینے والے یہ مہا سبھائی، جن سنگھی، راشٹریہ سیوکی، آریہ سماجی، شیوائی، دیانندی، شردھانندی، ٹنڈنی، سمپورنائی اور کاٹجوئی، مسلمانوں کو صرف اورنگ زیب بابر اور شاہجہاں کے روپ میں دیکھتے آئے ہیں، یہ ابھی بلالؓ، صہیبؓ، عمارؓ، اور سمیہؓ کے کردار سے آشنا نہیں ہیں آج یہی زندگیاں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں...''

عثمانی صاحب مسلمانوں کی تنظیموں اور ان کی کارکردگیوں سے بھی نالاں ہیں وہ قوم کے غم میں ڈوب کر جمعیۃ العلماء اور ان جیسی دیگر تنظیموں کو صحیح راہ کی رہنمائی کرتے ہیں، ان کے غلط طریقہ کار کی نشان دہی کرتے ہیں، انہیں بیدار کرتے ہیں، چنانچہ جمعیۃ علماء ہند کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آزادی کے قبل جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ جتنی روشن تھی آزادی کے بعد اتنی ہی تاریک ہوگئی اگر حادثہ ۴۷ء کی چند روزہ جدوجہد کو حذف کردیا جائے تو اس پورے چودہ سالہ دور میں جمعیۃ کا وجود اس ضعیف صد سالہ کا مثل بن جاتا ہے جو اپنے دورِ شباب کے اندوختہ پر بڑھاپے کی زندگی گزار رہا ہو— تقسیم ملک کے بعد مسلم لیگ اپنا بوریہ بستر باندھ کر پاکستان کی راہ لے چکی تھی اس پورے برصغیر ہند کی مسلم سیاست کے افق پر صرف جمعیۃ علماء کا علم لہرا سکتا تھا...''۔

وہ جمعیۃ علماء ہند سے مایوس نہیں ہیں اچھی امید بھی لگائے بیٹھے ہیں چنانچہ تبدیلی کے آثار کے تحت لکھتے ہیں۔

''اجین کانفرنس کی کارروائیوں سے جمعیۃ علماء کی ذہنی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب 'نیاز مندی' کے چلمن سے باہر نکل کر خود کو مسلمانوں کی عام محسوسات سے ہم آہنگ کرنا چاہتی ہے کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کے جنرل سکریٹری مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے جبل پور وغیرہ کے فسادات پر جس انداز میں تقریر کی ہے وہ کافی حد تک زوردار اور حکومت بیزار معلوم ہوتی ہے۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ حکومت کی انتظامیہ کے ارباب اثر کی مسلم دشمنی سے متاثر ہوکر مولانا نے کانگریس سے علیحدگی اور جمعیۃ علماء کو 'اینٹی کانگریس' پوزیشن میں لانے کی دھمکی بھی دی ہے ممکن ہے جمعیۃ کی اس ذہنی تبدیلی پر بعض دیگر عوامل بھی اثر انداز ہوئے ہوں اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جمعیۃ علماء کی مخالفتوں کے باوجود کیرالہ میں کانگریس مسلم لیگ سمجھوتہ سے مولانا کو یہ باور ہوگیا ہو کہ کانگریس کے نزدیک 'مضبوط دشمن' کی قدر اس دوست سے زیادہ ہے جو کمزور اور ناتواں ہو ظاہر بات ہے کہ جماعتوں کی طاقت وتوانائی کا دوسرا نام 'عوامی مقبولیت ہے'— لیکن محض گفتار کا غازی بن جانے سے عوامی مقبولیت اور ہردلعزیزی حاصل نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو ناپائیدار۔ پھر جمعیۃ علماء کے لیے یہ کام اور بھی مشکل ہے کیوں کہ اس نے اپنے آپ کو کانگریس کا ضمیمہ بنا کر اپنی ساخت کو مجروح کرڈالا ہے اس جراحت کا اندمال اور اس میں خون کی نئی گردش اسی وقت ممکن ہے جب جمعیۃ علماء عملی دنیا میں جرأت مندانہ پالیسی اختیار کرے''۔

جمعیۃ علماء کو تنگ نظری ختم کرکے دوسری مسلم تنظیموں سے مصالحانہ رویہ اپنانے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''مسلمانوں کے اندر چند دیگر تنظیمیں بھی ابھر رہی ہیں اس میں بعض ایسی ہیں جن کا میدان فکر بڑا وقیع اور وسیع ہے ان کی قیادتیں توانائی کی منزلیں نمایاں طور پر طے کررہی ہیں جمعیۃ اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ جذبۂ مسابقت بڑی مسعود علامت ہے مگر رقابت اتنی ہی مذموم، یہ تسلیم کہ یہ ایک فطری کمزوری ہے مگر جمعیۃ علماء میں اس کمزوری کا گھر کرجانا بہت بڑی کمزوری ہے 'وشاورھم فی الامور' اور 'رحماء بینھم' کی تلاوت کرنے والوں کا ظرف اس سے بہت بلند ہونا چاہیے— دینی تعلیم کے مسئلہ پر بستی میں مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی وہ بڑی خوش آیند تھی مگر علاحدگی پسندی کے رجحانات اور چودھراہٹ کی جھوٹی پیاس نے اس اچھے عنوان کو ایک بری تمہید کا شکار بنادیا۔ اس سلسلہ میں جمعیۃ کی غلط روش پوری طرح محسوس کی گئی''۔

مذکورہ بالا یہ اقتباسات پندرہ روزہ 'برادری' جلد۴، شمارہ ۶، مجریہ ۱۵ مارچ ۱۹۶۱ء صفحہ ۵-۱۳ سے ماخوذ ہیں۔

برادری سے وابستگی عثمانی صاحب کا سب سے بہترین دور تھا وہ لمحات یادگار تھے، برادری کا حلقہ، کالم نگاران تحریک اسلامی سے متاثر تھے، خود آپ کے استاذ حکیم شکیل احمد شمسی اسی تحریک سے متاثر تھے، برادری کے لکھنے والوں میں مولانا علی میاں، مولانا منظور احمد نعمانی، قاضی سجاد میرٹھی، مفتی محمد شفیع، مولانا ابوالمجاہد، شبنم سبحانی اور طالب ہاشمی وغیرہ تھے۔

آپ کے دوستوں میں مولانا ابوالمجاہد شاعر اسلام قرار پائے، ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی تحریک اسلامی کے معتبر قلم کار بن گئے مگر عثمانی صاحب نے اپنی صحافتی اور تخلیقی صلاحیت کو اپنے ہاتھوں دفن کردیا، شوق

سیاست کی نظر اسے کھا گئی۔

حالانکہ دلی آنے کے بعد ان دنوں کو وہ بڑی حسرت سے یاد کرتے تھے، ادبی ماحول اور سیر وتفریح کا ذکر سینکڑوں بار کرتے۔ کہتے سارا دن بڑی بی کو سنیما دکھانے کے باوجود وقت اور پیسہ بچا رہ جاتا۔ جب عثمانی صاحب بہت ناراض اور غصہ ہوتے تو کوئی شخص لکھنؤ یا گورکھپور کا قصہ چھیڑ دیتا اور ان کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔

۱۹۶۴ء تک آپ لکھنؤ ہی میں صحافت کے پیچ وخم میں الجھے رہے، وقت خود آپ کی منزل کی تعیین کر رہا تھا، ایک راہ سے دوسری راہ نکلتی جارہی تھی، ایک دن استاذ محترم نے حکم دیا دلی چلے جاؤ اور جامعہ طبیہ میں تدریسی خدمات انجام دو۔ آپ کے لیے یہ بڑا اعزاز تھا، استاذ کا حکم بھی نہیں ٹال سکتے تھے۔ صحافتی زندگی کو خیر آباد کہا اور ۶/اپریل ۱۹۶۴ء کو طبیہ کالج میں بحیثیت انچارج اسپتال اور شعبہ معالجات میں بطور لکچرر اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

دہلی میں قیام اور رہائش کا مسئلہ بڑا دشوار تھا۔ اردو کے مشہور صحافی اور سہ روزہ 'دعوت' کے ایڈیٹر مولانا محمد مسلم صاحب سے ذاتی تعلقات تھے، ان سے اس مسئلے کا ذکر کیا مسلم صاحب نے چٹکی بجاتے اس مسئلہ کو حل کر دیا اور پیش کش کی تم ہم لوگوں کے ساتھ رہ جاؤ۔ دعوت کے بیشتر قلم کاروں سے پہلے ہی سے واقفیت تھی، آپ ان لوگوں کے ساتھ قیام پذیر ہوگئے، مسلم صاحب کھانا آپ کو ساتھ لے کر کھاتے تھے، لطف کی بات یہ ہے آپ مسلم صاحب اور ان کے رفقاء کے مضامین پر تنقید بھی کیا کرتے تھے اور ان کی تردید میں مضامین بھی لکھتے تھے۔ عثمانی صاحب ان اصحاب کی اعلیٰ ظرفی کا اکثر تذکرہ کرتے تھے، کچھ دنوں کے بعد کرایہ کا مکان مل گیا تو آپ اس میں منتقل ہوگئے، اہل وعیال ساتھ نہیں تھے، اس لیے کھانے کی تکلیف ضرور ہوتی تھی، جواہر ہوٹل، جامع مسجد میں پیشگی پیسہ جمع کرا دیتے اور وہیں کھانا کھانے لگے۔ عثمانی صاحب کا بیان ہے کہ عید کے دن جواہر ہوٹل بند رہتا تھا، غیرت نے گوارہ نہ کیا کہ کسی واقف کار کے گھر پر دستک دیں، جیب بھی خالی تھی، بالآخر صبر کر لیا اور عید کا دن یوں ہی گزار دیا۔

جامعہ طبیہ میں آپ کی دہری ذمہ داریاں تھیں، معالجات پڑھاتے تھے اور شفا خانہ کے انچارج یعنی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ بھی تھے۔ آپ کے عہد میں اسپتال کی رونق واپس لوٹ آئی تھی، مریضوں میں بے پناہ اضافہ ہوا، آپ کی مہارت وحذاقت اور مریضوں کا ازدہام دیکھ کر حکیم عبدالحمید صاحب آپ سے کافی متاثر ہوئے اور ۱۴/ستمبر ۱۹۶۴ء کو انہوں نے آپ کو فرسٹ گریڈ لکچرر معالجات مقرر کر دیا۔

طبیہ کالج میں آپ نے اپنی زندگی کے بہترین ایام گزارے۔ اس زمانے میں تین نوجوان اساتذہ حکیم مظہر سبحان عثمانی، حکیم سید ظل الرحمٰن اور حکیم شجاع الدین ہمدانی کا مثلث بڑا مشہور ہوا، تدریس کے بعد تینوں ایک ساتھ ٹہلنے نکلتے، ایک ساتھ علمی اور ادبی مجلسوں میں شریک ہوتے، حکیم شجاع الدین صاحب نہایت سادہ لوح اور سیدھے سادے تھے، ان سے چھیڑ چھاڑ میں وقت گزرنے کا پتہ نہ چلتا، عثمانی صاحب شجاع الدین صاحب کی سادگی اور بھول پن کے قصے لطف لے کر سناتے، ایک دن میں درمیان میں بول پڑا تو مجھے ڈانٹ دیا اور کہا: 'تمہیں بولنے کا حق نہیں ہے، وہ میرے دوست ہیں، میں ان کی بے حد عزت کرتا ہوں۔' حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب کی منکسر المزاجی، اساتذۂ کرام کی خدمت میں حاضری، لکھنے کے معمول میں استقلال اور سحر خیزی کے تذکرے اکثر کرتے تھے۔

ستمبر ۱۹۶۹ء میں حکیم اجمل خاں کی تاریخی یادگار ''ہندوستانی دواخانہ میں بطور 'انچارج حکیم' آپ کا تقرر ہوگیا تو آپ جامعہ طبیہ سے مستعفی ہوگئے، نومبر ۱۹۷۰ء میں آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج چلے آئے اور لیکچرر [معالجات، گریڈ اول] اور انچارج اسپتال [یونانی] کی ذمہ داریاں آپ نے سنبھالیں۔ ۱۹/جنوری ۱۹۷۹ء میں آپ سینئر لکچرر اور صدر شعبہ معالجات کے منصب پر فائز ہوئے اور طویل ملازمت کے بعد ۳۰/جون ۱۹۹۸ء میں آپ یہیں سے ریٹائر ہوئے۔ طبیہ کالج بورڈ نے اپنی میٹنگ بتاریخ ۳۰ اپریل ۱۹۹۸ء میں پروفیسر ایمریٹس کے اعزاز سے سرفراز کیا۔

طبیہ کالج میں دوران تدریس آپ نے کافی نشیب وفراز دیکھا، مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے، حق گوئی سے انحراف آپ کے لیے ممکن نہیں تھا۔ بے باکی اور بے خوفی سرشت میں داخل تھی، سب کچھ ہنستے ہوئے جھیل گئے۔ طلبا میں بے پناہ مقبولیت، قائدانہ صلاحیت، مطب میں مریضوں کا ہجوم حاسدین کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا، سازش کے تانے بانے بنے گئے اور اور آپ کو سسپنڈ کروا دیا گیا۔ آپ نے خندہ پیشانی سے معطّلی

کا استقبال کیا۔ آپ کے سر پر گھریلو ذمہ داریاں تھیں، کثیر العیال تھے۔ یہ وقت آپ پر بہت سخت تھا، مگر حرف شکایت زبان پر نہیں لائے۔ بالآخر مصائب کے یہ ایام بھی کٹ گئے۔ حکیم عبدالحمید صاحب کو خبر لگی تو انہوں نے آپ کی خدمات یومیہ لکچر کے حساب سے حاصل کر لیں۔ کچھ عرصہ بعد آپ اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ میں بحیثیت لکچرر معالجات اور طبیب شفاخانہ تشریف لے گئے۔ ۱۹۷۸ء میں جنتا پارٹی برسر اقتدار ہوئی تو آپ کی معطّلی بحال کر دی گئی، علی گڑھ میں ویسے بھی آپ کا دل نہیں لگ رہا تھا، آپ دلی واپس آ گئے۔ ایک دن میں نے سوال کیا: آپ نے علی گڑھ جیسے علمی مرکز کے بجائے دہلی کو کیوں ترجیح دی؟ [میں اس وقت علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا، میرے نزدیک علی گڑھ سے بہتر کوئی علمی جگہ نہیں ہو سکتی تھی،] جب کہ علی گڑھ کا ماحول دہلی کے بہ نسبت زیادہ پرسکون اور علمی ہے۔' ہنس کر کہنے لگے: ''دہلی کی نیرنگی کا مقابلہ دوسرا شہر نہیں کر سکتا ہے، ویسے بھی علی گڑھ صرف فکر کی جگہ ہے اور دہلی عمل کی جگہ ہے، دہلی میں رہ کر میں طب کی خدمت زیادہ بہتر طور سے کر سکتا ہوں، اس کے علاوہ آپ نے علی گڑھ کے نفاقی مزاج کے کچھ قصے سنائے، جن کا ذکر نہ میرا موضوع ہے اور نہ ہی مناسب ہے۔

آپ کا طریقۂ تدریس نرالا تھا، دوران لیکچر فضولیات اور قصے کہانیوں سے پرہیز کرتے تھے، آپ علم کے موتی رولتے تھے اور طلبا اپنے اپنے دامن میں سمیٹے جاتے تھے اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ آپ علوم شرقیہ کے ماہر تھے، بے مثل خطیب تھے۔ موضوع پر مکمل عبور حاصل تھا، جدید طبّی پیش رفت سے بھی واقف تھے، قدیم و جدید کے درمیان تطبیق کا ملکہ حاصل تھا، جب کسی موضوع کو اٹھاتے تو اس کے مالہ و ماعلیہ کو دل نشیں انداز میں اس طرح بیان کرتے کہ طلباء مطمئن اور خوش ہو جاتے، طلبا کبھی آپ کے لکچر کو نہیں چھوڑتے تھے، طلبا کے مابین آپ کی تدریس کی مقبولیت کا اندازہ اسی واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف سیاسی چالوں سے آپ کا تبادلہ طبیہ کالج سے دوبارہ ہندوستانی دواخانہ میں کر دیا گیا تو طلباء نے زبردست احتجاج کیا اور باقاعدہ تحریک چلائی، چار ماہ تک کالج بند رہا، بالآخر طلبہ کے مطالبہ کے آگے انتظامیہ کو جھکنا پڑا۔

آپ کی تدریس کے بارے میں اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں میں اکثر بیشتر اتوار کی چھٹی گزارنے آپ کے گھر چلا آتا۔ ۱۹۹۹ء میں عثمانی صاحب کو عارضہ قلب لاحق ہوا، آپ میٹروہاسپٹل لاجپت نگر میں داخل تھے، ڈاکٹروں نے بولنے سے منع کر رکھا تھا، میں عیادت کے لیے آیا میں تین دن تک آپ کے پاس رہا، آپ نے ان اوقات میں مجھے امراض قلب سے متعلق یونانی تشخیص، علاج اور معمول مطب از بر کرا دیا۔

تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیقی اصولوں پر آپ کو کامل دسترس تھی، امراض کی ماہیت اور اسباب کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت مدلل انداز میں اصول علاج مرتب کر دیتے تھے تدریس کی مدت میں آپ نے ساٹھ سے زائد تھیسز کی توقیت کی۔

مطب اور معالجہ کے بارے میں حکیم اجمل خاں کی شخصیت آپ کے لیے مشعل راہ تھی۔ اس بارے میں آپ سب سے زیادہ انہیں سے متاثر تھے اور انہیں کے طریقہ کار کے مطابق مطب کے ذریعہ یونانی کے وقار کو بحال کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے، جامعہ طبیہ سے وابستگی کے دوران بہت ہی کم مدت میں آپ کا مطب مرجع خلائق بن گیا۔ آپ نے جب ہندوستانی دواخانہ کی ذمہ داری سنبھالی تو اس کی حالت انتہای خستہ اور ناگفتہ بہ تھی، دراصل تقسیم ہند کے نتیجہ میں مسلمانوں کے علوم وفنون کے سرمایہ پر کاری ضرب پڑی۔ طبیہ کالج بھی متاثر ہوا، زیادہ تر طلباء اور اساتذہ پاکستان ہجرت کر گئے، کالج کی لائبریری نذر آتش کر دی گئی۔ کالج پر پناہ گزینوں کا قبضہ تھا، عثمانی صاحب نے مرثیہ خوانی کے بجائے عملی اقدام کا آغاز کیا اور حکیم اجمل خاں کی اس تاریخی یادگار کو کسمپرسی کی بھنور سے نکالنے کا عزم کر لیا۔ وہ دواخانہ جس کی آمدنی ۱۹۲۷ء میں سوا لاکھ سے متجاوز تھی وہاں مریضوں کا کال تھا اور اور آمدنی محدود۔ آپ کی آمد کے بعد ایک بار پھر مریضوں کی بھیڑ ہونے لگی۔ دور دراز سے لوگ علاج کے لیے آنے لگے اور اجملی عہد کی رونقیں واپس لوٹنے لگیں۔

عثمانی صاحب ہندوستانی دواخانہ سے جب طبیہ کالج منتقل ہوئے تو وہاں بھی آئی پی ڈی کا یہی حال تھا۔ ہوکا عالم تھا، سناٹوں کی ہلچل تھی، قبرستان کی ویرانی تھی، نہ مریض تھے نہ ڈاکٹر، نہ ماہرین طب اور نہ طالبان فن تھے۔ طلباء بغیر عملی تجربہ کے فارغ ہو رہے تھے۔ یہ اس کالج کے اسپتال کا حال تھا جو عہد اجملی میں معیار میں کسی بھی میڈیکل کالج سے کم نہیں تھا

اوراس کی طبّی خدمات کے چرچے ملک اور بیرون ملک میں ہوتے تھے۔

عثمانی صاحب نے اسپتال کے انچارج کی ذمہ داریاں سنبھالیں نظم ونسق درست ہوا۔حکیموں کے چہرے نظر آنے لگے، نرسوں کی چہل پہل سے اسپتال میں زندگی لوٹ آئی، مریضوں کا ہجوم ہوا۔ سیریس مریضوں کو داخل ہسپتال کیا جانے لگا۔طلباء طب کے عملی تجربات میں اضافہ ہونے لگا اور صحیح معنی میں وہ طبیب کہلانے کے حق دار ہونے لگے۔ یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ عثمانی صاحب نے حکیم اجمل خاں کی روایات کو زندہ اور تابندہ کرنے میں اہم رول ادا کیا۔طب یونانی کی افادیت اور اہمیت اور اثر انگیزی کو حکومتی ایوانوں میں متعارف اور محسوس کرایا۔

عثمانی صاحب کے مریضوں میں امرا، غربا، شرفا، حکومت کے اعلی عہدیداران، افسران، سیاست کے قائدین غرضیکہ ہر قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ بی جے پی کے رہنماء دہلی کے سابق وزیر اعلی مدن لال کھورانہ کا پورا گھرانہ آپ سے علاج کرواتا تھا۔آپ کا مطب مایوس مریضوں کی امید گاہ بن چکا تھا، مشاہیر دہلی آپ کی مسیحائی کے معترف تھے۔چنانچہ پرنسپل طبیہ کالج کوی راج برہم دت شرما نے ان الفاظ میں آپ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے:

> ''طبیہ کالج ہسپتال میں اُن کے پاس مریضوں کی بھاری تعداد کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے کہ آج سے بہت پہلے کے روایتی طرز کے حکیموں کے مطب میں مریضوں کا ہجوم ہے۔''

آپ کے نسخے کم اجزا اور سہل الحصول ادویہ پر مشتمل ہوتے تھے، اسی لیے عوام میں آپ سستی دوائی والے حکیم جی کے نام سے مشہور تھے۔ طریقۂ علاج خالص بقراطی نہج پر مبنی ہوتا تھا، جس پر دبستانِ لکھنؤ کی چھاپ تھی، علاج بالمفردات میں کمال حاصل تھا، کبھی کبھی دہلوی اسکول کے طرز پر نسخے اختراع کر لیتے تھے، آپ کی تشخیص بے خطا تھی، آیورویدک علاج سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔اتوار کو گھر پر مطب کرتے تھے اور اس کی آمدنی اپنے مصرف میں لاتے تھے۔سبک دوشی کے بعد قرول باغ میں اپنا ذاتی مطب کھول لیا تھا، مطب کا افتتاح مدارس کے بچوں کے قرآن خوانی سے کروایا۔یہ کام آپ کے عزیز شاگرد ڈاکٹر اسلم جاوید نے خوش اسلوبی سے کیا۔

ہندوستان کی طبی تاریخ حکیم اجمل خاں اور طبی کانفرنس کے ذکر کے بغیر نامکمل اور ادھوری رہے گی۔ برطانوی سیاسی تسلط کے بعد مشرقی تہذیب اور مشرقی علوم پر ان کی یلغار ہوئی، حکیم اجمل خاں نے اس خطرہ کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا اور اس کے تدارک کی تدبیر سوچ لی تھی۔انھوں نے ۱۹۰۶ء میں اطبا کی تنظیم قائم کردی۔ ۱۹۱۰ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان میں دیسی طب پر پابندی عائد کردی، اس وقت آپ کی قائم کردہ تنظیم آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی کانفرنس میدان عمل میں آگئی۔طب کی بقا اور اس کے حقوق کی بازیابی کی جدوجہد شروع کردی۔ اس تنظیم کی اہم خصوصیت اس کا قومی اتحاد تھا۔ ملک کی تقسیم کے ساتھ یہ تنظیم بھی منقسم ہوگئی۔۱۹۵۲ء میں حکیم الیاس صاحب کی سرپرستی میں حکیم عبدالحمید صاحب نے تشکیل نو کا بیڑہ اٹھایا۔ان کی مقناطیسی شخصیت اور مالی سرپرستی نے تنظیم میں نئی روح پھونک دی۔

۱۹۵۹ء میں عثمانی صاحب پہلی بار منعقدہ علی گڑھ کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔اپنے مشفق استاذ کی خواہش پر ۱۹۶۶ء میں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس ورکنگ کمیٹی کے ممبر بنے۔عرصۂ دراز تک طبی کانفرنس کی صوبائی تنظیم کے وائس پریسیڈنٹ اور بعد میں پریسیڈنٹ منتخب ہوئے۔ یہ طبی پلیٹ فارم آپ کے تحریکی مزاج سے ہم آہنگ تھا۔اس تحریکی مزاج کے جلوے وہ زمانۂ طالب علمی میں خوب دکھا چکے تھے۔تکمیل الطب لکھنؤ میں طلبا کی یونین کا صدر وائس پرنسپل ہوتا تھا۔حکیم عثمانی صاحب نے باقاعدہ تحریک چلائی کہ یونین کا صدر بھی طالب علم کو ہونا چاہیے۔خوب ہنگامے ہوئے آخر میں حکیم صاحب کو کامیابی ملی، حکیم مسیح الزماں ندوی اس وقت وائس پرنسپل تھے، انھیں طلبا کی یونین کی صدارت سے محروم ہونا پڑا۔ ان کو بدگمانی تھی کہ یہ تحریک حکیم شکیل شمسی صاحب کے اشارے پر شروع کرائی گئی، انھوں نے اس بات کو گرہ میں باندھ لیا۔اس کا کچھ خمیازہ عثمانی صاحب کو بھگتنا پڑا اور تحریک ابنائے قدیم تکمیل الطب پر بھی منفی اثرات پڑے۔

حکیم عبدالحمید صاحب کے زیر سرپرستی آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس شاہراہ ترقی پر گامزن تھی۔عثمانی صاحب حکیم عبدالحمید صاحب کے معتمد تھے، ان کے مشوروں کی حکیم عبدالحمید صاحب بڑی قدر کرتے تھے۔ ہر اہم معاملہ میں عثمانی صاحب سے مشورہ لیتے، کانفرنس کے سالانہ اجلاس کا انعقاد، اسٹیج کا انتظام اور اطباء کے استقبال کی پوری ذمہ داری عثمانی صاحب اور حکیم عبدالرزاق کی ہوتی تھی۔

آل انڈیا طبی کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ملک کے طول وعرض

سے اطبا آتے اور جوش وخروش سے شرکت کرتے، درپیش مسائل پر بحث ہوتی، تجاویز پیش ہوتیں، انھیں عملی جامہ پہنانے کے لیے لائحہ عمل اور منصوبے تیار کیے جاتے۔ مسائل کو عوامی سطح پر اٹھایا جاتا، ایوانِ اقتدار میں انھیں پیش کیا جاتا۔ تقریباً گزشتہ پانچ دہائیوں میں شاید ہی ایسا کوئی اجلاس رہا ہو، جس میں عثمانی صاحب اسٹیج کی زینت نہ بنے ہوں۔ حکیم عبدالحمید صاحب آپ کے خطیبانہ جوہر کو کانفرنس کے لیے پوری طرح استعمال کرتے۔ عثمانی صاحب ایسی جوشیلی تقریر کرتے کہ پورے مجمع پر سناٹا طاری ہوجاتا، دلوں کو مسخر کرنے کا ہنر انھیں معلوم تھا، 'ان لمن البیان سحرا' کی عملی تصویر بن جاتے۔ اندازِ بیان ایسا ہوتا کہ جیسے 'میں نے جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے'۔ حکومتی نمائندوں پر ایسا اثر ہوتا کہ مسئلہ کے حل کا فوراً ارادہ کر لیتے۔

طبی نصاب میں انٹی گریشن کے خلاف تحریک کے آپ روح رواں تھے، اس کے لیے آپ نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا، ہر جگہ شعلہ بار تقریر کیں، آج اس شہر میں ہیں، کل دوسرے شہر میں۔ مسلسل اسفار اور لگاتار خطابات اور تقاریر نے آپ کی صحت پر برا اثر ڈالا اور آپ کو بول الدم کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ اپنی صحت اور جان کی پرواہ نہ کی، آپ نے پورے ملک میں اطبا کا ایک محاذ بنادیا آخر کار اپنے مطالبات کو منوا کر ہی دم لیا۔ اسی تحریک کا نتیجہ ہے کہ آج یونانی نصاب میں قدرے طبی موضوعات باقی رہ گئے ہیں۔ اس تحریک کی زد میں 'کانفرنس' بھی آئی مگر عثمانی صاحب اپنے نقطۂ نظر سے دست بردار نہیں ہوئے۔

اسی طرح کا ایک اور تاریخی واقعہ ہے۔ عثمانی صاحب ابتدا سے لکھنوی اسکول کی نمائندہ تھے، طبی امتیازات، یونانی نظام میں اس کے تشخص اور اس کے علاحدہ اور مستقل طب کے علم بردار تھے۔ اس نظریہ پر وہ سختی سے قائم تھے۔ کبھی کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے۔ ایک میٹنگ میں اختلاطِ نصاب کے مسئلہ پر اپنے مربی شمسی صاحب کی رائے کو آپ نے مسترد کردیا اور اپنی رائے کی توثیق کروالی۔ وقتی طور پر استاذ محترم دل برداشتہ ہوئے مگر باہر نکلے تو وہی شاگردانہ نیازمندی، جس سے شمسی صاحب متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور آبدیدہ ہوگئے۔

حکیم عبدالحمید صاحب کی وفات کے بعد کانفرنس کی ذمہ داری حکیم مختار احمد اصلاحی اور ان کے بعد حکیم محمد طیب صاحب کے سر آگئی۔ حکیم طیب صاحب کے عہد میں بھی عثمانی صاحب نے کانفرنس کو مزید فعال بنانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ صوبائی سطح پر آپ نے وائس پریسیڈنٹ اور پریسیڈنٹ کی ذمہ داری کو خوش اسلوبی اور خوش سلیقگی سے نبھائی، خطوط کا جواب خود لکھتے، لائحہ عمل تیار کرتے، دہلی میں بی جے پی کی حکومت آئی تو اپنے سیاسی اثر ورسوخ کو کانفرنس کو فیض پہنچانے کے لیے وقف کردیا۔ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج کے بارے میں حکومت کے ایک اہم منفی منصوبہ کو رکوا دیا اور اسے بہت سی مراعات دلوائیں۔

عثمانی صاحب کی زندگی کا ایک سنہری خواب اور سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ حکیم اجمل خاں کی یادگار کو یونیورسٹی کا درجہ دلوادیں۔ آپ نے حتی الوسع بھاگ دوڑ کی۔ صوبہ دہلی اور مرکز میں ایک ہی پارٹی کی حکومت نہ ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہوسکے۔ حیف کہ آپ کا یہ خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ آپ دہلی کی وزیراعلیٰ شیلا دکشت سے بھی ملے۔ سرکاری لہجہ میں یقین دہانی کرائی۔ وہ اپنی مشعل اگلی نسل کے ہاتھوں میں دے کر دنیا سے رخصت ہوگئے۔ شاید کوئی جیالا اٹھے اور یہ چوٹی سر کرلے۔

حکیم صاحب اجمل خاں کے مشن کے مشعل بردار تھے اور طب کے دونوں اسکول کے درمیان پل کا کام انجام دیتے رہے۔ کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ظرافت اور بذلہ سنجی کی افشاں بکھیرتے رہے۔ کانفرنس کی مجلسوں میں حکیم عبدالرزاق، حکیم خلیفۃ اللہ، حکیم فیضان احمد، حکیم سیف الدین احمد اور دیگر اکابر اطبا کا حلقہ ہوتا، عثمانی صاحب اپنی ظرافت کے فوارے چھوڑتے اور محفل کو زعفران زار بنادیتے تھے۔ افسوس کہ آج یہ عظیم تنظیم اطبا کی غفلت اور بے توجہی کا شکار ہوکر آخری سانسیں لے رہی ہے۔ حالاں کہ سی سی آر یو ایم اور دیگر طبی تنظیموں کی جنم داتا یہی تنظیم ہے۔

سی سی آر یو ایم سے عثمانی صاحب کو دلی لگاؤ تھا۔ اس کے تاریخِ قیام سے ہی آپ اس میں دلچسپی لیتے رہے۔ سی سی آر یو ایم کے پہلے ڈائریکٹر حکیم عبدالرزاق سے آپ کی کافی قربت تھی، جس کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور حکیم عبدالحمید صاحب کے دست وبازو تھے۔ سی سی آر یو ایم کی میٹنگوں اور کانفرنسوں میں آپ کی شرکت لازمی تھی، انسٹیوٹ کے مسائل ہوں، طبی تحقیقات ہو،

ریسرچ کے لیے نسخوں کا انتخاب ہو، ان پر تحقیق و تجربہ سے متعلق امور ہوں، انتظامی یا حکومت سے سفارش کی بات ہو، لٹریری ریسرچ یا طبی رسائل و جرائد کا معاملہ ہو ہر پیچیدگی کو حل کرنے اور کرانے کے لیے آپ پیش پیش رہتے۔ حکیم عبدالرزاق کے جانشین ڈاکٹر محمد خالد صدیقی نے اس تعلق کو برقرار رکھا، ان کے رسوخ سے کونسل کو فیض یاب کرایا۔ وہ ذاتی طور پر حکیم صاحب سے کافی قریب تھے۔ حکیم صاحب کونسل کی گورننگ باڈی، سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی، کلینکل ریسرچ کمیٹی [صدر] اور پروجیکٹ آفیسر کی حیثیت سے بھی وابستہ رہے۔ سطورِ بالا سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکیم صاحب نے کس طرح خود کو طبی تحریکات اور طبی خدمات کے لیے وقف کر دیا تھا۔

دورانِ طالب علمی ہی سے آپ کو سیاست سے دلچسپی تھی مگر عملی سیاست میں ذہنی پختگی کے بعد ہی داخل ہوئے۔ مدرسہ بیت العلوم میں زیرِ تعلیم تھے۔ ابھی کم سن تھے۔ اعظم گڑھ میں کانگریس کے ایک سیاسی اجتماع میں اپنی شعلہ بیانی سے لوگوں کو متحیر کر دیا۔ سیاست نہ آپ کی اولین ترجیح تھی، نہ منزل تھی، پھر بھی آپ سیاست کا حصہ بنے۔ صحافتی زندگی میں کانگریس کی دہری پالیسیوں کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا۔ قوم وملت سے ہمدردی تھی۔ اپنے مضامین کے ذریعے کانگریس کے عملی تضادات کو عیاں کرتے رہے۔ حکومت پر سخت تنقید کرتے تھے اور مسلمانوں کے شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے رہے، آر ایس ایس کے خلاف بھی لکھتے رہتے تھے۔

عثمانی صاحب کو نہ اقتدار کی خواہش تھی، نہ شہرت کی طلب تھی، نہ دولت کے حریص تھے، وہ صرف ایک پلیٹ فارم چاہتے تھے جہاں سے وہ اپنی بات کہہ سکیں، طبِ یونانی کے فروغ کے لیے کچھ کر سکیں۔ طب کی دنیا میں باقاعدہ قدم رکھنے کے بعد اتفاقاً آپ کے ایک دوست وید بیج ناتھ کپاہی نے آپ کو جن سنگھ سے متعارف کروادیا۔ ۱۹۶۶ء میں ہردیال دیوگن کی صدارت میں آپ جن سنگھ کے ممبر بن گئے، مگر عملی سیاست سے دور رہے۔ جولائی ۱۹۷۲ء میں سیاست کے ہتھکنڈوں کو استعمال کر کے آپ کے کیئریر کے ساتھ کچھ لوگوں نے کھلواڑ کی کوشش کی۔ اطبا کا ایک گروپ طبیہ کالج بورڈ کے صدر میر مشتاق اور مہانگر پریشد دہلی کے انچارج کشن سروپ کے ساتھ مل کر اس وقت کے وزیرِ صحت اوما شنکر دیکچھت اور اسٹیٹ ہوم منسٹر کے سی، پنت کے ذریعہ معطل کروادیا۔ دوبارہ ایمرجنسی کے دوران امرناتھ چاولا صدر، طبیہ کالج بورڈ اور وزیر داخلہ اوما شنکر کی معاونت سے برطرف کروادیا۔ یہ المیہ محض اس وجہ سے جنم لیا کہ آپ کانگریسی نظریات کے مخالف تھے۔ اس عالم مایوس میں آپ بھی سیاست کی پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ کانگریسیوں کے ظلم وستم نے آپ کو جن سنگھ سے قریب کر دیا اور ایمرجنسی کے بعد آپ جنتا پارٹی کا ایک جز بن گئے۔

بی جے پی کی تشکیل ہوئی تو اس میں شامل ہو گئے۔ نویں دھائی میں آپ بھاجپا کے فعال کارکن رہے۔ ۱۹۹۴ء میں اس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر بنے، اسی سال مذکورہ پارٹی کے اقلیتی مورچہ کے جنرل سکریٹری نامزد ہوئے اور دہلی پردیش کے وائس پریسیڈنٹ بھی بنے۔ ۱۶/جولائی ۲۰۰۳ء میں قومی اقلیتی کمیشن کے وائس چیئرمین کا عہدہ سنبھالا۔

عثمانی صاحب نے قعر دریا میں غوطے ضرور لگائے، مگر دامن کو پوری طرح کبھی بھیگنے نہ دیا۔ وہ تاریک راہوں کے مسافر کبھی نہ بن سکے، بی جے پی کے بڑے رہنماؤں اٹل بہاری باجپائی، ایل کے ایڈوانی، مرلی منوہر جوشی، مدن لال کھورانہ اور صاحب سنگھ ورما وغیرہ سے قریبی تعلقات تھے۔ آپ نے ان سب سے تعلقات کو صرف طب کی دنیا کو فروغ دینے کے لیے کیا۔ ڈاکٹر مرلی منوہر جوشی کے ذریعہ آپ نے کئی ملی کام انجام دیئے۔

ہاں اتنا ضرور کیا کہ اقلیتی کمیشن سے وابستگی کے دوران مسلمانوں کو بے جی پی سے قریب لانے اور باہمی غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش کی۔ مدارس کے ذمہ داروں سے ملے، مدارس کے نصابِ تعلیم پر توجہ دی، مولانا رابع ندوی سے مراسلت کی، اسی زمانہ میں ترشول کی تقسیم پر کافی ہنگامہ ہوا تھا، آپ نے اس معاملہ کو خوش اسلوبی سے حل کر دیا۔ اقلیتی کمیشن کے ہی اسٹیج سے ۵/مئی ۲۰۰۳ء کو آپ نے وشو ہندو پریشد کے لیڈر پروین توگڑیا سے کہا کہ 'توگڑیا جی! شعلہ نہیں شبنم بن جایئے۔' آپ کا یہ بیان کافی مشہور ہوا۔ گریٹر نوئیڈا میں فساد کے دوران کمیشن نے امن قائم کرنے کے لیے جو کوششیں کیں اسے میڈیا نے کافی دی۔ میں نے آپ کی حیات میں بہت کوشش کی کہ آپ کا شعری مجموعہ شائع ہو جائے پہلے تو راضی نہیں ہوئے، پھر فرمایا کہ سارا کلام نہ جانے کہاں ضائع ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کوئی طالب علم آپ کے قرول باغ والے مکان سے آپ کی طبی بیاض اور ساتھ

میں شعری بیاض بھی اٹھالیا گیا۔ میرے اصرار پر آپ نے یادداشت سے غزلیں لکھنا شروع کیں لیکن یادداشت اور انگلیوں نے ساتھ نہیں دیا صرف بارہ غزلیں ہی نقل کر سکے۔

آخری عمر میں آپ کی صحت بہت اچھی نہیں تھی۔ ۱۹۹۹ء میں پہلی بار عارضہ قلب لاحق ہوا، بے احتیاطی اور بد پرہیزی خوب کرتے تھے۔ کسی کی سنتے نہیں تھے۔ ۲۰۱۱ء میں بائی پاس سرجری کے مرحلہ سے گزرنا پڑا۔ عمر کے اس مرحلے میں تھے جب نگہداشت کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ ۳ر جنوری ۲۰۱۳ء کو ساڑھے آٹھ بجے میرے پاس پروفیسر رئیس الرحمٰن صاحب کا فون آیا کہ عثمانی صاحب کی طبعیت سخت خراب ہے، دانش باہر ہیں، جتنا جلد ہو سکے ان کے گھر پہنچو، میں بھاگم بھاگ روہنی کے لیے روانہ ہوا۔ شوگر لیول ۵۰۰ ملی گرام سے زائد تھا۔ میں نے فوراً انسولین کا انجیکشن دیا، قدرے طبیعت بحال ہوئی، مجھے دیکھ کر خوش ہوئے، اسی دوران ڈاکٹر دانش اترا کھنڈ سے گھر پہنچ گئے۔ ہم دونوں نے MGS اسپتال میں داخل کرایا، گردوں کے فعل میں خلل آچکا تھا۔ پھر مہاراجہ اگرسین ہاسپٹل میں داخل کرایا گیا، مگر وقت موعود آن پہنچا تھا، بالآخر ۱۵ر جنوری ۲۰۱۳ء بوقت ۶ر بج کر ۲۵ منٹ مسیحائے وقت، نقیب طب ابدی نیند سو گیا۔ حق مغفرت کرے، عجب آزاد مرد تھے۔

عثمانی صاحب نے عجیب متحرک شخصیت پائی تھی، گوناگوں اور متضاد صفات کے حامل تھے۔ حاضر جواب اور بذلہ سنج ایسے کہ فلک شگاف قہقہے پڑیں اور محفل زعفران زار بن جائے۔ مزاج کے غصیلے تھے۔ لیکن یہ غصہ اور غضب صرف گھر تک محدود تھا، اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اہلِ علم کے قدر داں تھے، خوردوں کے حق میں مشفق تھے۔ اپنے شاگردوں کا تعارف زوردار انداز میں کراتے تھے۔ خودستائی سخت ناپسند تھی اور مدح سرائی سے متنفر تھے۔ مزاج میں لاپرواہی اور لاابالی پن تھا۔ اپنی قیمتی چیزیں سوائے چیک بک کے کبھی سنبھال کے نہیں رکھی۔ تعلقات کو آخری دم تک نبھاتے تھے۔ اختلاف رائے منظور تھا۔ مگر بات ذات تک پہنچتی تو دوری بنا لیتے تھے۔ شاگردوں کو بڑی اہمیت دیتے۔ نرم گفتار تھے۔ آپ کی ظرافت صرف حلقۂ یاراں تک محدود تھی اور حلقۂ یاراں بھی نہایت محدود تھا۔ باوقار اور پُر رعب شخصیت کی وجہ سے عام طلبا آپ سے قریب ہونے سے ڈرتے تھے۔ مگر جو آپ کے قریب تھے وہ بے تکلف دوست تھے۔ آپ آزاد منش تھے، شرعی احکام کی پابندی میں سست تھے۔ متدین نہ تھے، مگر راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ بزرگانِ دین اور اسلاف کا نام نہایت عزت سے لیتے تھے۔ نماز کی بات آتی تو اپنی جوانی کی عبادت اور تہجد گزاری کے قصیدے سنانے لگتے۔ بچوں کی شادیاں دینی گھرانوں میں کی۔ لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین کا کثرت سے ورد کرتے تھے۔ فریضہ حج کی ادائیگی کی شدید خواہش تھی، جب صحت مند تھے تو کہتے تھے، دانش کی شادی سے فارغ ہو جاؤں تو حج کروں گا۔ بی جے پی حکومت کے دور میں امیر الحجاج بنا کر بھیجنے کی تجویز آئی تھی۔ فوراً مجھے علی گڑھ سے طلب کیا اور حکم دیا کہ تیاری کر لو میرے ساتھ حج پر جانا ہے۔ ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ احرام بھی خریدا جا چکا تھا۔ عارضی پاسپورٹ کی درخواست دے دی گئی۔ میرے اور دانش کے گھر میں خوشیوں کی لہر دوڑ گئی، عین وقت پر حکومت کی نظرِ عنایت مصلحت میں بدل گئی اور ڈاکٹر فاروق عبداللہ کو امیر الحجاج بنا دیا گیا۔ اس کے بعد صحت نے اجازت نہیں دی۔ وفات سے قبل ڈاکٹر دانش کو وصیت کی کہ میرا حج بدل ضرور کرنا۔ عید کی نماز کا خصوصی اہتمام کرتے تھے۔ صفِ اول میں جگہ نہ ملتی تو گھر والوں پر نزلہ گرتا۔

کم خوراک تھے، دوپہر کے کھانے میں ارہر کی دال چاول، دہی اور مرچ کا اچار استعمال کرتے تھے۔ ذیابیطس کے مریض تھے، مگر میں نے انھیں کبھی پرہیز کرتے ہوئے نہیں دیکھا، حالاں کہ مختصر تعطیلات میں انھیں کے گھر میں رہتا تھا۔ انھیں اپنی دواؤں پر اعتماد تھا۔ مطب کی پابندی آخری ایام تک کیا۔

لائق ستائش ہیں آپ کے وہ شاگردان جنھوں نے آپ کی خدمات کو تابندہ رکھنے کے لیے 'جہان طب' کے خصوصی نمبر کی اشاعت کا عزم کیا ہے۔ یقیناً یہ پروفیسر رئیس الرحمٰن صاحب، ڈائرکٹر جنرل، سی سی آر یو ایم کی علم نوازی اور سعادت مندی کا مظہر ہے۔

●●●

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

☆حکیم سید امام الدین احمد

علم وفضل کی غمازی کرتا ہوا نورانی چہرہ، متانت وسنجیدگی کا پیکر، تکلفات سے نا آشنا، خلوص وانکساری کی جیتی جاگتی تصویر، اعلیٰ تہذیب کا نمونہ، اصلاح معاشرہ کے آرزومند، علمی وفکری نقوش وخطوط کو اپنے ماتھے سے خود بخود عیاں کرتا یہ تاثراتی چہرہ مشہور ومعروف شخصیت ''حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب مرحوم'' کا ہے۔

زمیندار خاندان کا یہ ستارہ حکیم مظہر سبحان عثمانی موضع صمد پور ضلع گورکھپور میں یکم جولائی ۱۹۳۸ء میں نمودار ہوا۔ حکیم صاحب نہ صرف طبّی میدان میں بلکہ فارسی، عربی اور انگریزی زبان وادب کی دنیا میں اعلیٰ واقفیت رکھتے تھے۔

پروفیسر اور صدر شعبۂ معالجات کی حیثیت سے ۱۹۹۸ء میں آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی سے سبکدوش ہوئے۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب سے ملاقات کا شرف اس وقت حاصل ہوا جب میں چنئی سے ممتحن کی حیثیت سے طبیہ کالج، قرول باغ پہنچا۔ امتحان کے بعد مجھے وہ اپنے دولت خانے لے گئے۔ ہم نے لنچ گھر پر ہی کیا اور وہیں قیام کیا۔ اس دوران حکیم صاحب کی شخصیت سے میں بہت متاثر ہوا۔ حق گو، صاف گو، طبّی تصانیف پر اپنے ہنگامہ خیز خیالات کا اظہار کرتے، بہت بے باک گفتگو اور خطابت میں صاف ستھری شائستہ زبان استعمال کرتے، اپنے سے چھوٹوں پر بہت شفقت کرتے اور اخلاق حسنہ کا بے پایاں نمونہ۔

حکیم صاحب بے پناہ تنظیمی صلاحیتوں کے مالک رہے۔ وہ اپنے شاگردوں کی طبّی صلاحیتوں کی حوصلہ افزائی فرماتے، ان کی گفتگو ان کی طبّی صلاحیتوں کا پتہ دیتی تھی۔ حکیم صاحب معاشرتی، سماجی، ملکی وسیاسی موضوعات پر کھل کر اظہار خیال فرماتے۔

معالجات پر ان کو عبور حاصل تھا انہوں نے اپنے لکچرز کے ذریعے اسباب وعلامات، تشخیص مرض اور تجویز کے حوالے سے ایسے شاگردوں کی وہ تربیت کی جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

بلاشبہ ان بیش بہا خدمات کی بناء پر اس تاریخی شخصیت کو طب کی صف میں ایک خاص جگہ مل گئی۔

حکیم عثمانی صاحب نے لکھنؤ کے مشہور طبّی کالج 'تکمیل الطب کالج' سے امتیازی کامیابی سے F.M.B.S کی ڈگری حاصل کی۔ حکیم عثمانی صاحب مشہور ومعروف طبیب حکیم خواجہ شمس الدین لکھنوی کی شاگردی سے فیضیاب ہوئے۔ نسخہ نویسی اور فنِ طبابت میں انہوں نے حکیم شکیل احمد شمسی کے نقشِ قدم پر چل کر اعلیٰ مقام حاصل کیا۔

ہندوستان کی مشہور ومعروف درس گاہ 'جامعہ طبیہ' میں بحیثیت لکچرر، انچارج دواخانہ تقرری پائی۔ حکیم اجمل خاں صاحب کی قائم کردہ طبّی درسگاہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ نئی دہلی میں بطور انچارج دواخانہ رہے۔ یہاں بھی انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ اس طرح کی شخصیات بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہیں۔

میرے لیے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ حکیم صاحب کے ساتھ بہت

☆ سابق پرنسپل، گورنمنٹ یونانی طبیہ کالج، چنئی، تمل ناڈو

ہی یادگار لمحے نصیب ہوئے۔حکیم صاحب کی شخصیت اپنے آپ میں خود ایک ادارہ رہی۔

قرول باغ کے جس مکان میں ان کی رہائش تھی، اکثر میں ان کے حکم پر انہیں کے ساتھ قیام کرتا۔کبھی کبھی ہماری بیگم بھی ساتھ ہوتیں۔حکیم عثمانی صاحب کی بیگم صاحبہ [ہماری بھابھی] کی شفقتیں بھی ہم دونوں نے مل کر بڑی عقیدت ومحبت سے حاصل کیں۔انہیں دنوں صاحبزادے منظر اور دانش سے بھی ملاقاتیں ہوجایا کرتیں۔حکیم عثمانی صاحب کا سبجیکٹ پر عبور اور ان کی جرأت وہمت، ان کے اخلاق اور ان کی طبّی قابلیتوں کی حیثیت کا حکیم عبدالحمید قبلہ بھی انکار نہ کرسکے۔حکیم عثمانی صاحب ہر طبّی کانفرنس کا اہم حصہ ہوا کرتے۔وہ طبّی تنظیموں کا بھی حصہ رہے۔علمی اور خاص کر طبّی گفتگو کا ذکر ہر طرح کی محفلوں میں ہوتا اور وہ طب کا سکہ جمانے میں کامیاب رہا کرتے۔

حکیم صاحب نے بچپن سے صحیح معنوں میں ہر لمحہ اپنے آپ کو بنایا۔ لیاقت ومحنت سے طب کی خدمات انجام دیں۔

مجھے اپنی سروس کی زندگی کے جتنے بھی مشہور ومعروف اساتذہ اور علمی وطبّی شخصیتوں سے ملنے کا اتفاق ہوا، شہر دلی میں ان سے زیادہ متاثر کن شخصیت نظر نہیں آئی۔طبّی معلومات کا وہ ایک گہرا خزانہ رہے۔ان سے ملاقاتوں کا نقش بہت گہرا اور پائیدار رہا۔حکیم صاحب سے قریب ہونے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت ہی نازک مزاج اور حساس واقع ہوئے ہیں۔صاحبزادے منظر کی ناگہانی موت نے ان کے دل پر بہت گہرا گھاؤ لگایا لیکن یہ اللہ کا شکر ہے کہ صاحبزادے دانش نے اس گھاؤ کو بھر دیا اپنی محنتوں سے اور فرماں برداری سے، صاحبزادے منظر کے جانے کے بعد ان کی غمگین آنکھیں بہت یاد آتی ہیں۔حکیم صاحب ان دنوں بہت ہی افسردہ خاطر رہا کرتے۔ان کی مقبولیت تحریک جدید کے تعلیم یافتہ نوجوانوں و دانشوروں میں برابر قائم رہی۔آپ کا ہر جملہ ادبی شہہ پارہ ہوتا۔خواہ طبّی ہو یا سیاسی بڑی روح پرور اور دلکش تقریریں کیا کرتے۔آپ نے دہلی میں متعدد بڑے بڑے جلسوں میں تقاریر کیں۔حکیم صاحب کو عربی وفارسی کے ہزاروں اشعار نوک زبان پر ہوتے۔بہر حال حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب طب کی دنیا کے جلیل القدر حکماء میں سے تھے۔اب ہمیں ان کی قربتیں نصیب نہیں مگر۔بخش دی روشنی زمانے کو۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

•••

غزل

خوشی دیکھتے ہیں نہ غم دیکھتے ہیں
فقط تیری مرضی کو ہم دیکھتے ہیں

کبھی اُن نگاہوں سے تم بھی تو دیکھو
تمھیں جن نگاہوں سے ہم دیکھتے ہیں

یہ کہہ دو وہ طوفاں سے دامن بچائیں
جو ہنس ہنس کے یہ چشم نم دیکھتے ہیں

یہاں پر خودی عشق کی جاگ اُٹھی ہے
وہاں حسن کا سر بھی خم دیکھتے ہیں

تمھارے ستم کا اُنھیں خوف کیا ہو
ستم میں جو لطف وکرم دیکھتے ہیں

نہیں پائیں گے اپنی منزل وہ مظہرؔ
جو غیروں کے نقش قدم دیکھتے ہیں

حکیم مظہر سبحان عثمانی — چند یادیں اور تاثرات

☆حکیم برکت اللہ ندوی

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی عبقری شخصیت طبّی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں، وہ اپنی ہمہ جہت خصوصیات کی وجہ سے بخیر وخوبی جانے جاتے تھے۔ ان کی پیدائش مشرقی اتر پردیش کے ضلع گورکھپور کے موضع صمد پور میں یکم جولائی ۱۹۳۸ء کو ہوئی۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم مدرسہ ناصر العلوم گھوسی، اعظم گڑھ، [اب مئو]، ثانوی تعلیم انجمن اسلامیہ گورکھپور سے مکمل کرنے کے بعد مدرسۃ الاصلاح، مدرسہ اسلامیہ بیت العلوم، سرائے میر، مدرسہ کنز العلوم، ٹانڈہ، فیض آباد میں عربی، فارسی و درسِ نظامی کی تعلیم کی تکمیل کی۔[۱]

اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں لکھنؤ کے تکمیل الطب کالج میں طب کی تعلیم کے لیے داخلہ لیا اور وہاں کے مشہور اساتذہ سے طب کا درس لیا اور اس وقت کے پرنسپل حکیم شکیل احمد شمسی مرحوم سے بھرپور استفادہ کیا، وہ حکیم صاحب کے بے حد عزیز اور چہیتے شاگرد تھے۔ اس کے علاوہ مطب ونسخہ نویسی کی مشق اس وقت کے نامور طبیب شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین لکھنوی کی زیرنگرانی مکمل کی۔[۲]

طب کی تعلیم سے فراغت کے بعد اپریل ۱۹۶۴ء میں ان کا تقرر جامعہ طبیّہ، دہلی میں بحیثیت لکچرر وانچارج شفاخانہ ہوا اور ستمبر ۱۹۶۹ء میں حکیم اجمل خاں کے قائم کردہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیّہ کالج، قرول باغ میں بحیثیت انچارج شفاخانہ اور پھر سینئر لکچرر معالجات کے عہدہ پر تقرر ہوا۔ اے اینڈ یو، طبیہ کالج سے بحیثیت پروفیسر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ آپ نے اس دوران درس و تدریس اور علاج و معالجہ کی اہم ذمہ داری بخیر وخوبی انجام دی۔ ۱۹۶۲ء میں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس دہلی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے اس کے علاوہ مختلف یونیورسٹی کے ایگزامنر، ممبر اور ایکسپرٹ رہے۔[۳]

۱۹۸۶ء کا تذکرہ ہے۔ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن میں ریسرچ اسسٹنٹ کی پوسٹ کے لیے میں انٹرویو دینے نئی دہلی گیا وہاں بورڈ میں مرحوم حکیم محمد عبدالرزاق اور طبیبہ اُم الفضل وغیرہ کے ساتھ مرحوم حکیم مظہر سبحان عثمانی بھی تھے، سب نے بہت سے امراض وعلاج سے متعلق سوالات کیے، مگر حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب نے عربی کا ایک شعر سنایا اور اس کا ترجمہ معلوم کیا، جسے میں نے بخیر وخوبی بیان کیا۔ جس سے اندازہ ہوا کہ ان کی عربی زبان وادب پر نظر تھی۔

حکیم صاحب کی شخصیت بیک وقت کئی صفات اور خصوصیات کی حامل تھی۔ علاج و معالجہ میں وہ طبیب حاذق اور مریضوں کے مسیحا تھے، بحیثیت مدرس وہ قدیم وجدید معلومات سے ہم آہنگ ایک اچھے استاذ اور طلبہ کے لیے بطور مشفق اور مربی، علمی اور فنّی گفتگو کے ماہر، سحر البیان مقرر، اور سیاست کے میدان میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے مقبول اور معروف ممبر رہے اور طبِ یونانی کی بہتری اور ترقی کے لیے آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے بینر تلے ہمیشہ کوشاں رہے۔ اس کے ساتھ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور اپنا مجموعہ کلام شائع کرنا چاہتے تھے مگر وقت اور زمانہ نے ساتھ نہ دیا اور ۱۵ جنوری ۲۰۱۳ء کی شام کو نئی دہلی میں ہم سب کو داغ مفارقت دے کر

☆ ریڈر اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، الہ آباد، یوپی

اپنے مالک حقیقی سے ہمیشہ کے لیے جا ملے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کی تلافی فرمائے۔ آمین[۴]

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

خصوصیات:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی سیرت وسوانح کے مطالعہ سے یہ بات بالکل عیاں ہوتی ہے کہ ان کو اپنے استاذ حکیم شکیل احمد شمسی مرحوم سے بہت گہرا ربط وتعلق تھا بلکہ ان کی شخصیت کی بہترین عکاس تھی جیسا کہ خود حکیم مظہر سبحان عثمانی اپنے استاذ مرحوم حکیم شکیل احمد شمسی کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''ایسے اساتذہ بہت کم ہوتے ہیں جو مدارس و جامعات کی مقررہ میعاد تعلیم ختم ہوجانے کے بعد بھی اپنے تلامذہ کی علمی سطح اور فکری رجحان کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے دم آخر تک چشمۂ فیض بنے رہتے ہیں، ایسے ہی اساتذہ فن کی صف میں ایک قد آور اور دلآویز شخصیت میرے استاذ شکیل احمد شمسی کی بھی تھی۔''[۵]

یہ خصوصیت خود مرحوم حکیم مظہر سبحان عثمانی میں بدرجہ اتم پائی جاتی تھی، مجھے شرف تلمذ کا موقع تو نہیں ملا، مگر ایک مرتبہ قرول باغ طبیّہ کالج میں طلبہ معالجات کے پریکٹکل اور تقریری امتحان میں بطور ممتحن شریک کار رہا جہاں اندازہ ہوا کہ وہ اپنے طلبہ کی کسی طرح حوصلہ افزائی اور رہنمائی فرماتے تھے، جو کوئی مشفق اور مربی استاد ہی کرسکتا ہے۔ اخیر میں میں ان کی پرُتکلف ضیافت کو ہمیشہ یاد کروں گا جو انہوں نے اپنی رہائش گاہ پر کی۔ ان کو اپنے استاذ حکیم شکیل احمد شمسی سے فنّی درسیات، طبّی سیاسیات اور شعر وسخن میں ہی نہیں، بلکہ طرز فکر اور افتادِ طبع میں بھی ہم آہنگی تھی۔ بقول حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم:

''راقم الحروف کو بھی شعر وسخن سے دلچسپی ہے اور کبھی کبھی آورد نہیں بلکہ آمد کے تحت شعر موزوں ہوتے رہے ہیں''۔[۶]

حکیم سید غلام مہدی صاحب نے حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کے شعر وسخن سے متعلق بجا طور پر فرمایا ہے:

''عثمانی صاحب ایک اچھے شاعر تھے، وہ اپنا مجموعہ کلام شائع کرنا چاہتے تھے اور راقم الحروف سے اپنے اس خیال کا اظہار کیا تھا، ممکن ہے کہ راقم الحروف اس سلسلہ میں ان کی معاونت کرتا، مگر یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا اور ہم ایک قابلِ قدر شعری سرمایہ سے محروم ہوگئے۔''[۷]

اور بقول ڈاکٹر خاور ہاشمی صاحب:

''عثمانی صاحب طبیب نہ ہوتے تو شاعر ہوتے، اُن کی طبیعت میں ایک فنکاری اور پرکاری تھی، عثمانی صاحب کی زندگی کا یہ پہلو بہتوں کی نظر سے اوجھل رہا ہے کیونکہ غالب کی طرح انہوں نے شاعری کو ذریعۂ عزت نہیں بنایا بلکہ قدیم اطباء مثلاً حکیم مومن خاں مومن، حکیم اجمل خاں اور خود اپنے استاذ حکیم شکیل احمد شمسی کی روایت کو زندہ رکھا۔[۸]

میری گزارش ہے کہ یہ شعری مجموعہ اگر شائع نہیں ہوا ہے تو شائع کرکے منظر عام پر لایا جائے، تاکہ عوام وخواص اس سے مستفید ہوسکیں۔ اسی طرح ان کی تحریر کردہ کتاب ''ٹیپو سلطان کے معالجات وتکنیکی تجربات'' ان کی تحقیق وجستجو کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کی باز اشاعت کی ضرورت ہے۔ یہ مرحوم کے لیے بہترین خراج عقیدت ہوگا۔

حوالہ جات

۱- نوائے طب وصحت، الہ آباد، جنوری ۲۰۱۳ء، ص ۳
۲- سووینیر، آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس ۱۹۹۳ء
۳- رپورٹ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس دہلی ۱۹۹۳ء
۴- ملی گزٹ، ۵ فروری ۲۰۱۳ء
۵- ''تذکرہ استاذ''، حکیم مظہر سبحان عثمانی، ص ۱۲۸
۶- ایضاً، ص ۱۴۰
۷- ماہنامہ ہمدرد، دہلی، فروری ۲۰۱۳ء، ص ۵
۸- ایضاً ص ۳

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی — فن اور شخصیت

☆ڈاکٹر وسیم احمد

فلسفہ، حکمت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، چنانچہ جو معنی فلسفہ کے ہوں گے وہی معنی حکمت کے بھی ہوں گے۔ اس طرح حکمت تمام علوم کے مبادیات کی تصدیق وتوثیق [validation] سے عبارت ہوئی۔ اس کے علاوہ حکمت The best knowledge اور The best object of knowledge کے لیے بولا جاتا ہے، نیز حکمت سے معرفتِ کلی کا وجدان ہوتا ہے۔[1]

لفظ حکیم کے معنی گرہ کشائی اور دیگر انسلا کی مطالب کے باب میں اہل لغت نے چشم بینا تحریر کیا ہے، عام مروجّہ زبان میں لفظ حکیم، جس کا مادہ 'حکمۃ' ہے، کا مطلب ایک عام طبیب کا سمجھا جاتا ہے، لیکن شیخ الرئیس کے statement پر اگر غور کیا جائے تو اس کے متعدد معانی ہوتے ہیں مثلاً مدبّر، مصلح، سیاسی سوجھ بوجھ والا، فہم وفراست کا پیکر، ذہن رسا اور ایک مثالی نشان راہ وغیرہ، جو تحقیق، تفحص اور فکر وتعقل پر بنیاد کرتے ہیں۔ اب اگر غور کریں تو علم طب بھی انہی بنیادوں پر قائم ہے۔ ایک خصوصی معنی میں طبیب دانائے راز ہوتا ہے، طبعِ انسانی کا نبّاض اور اسرارِ فطرت کا مظہر ہوتا ہے۔

جس طرح دبستانِ لکھنؤ نے طب میں اپنی انفرادیت اور نشانِ امتیاز ادویۂ مفردہ سے علاج ومعالجہ کے ذریعہ قائم کیا ہے، اسی طرح اردو ادب میں بھی دبستانِ لکھنؤ اپنی جداگانہ لسانی تکنیک، فنی نزاکتوں اور نکہتوں کا علم بردار رہا ہے۔ غرض اینکہ طب ہو یا ادب، دونوں ہی موضوعات میں اردو زبان کا پیمانہ سدا سے لبریز رہا ہے۔ اس طرح اظہارِ خیال، ارسال وترسیل اور ابلاغ کے لیے اردو زبان ہی ذریعہ اور وسیلہ رہی ہے۔ آزادی کے پُر آشوب دور میں بھی ادب نوازی اور ادب پروری کی روایت عروج اور بلندی پر رہی ہے۔

اطباء اپنی معالجانہ حذاقت اور فنّی طبابت کے لحاظ سے جادۂ مسیحائی کے پیمبر تھے، اعلیٰ علمی وادبی مذاق سے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ اس حلقۂ ادب میں معتبر وکہنہ مشق، دردمند اور باشعور فنکار، بلکہ استادانِ فن کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، جس میں خاندانِ عزیزی کے علاوہ حکیم خواجہ شمس الدین لکھنوی اور حکیم شکیل احمد شمسی جیسی متاثر کن شخصیتیں تھیں۔ اسی درسگاہِ طب میں حکیم مظہر سبحان عثمانی نے زانوئے تلمذ تہہ کرکے کسبِ فیض کی سعادت حاصل کی۔

حکیم عثمانی صاحب کی شخصیت نہایت وجیہ، شگفتہ مزاج اور طرحدار تھی۔ وہ بارعب قسم کے آدمی تھے۔ بچپن سے ہی نہایت ذہین، خوش طبع اور وسیع المشرب صفت کے حامل تھے۔ اُن کی پیدائش مشرقی اتر پردیش کے مشہور ومعروف ضلع گورکھپور کے ایک چھوٹے سے موضع صمد پور کے ایک زمیندار اور صاحبِ حیثیت گھرانے میں یکم جولائی ۱۹۳۸ کو ہوئی۔

شاہِ ایران کی ہندوستان آمد پر اُن کے ساتھ کچھ اکابر اور علماء کی جماعت بھی تھی، جن میں تین سگے بھائی بھی تھے، جنھیں اورنگ زیب نے جاگیریں عطا کی تھیں، ان میں:

۱- شیخ عبدالعزیز نے مبارک پور بسایا

۲- شیخ مبارک نے ضیف

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ کلیات، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلورو

۳- شیخ عبدالصمد نے صمد پور بسایا۔

دراین اثنا اورنگ زیب جب صمد پور سے گزر رہا تھا تو اس نے فرمایا ''ایں جا بوئے ولایت می آید'' یعنی اس سرزمین سے ولایت کی بو آتی ہے۔ صمد پور کے پاس ایک جگہ کا نام ڈھگوا [گورکھ پور] ہے۔ اورنگ زیب نے وہاں ایک مسجد بنوائی تھی، جو ابھی بھی باقی ہے۔

حکیم عثمانی صاحب جب سن صبی میں داخل ہوئے تو والد محترم منظور احمد داعیٔ اجل کو لبیک کہہ کر مالک حقیقی سے جا ملے، اس لیے تعلیمی و تربیتی پرورش و پرداخت کی ساری ذمہ داریاں والدہ محترمہ حسیب النساء کے حصہ میں آئیں۔

حکیم موصوف کی ابتدائی تعلیم والدہ ماجدہ کی نگرانی میں گھر پر ہوئی، جب آپ سن ترعرع میں داخل ہوئے تو اس وقت آپ نے گورکھ پور کی مشہور دانش گاہ انجمن اسلامیہ عربی کالج میں داخل لے لیا۔ پھر مدرسہ کنز العلوم ٹانڈہ، ضلع فیض آباد سے ہوتے ہوئے ہندوستان کی عظیم درسگاہ ندوۃ العلماء لکھنؤ آئے اور یہاں علوم دینیہ اور لسانیات [عربی، فارسی اور اردو] کے ساتھ علوم عقلیہ [ہیئت اور فلسفہ] سے بہرہ ور ہوئے اور یہی درس نظامی اُن کی شخصیت کی بوقلمونی اور علمی و ادبی مذاق کی وضع اور تزئین کاری میں مہمیز ثابت ہوا۔

۱۹۵۳ء میں عربک اینڈ پرشین اگزامینیشن ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن، یوپی گورنمنٹ سے مولوی اور عالم کا امتحان پاس کر کے سند حاصل کی۔ ۱۹۵۵ء میں خاندانِ عزیزی کے ذریعہ نصب کیا ہوا مینارۂ طب، طبّی موشگافیوں کے حل کرنے کا ذریعہ بنا، بعینہ اسی سال ازدواجی زندگی میں بندھ کر رسول اللہ ﷺ کی ایک سنت کی تکمیل کی۔ ۱۹۵۹ء میں ایف ایم بی ایس، یعنی فاضل طب کی سند حاصل کر کے وطن مالوف گورکھ پور واپس ہو گئے۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی علمی و ادبی اور سماجی سرگرمیوں سے اُن کا تعلق قائم ہو گیا تھا۔ کالج میں منعقد ہونے والے طبّی ہفتہ کی تقریب میں لسانی و ثقافتی پروگرام میں اُن کی شرکت تسلسل کے ساتھ رہتی تھی۔ اُنہوں نے کالج کی اسٹوڈنٹ یونین کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے بھی ذمہ داریاں ادا کیں نیز دبستانِ لکھنؤ میں تواتر کے ساتھ حاضری دیتے رہے۔ اساتذہ میں شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین احمد لکھنوی سے مطب اور نسخہ نویسی کے اسرار و رموز سے آگہی ہوئی۔ حکیم شکیل احمد شمسی سے یک گونہ تعلق تھا، جس کا پَرتو اُن کی بعد کی زندگی میں بھی برابر نظر آتا رہا۔ دورانِ طالب علمی کے اُن کے رفقاء میں حکیم سید حیدر علی جعفری اور سلطان حیدر خاں شارب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

۱۹۶۰ء میں حکیم عثمانی صاحب نے گورکھ پور کی مشہور مارکیٹ اردو بازار میں حکیم ابوالکلام صدیقی صاحب کے ساتھ اپنی طبّی حذاقت اور فنی مہارت کا مظاہرہ بحیثیت رئیس الطبیب [Chief physician] بعوض مشاہرہ ۱۴۵ روپے شروع کیا۔ طریقۂ علاج میں خاندانِ عزیزی کی روایت کو برتا، لکھنؤ کے قدماء کے طریقۂ علاج کے مطابق:

> ''مرض کی تشخیص، نوعیت مرض، جنس مرض، زمانۂ مرض، عمر مریض وغیرہ کو مدّ نظر رکھتے ہوئے مفردات کو ترتیب دے کر علاج کرتے تھے''۔

اپریل ۱۹۶۴ء میں استاذِ محترم حکیم شکیل احمد شمسی کے ایماء پر دہلی آ گئے اور یہاں بحیثیت سینئر استاذ شعبۂ معالجات، جامعہ طبّیہ، گلی قاسم جان [جواب ہمدرد طبّی کالج کے نام سے مشہور ہے] اور انچارج شفاخانہ کی حیثیت سے جوائن کیا۔ ۱۹۶۷ء میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے گورنمنٹ طبیہ کالج، سری نگر میں تقرری کا آفر لیٹر ملا، لیکن اُنہوں نے جوائن نہیں کیا۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں ہندوستانی دواخانہ، گلی قاسم جان، بلیماران، دہلی میں رئیس الطبیب کے منصب پر تقرر ہوا۔ نومبر ۱۹۷۰ میں آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ میں لیکچرر گریڈ۔1، شعبۂ معالجات اور انچارج شفاخانہ [یونانی] کی ذمہ داریاں تفویض ہوئیں۔ ۱۹۷۵ء میں ایمرجنسی کے دوران اس وقت کی وزیر اعظم ہند آنجہانی اندرا گاندھی نے طبّیہ کالج کے بالمقابل اجمل خان پارک میں ایک ریلی کا اہتمام کیا تھا اور اُس وقت کے وزیر داخلہ اوما شنکر دکشت بھی اسٹیج پر موجود تھے، کالج کے ایک استاذ نے چند طلباء کے ساتھ مل کر اندرا گاندھی سے حکیم عثمانی صاحب کے خلاف کچھ سیاسی نوعیت کے الزامات لگائے، جس کی بنیاد پر انھیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے چند ہفتوں کے اندر جامعہ طبّیہ دہلی نے پھر سے اُن کی خدمات حاصل کر لیں۔ اسی دوران اجمل خاں طبّیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے حکیم افہام اللہ صاحب ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو اُن کی جگہ کو پُر کرنے کے لیے ایک باصلاحیت استاذ کی تلاش شروع ہوئی اور وہاں حکیم عثمانی صاحب

کا تقرر بحیثیت لیکچرر معالجات اور طبیب شفا خانہ عمل میں آیا۔

وہاں کے منتظمین نے حکیم صاحب کے ساتھ یہ رعایت برتی کہ اسپتال سے ملحق بلڈنگ اُن کی رہائش کے طور پر دے دی۔ ۱۹۷۸ء میں جب مرکز میں جنتا پارٹی اقتدار میں آئی تو اُنہیں اسی منصب پر آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ میں ملازمت پر بحال کر دیا گیا۔ اس طرح وہ دوبارہ دارالسلطنت دہلی واپس آ گئے اور اگزامننگ باڈی آف یونانی اینڈ آیورویدک سسٹم آف میڈیسن کے ممبر بھی نامزد ہوئے، یہی اگزامننگ باڈی Integrated ڈگری کورس BIMS ایوارڈ کرتی تھی۔

۱۹۸۱ء میں جب راجیو گاندھی نے سیاست کی دہلیز پر قدم رکھا تو پارٹی کی تشہیر کے لیے طبّیہ کالج، قرول باغ تشریف لائے۔ یہاں موجود طلبہ سے کچھ بحث و تکرار ہوئی تو طلبہ اُن سے مزاحم ہو گئے، محترم راجیو گاندھی وہاں سے کسی طرح سے بچ نکلے، دریں اثناء کچھ کانگریسی ہم خیالوں نے راجیو گاندھی کے کان بھرے، جس کی وجہ سے اُنہوں نے اس سانحہ کے لیے حکیم عثمانی کو موردِ الزام ٹھہرایا اور ان کے خلاف مقدمہ درج کروایا۔ ۱۹۸۴ء میں جب راجیو گاندھی برسرِ اقتدار آئے تو دھرم داس شاستری طبّیہ کالج بورڈ کے صدر مقرر ہوئے، جنھوں نے بورڈ کی پہلی میٹنگ میں عثمانی صاحب کو ہدف بنا کر دوبارہ اُن کا تبادلہ 'ہندوستانی دواخانہ' کر دیا۔ عثمانی صاحب نے اس کے خلاف ہائی کورٹ سے اسٹے [stay] لے لیا، دریں اثناء طلبہ، اساتذہ اور ماتحت ملازمین نے دھرم داس شاستری کے خلاف آواز بلند کی، جس کی وجہ سے چار مہینوں تک کالج بند رہا اور اس احتجاج کے سامنے حکومت کو جھکنا پڑا اور اس وقت کے لفٹننٹ گورنر جگموہن کو بورڈ کا صدر بنایا گیا اور انھوں نے حکیم عثمانی صاحب کو طبّیہ کالج میں دوبارہ اُن کی جگہ پر بحال کر دیا۔

کشمکش روزگار سے بھری ہوئی یہ شخصیت بالآخر ڈاکٹر اشہر قدیر نے ریٹائرمنٹ کا سال ۲۰۰۱ء لکھا ہے کو اپنی ملازمت کی میقات پوری کر کے سبکدوش ہو گئی۔ سبکدوشی سے چند مہینوں پہلے طبّیہ کالج بورڈ نے اُن کو پروفیسر ایمریٹس مقرر کیا، غالباً ہندوستان کی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہے جب کسی طبیب کو پروفیسر ایمریٹس مقرر کیا گیا۔

۱۹۹۸ء میں دہلی حکومت نے اُنہیں ''اسٹیٹ ڈاکٹر'' کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ یہ اعزاز مرلی منوہر جوشی کے ہاتھوں دیا گیا اور اس تقریب میں دہلی کے وزیر اعلیٰ صاحب سنگھ ورما کے علاوہ ڈاکٹر ہرش وردھن، وزیر صحت دہلی گورنمنٹ بھی موجود تھے۔

طبّیہ کالج کے علاوہ دیگر متعدد مستند اداروں سے بھی اُن کی علمی و فنی وابستگی رہی ہے۔ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن [سی سی آر یو ایم]، نئی دہلی کی سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی اور اس کی گورننگ باڈی کے رکن رہے۔ کلینکل ریسرچ ہیلتھ کمیٹی کے چیرمین کے منصب پر فائز ہوئے، سی سی آر یو ایم کے ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، نئی دہلی کی ایڈوائزری کمیٹی کے چیرمین نامزد ہوئے۔ اس کے علاوہ دیگر اساسی تعلیمی اداروں، اجمل خاں طبّیہ کالج، اے ایم یو، علی گڑھ، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی وغیرہ کی فیض رسانی کا بھی سبب بنے اور آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے نائب صدر کے منصب پر رہتے ہوئے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

سیاسی مجال:

زمانۂ طالب علمی سے ہی حکیم صاحب فعال اور متحرک تھے، جس کی چھاپ اُن کی زندگی سے متعلق مختلف سماجی، معاشرتی اور سیاسی شعبوں میں ہویدا ہے۔ ۱۹۵۵ء میں حکیم شکیل احمد شمسی کا انتخاب بحیثیت پرنسپل آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج قرول باغ، نئی دہلی میں ہوا۔ اس خوش گوار واقعہ سے تکمیل الطب کالج، لکھنؤ کے طلبہ اور ماتحت ملازمین میں اُن سے بچھڑنے کا غم تھا، اسی کے ساتھ جذباتی تقریروں سے پورا ماحول گونج رہا تھا، ایسے وقت میں جذبات انگیز ماحول پر قابو پانے کی تدابیر کرنا ضروری تھا، چنانچہ حکیم شکیل احمد شمسی عثمانی صاحب سے فرمایا:

> ''میں دہلی جا رہا ہوں، مگر لکھنؤ چھوڑ کر وہاں کتنے عرصہ تک رہ سکوں گا، فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا؟ آپ طلبہ کو ریلوے اسٹیشن پر جمع ہونے سے روکیے، چند دنوں بعد لکھنؤ آنے کا ارادہ ہے۔ اس وقت اپنے قطعی فیصلہ سے آپ لوگوں کو آگاہ کروں گا، پھر آپ لوگ جس انداز اور جس تعداد میں مجھے رخصت کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن آئیں، مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا''۔

اس واقعہ سے زمانۂ طالب علمی سے ہی طلبہ پر عثمانی صاحب کے اثر اور اخلاقی دباؤ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

تکمیل الطب کالج کے ابنائے قدیم کو منظّم کرنے کے لیے حکیم شکیل احمد

شمسی نے یہ ذمہ داری حکیم مظہر سبحان عثمانی اور حکیم اعجاز جذبی بریلوی مرحوم کو دے رکھی تھی، جس کا اجلاس صوبائی طبّی کانفرنس کے ذریعے سہارنپور میں نومبر ۱۹۶۴ء کو ہونا تھا، جس میں وقت کے مشہور معالج، مترجم اور نامور مورخ حکیم نیر واسطی صاحب تشریف لائے، جو تکمیل الطب کالج سے قدیم رشتۂ ابنیت جوڑنا چاہتے تھے، مگر کالج کے ایک سینئر استاذ حکیم مسیح الزماں ندوی کی مخصوص سوچ نے اس جمعیت ابنائے قدیم کو پیدا ہونے سے پہلے ہی فنا کے گھاٹ اُتار دیا۔ غالباً اس کے پیچھے شکست کا وہ احساس تھا، جو دورانِ طالب علمی تکمیل الطب کالج کی اسٹوڈنٹس یونین کی تحریک طلبا کو اختیار کل حاصل کرنے کے لیے چلائی گئی تھی، جس کی وجہ سے حکیم مسیح الزماں ندوی مرحوم، حکیم شکیل احمد شمسی اور حکیم عثمانی کے درمیان دوریاں اور غلط فہمیاں پیدا ہوئی تھیں۔ اس وقت تکمیل الطب کالج کے مروجہ دستور کے مطابق اسٹوڈنٹس یونین کا صدر وائس پرنسپل ہوا کرتا تھا۔ حکیم عبدالحسیب کا تقرر اجمل خاں طبّیہ کالج، اے ایم یو، علی گڑھ میں ہوگیا تو حکیم عبدالحسیب پرنسپل کے عہدہ سے استعفٰی دے کر علی گڑھ آ گئے اور حکیم شکیل احمد شمسی پرنسپل اور حکیم مسیح الزماں ندوی وائس پرنسپل مقرر ہوئے، چنانچہ حکیم عثمانی نے اس وقت ایک زوردار تحریک چلائی کہ اسٹوڈنٹس یونین کا صدر کسی طالب علم کو ہی ہونا چاہئے اور اسی تحریک کے زیر اثر کالج کی انتظامیہ نے یہ بات تسلیم کرلی کہ کالج کے وائس پرنسپل کے بجائے طلبہ یونین کا صدر کوئی طالب علم ہو۔ چونکہ حکیم شکیل احمد شمسی اور حکیم مسیح الزماں ندوی کے درمیان معاصرانہ چشمک چلتی رہتی تھی، اس لیے حکیم مسیح الزماں ندوی کے ذہن میں اشتباہ لازمی طور سے پیدا ہوا کہ حکیم عثمانی نے حکیم شکیل احمد شمسی کے ایماء پر یہ تحریک چلائی ہوگی کہ یونین کا صدر وائس پرنسپل کے بجائے کوئی طالب علم ہو اور مسیح الزماں ندوی کو ان کے اس حق سے محروم کردیا جائے۔ میرا ذاتی تجزیہ ہے کہ حکیم عثمانی صاحب کی طرف سے ایسا کوئی تحریری اشارہ نہیں ملتا ہے کہ اس واقعہ کو ابنائے قدیم کے وجود سے جوڑا جائے۔

ابنائے قدیم کا وجود اور اس کی تشکیل کے لیے حکیم عبدالحسیب صاحب نے دوبارہ میٹنگ بلانے کے لیے یقین دلایا، جس کے لیے حکیم عثمانی نے غایت درجہ محنت کی اور مشرقی اضلاع کے بار بار اسفار کیے۔ حکیم مسیح الزماں ندوی سے برابر خط و کتابت کرتے رہے، لیکن وقتِ موعود پر جب پروگرام ہونا تھا مخالفین و معاندین نے تکمیل الطب کالج کے طلبہ تک کو استعمال کر کے پروگرام کو ناکام بنایا اور بالآخر ابنائے قدیم کا وجود محض خواب سا ہو کر رہ گیا۔ حکیم مسیح الزماں ندوی حکیم عثمانی کو کسی ایک خط میں کچھ یوں طنز کرتے ہیں:

> ''بہرحال اگر آپ کچھ پُر امید ہوں اور کالج و ادارہ کی بقا کے لیے کچھ کر سکنے کا حوصلہ رکھتے ہوں تو ضرور میدان میں آ جائیے، لیکن یہ ذہن میں رہنا چاہئے کہ ''شرطِ اوّلِ قدم آنست کہ مجنوں باشی'' اور مجنوں کے قالب میں ڈھل جانے کے بعد تو پھر 'ماوتو' کا کوئی سوال نہ ہوگا۔ دیکھئے اس صحرا میں کیسے کیسے آگ بگولوں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ شاید آبلہ پا کا تصور آپ کی کچھ رہبری کر سکے اور آپ ہی کے سر کالج کی فلاح و بہبود کا سہرا بندھے۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنی کریمی سے کوئی شکل پیدا فرماویں، جو کالج کے تن بے روح میں ایک بار حرارت پیدا کردے، آمین۔
>
> دعا کا طالب
> آپ کا مسیح الزماں ندوی

حکیم صاحب کے عملِ پیہم سے یہ نتیجہ بآسانی نکالا جاسکتا ہے کہ اجتماعیت کی تشکیل میں وہ کس قدر سنجیدہ اور فکرمند تھے اور اس کے وجود کے لیے برابر کوشاں رہے۔ یہی جہدِ مسلسل اور سیاسی سوجھ بوجھ ان کے وجود میں ایک عنصرِ اساسی کی حیثیت سے رہی، جس کا اظہار ان کی مابعد زندگی میں شدت سے ہوا۔

حکیم موصوف نے ۱۹۶۶ء میں جن سنگھ کی ممبرشپ اختیار کرلی، ۱۹۹۴ء میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہوئے، جس وقت اس کے صدر شری اوم پرکاش کوہلی تھے۔ عثمانی صاحب کو فنِ خطابت میں کمال حاصل تھا، اُنہوں نے اپنی جوشیلی تقریروں سے بھارتیہ جنتا پارٹی کے سرخیل رہنماؤں پر ایسے لازوال نقوش ثبت کیے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اُن کے گرویدہ ہوگئے تھے۔ اٹل بہاری واجپئی، لال کرشن اڈوانی، مدن لال کھورانہ، وجئے کمار ملہوترا اور پرہلاد سنگھ ساہنی جیسے قدآور سیاسی رہنماؤں کی ایک طویل فہرست ہے، جن سے حکیم موصوف کے دیرینہ روابط تھے۔

حکیم عثمانی صاحب ۱۹۹۵ء میں بی جے پی دہلی پردیش کے نائب صدر مقرر ہوئے، ۱۹۹۶ء میں نیشنل جنرل سکریٹری بی جے پی اقلیتی مورچہ،

۱۹۹۷ء میں قومی صدر اقلیتی مورچہ، اس کے علاوہ ۱۹۹۸ء میں دہلی اسمبلی اور لوک سبھا الیکشن کی بی جے پی انتخابی مہم کے رکن نامزد ہوئے۔ ۲۰۰۳ء میں نیشنل کمیشن فار مائنارٹیز کے وائس چیئرمین مقرر ہوئے اور اس عہدہ پر ۲۰۰۶ء تک فائز رہے۔

حکیم عثمانی کے ایک معاصر اور قریبی مشاہد حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''فن تقریر میں اس قدر حاوی ہیں کہ ملک کی فعال سیاست میں ان کا ایک مقام ہے اور بحیثیت طبیب ملک کے دارالسلطنت میں نیک نام ہیں۔ دلّی کی سیاست اور طبابت دونوں پر ان کا قبضہ ہے، جو مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی یاد تازہ کر دیتا ہے''۔

حکیم ہمدانی، حکیم عثمانی صاحب کی داخلی اور باطنی صفات کا تجزیہ کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

> ''طبیعت میں بالکل کھلے دل کے آدمی، نہ کسی سے رقابت نہ عداوت، شاطر چالوں سے بے نیاز، عصبیت سے دور، سب سے محبت، سب سے خلوص، سب سے پیار، اگر کوئی بدظن ہے تو ہوا کرے، ان کی طبیعت پر میل نہ آئے گا، ایک مسکراہٹ سب کا جواب''۔

علمی مجال و آثار:

حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب معلّمی کو ایک نیک عمل اور فریضہ سمجھ کر انجام دیتے تھے، قدیم طبّی ادبِ عالیہ اور عصری ادب پر ان کی دقیق نظر تھی، قدیم فکری مسلمات کو جدید حس و آگہی کے تناظر میں منطقی توجیہ اور استدلال پیش کرنے کا فن جانتے تھے، جس سے طلبہ میں طب کے تئیں عالمانہ اور پُر کیف مذاق پیدا ہو جاتا تھا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی زمانۂ طالب علمی سے ہی علمی و ادبی سرگرمیوں سے وابستہ ہو گئے تھے اور لکھنؤ سے شائع ہونے والے علمی و سیاسی مجلّہ پندرہ روزہ ''برادری''، جو عالمی انسانی برادری کا ہر دلعزیز اصلاحی ترجمان اور اخوت و مساوات انسانی کا علمبردار تھا اور جس کے مدیر اعلیٰ حافظ عبدالحفیظ صدیقی اور شریک مدیر حکیم مظہر سبحان عثمانی تھے، اس کے ادارتی کالم کے علاوہ اس میں 'امرود بخت شالجی' کے نام سے ''کعبہ سے بت خانے تک'' کے زیر عنوان مزاحیہ کالم بھی لکھا کرتے تھے، جس کی توصیف اور تحمید میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا عامر عثمانی، مدیر، ماہنامہ ''تجلّی'' دیوبند نے حافظ عبدالحفیظ صدیقی ایڈیٹر ''برادری'' کو خطوط لکھے تھے اور احسان مندانہ اعتراف کا اظہار کیا تھا۔

طبّی علوم کی تکمیل کے بعد حکیم عثمانی جب گورکھپور واپس آ گئے تو وہاں کی ادبی سرگرمیوں اور شعر و سخن کی محفلوں میں بھی دلچسپی لینے لگے اور وہاں کی ادبی تنظیم ''مرکزِ ادب'' کے نائب صدر منتخب ہوئے، جس میں شہر کی مشہور ادبی ہستیاں، مثلاً ہندی گورکھپوری اور ایم کوٹھیاوی راہی وغیرہ شامل تھیں۔ پندرہ روزہ ''برادری'' سے وابستگی سے پہلے حکیم عثمانی صاحب نے تکمیل الطب کالج سے ''پرواز'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا تھا، اس مقدس فریضہ میں ان کے خاص معاون حکیم شبیب رضوی تھے، جو بعد میں سری نگر گورنمنٹ ڈسپنسری میں ملازم ہوئے، وہیں شادی کی اور بعد میں اندلس چلے گئے۔ پرواز کے اجراء کا مقصد طلبۂ کالج میں طبّی ادب کا مذاق پیدا کرنا اور کالج کی طبّی سرگرمیوں کو ضبطِ تحریر میں لانا تھا۔

حکیم شکیل احمد شمسی سے حکیم عثمانی کے خاص تعلق اور یک گونہ ذہنی مناسبت کی وجہ سے برابر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، جس سے نہ صرف اُن میں ذہنی و فکری بالیدگی آئی، بلکہ جملہ کارہائے زندگی خود کو نکھارنے اور سنوارنے کا موقع ملا، حکیم عثمانی صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''استاذ مرحوم سے اپنے تلمذانہ تعلق کے گذشتہ تیس سال کے طویل زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو اُن کی پُر فیض رفاقت، بے پایاں محبت اور گرانمایہ سرپرستی کے آگے سر نیاز خم ہو جاتا ہے..... جو قرب و اعتماد مجھے ملا تھا، اس پر جتنا فخر کروں کم ہے''۔

حکیم عثمانی صاحب کی علمی و فنی قدر و منزلت خود حکیم شکیل احمد شمسی کے سامنے واضح تھی، چنانچہ جب ان کا شعری مجموعہ ''قیدِ حیات و بندِ غم'' کے نام سے طبع سے ہوا تو اس کی ایک دستخطی کاپی حکیم عثمانی صاحب کو مرحمت فرمائی اور کہا کہ کتاب کے آغاز میں 'اعتراف' اور اختتام پر 'انحراف' کے زیر عنوانات جو تاثرات قلم بند کیے گئے ہیں، ان کو خاص طور پر پڑھو اور اپنی رائے سے مطلع کرو۔

حکیم شکیل احمد شمسی نے ہر صنف پر طبع آزمائی کی، جس کو ان کے مطبوعہ بیاض میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی ذہنی مناسبت اور یگانگت کے فیضان سے حکیم عثمانی صاحب متاثر ہوئے اور انہیں بھی شعر و سخن میں دلچسپی

پیدا ہونے لگی اور کبھی کبھی ''آورد'' نہیں بلکہ ''آمد'' کے تحت شعر موزوں ہوتے رہے۔ استادِ محترم سے ''یکسانیتِ فکر'' کی جھلک شعر وسخن کی دنیا میں نمایاں ہے اور شعوری اور لاشعوری، ہر دو حال میں اپنے آفریدہ پیش رو کا پَرتو دکھائی دیتا ہے۔

غزل کے چند اشعار

نئی حیات نے عالم نیا سنوارا ہے — جو تیرے در سے دور گزری ہے
مزا یہ ہے کہ اسی زندگی نے مارا ہے — مجھے اس زندگی نے مارا ہے
سفینہ خود ہی تلاطم پسند ہے شمسی — اہلِ ہمت کو ہر جگہ ہے سکوں
نہیں تو ہر نفس موج خود کنارا ہے — جو ہے طوفاں وہی کنارا ہے
[شمسی] — [مظہر]

حکیم عثمانی صاحب کی شعر وسخن سے دلچسپی زمانۂ طالب علمی سے تھی، جس کی تصدیق ان کی اس الوداعیہ نظم سے ہوتی ہے، جو اُنھوں نے اسٹوڈنٹس یونین کی طرف سے حکیم شکیل احمد شمسی کی شان میں اُس وقت کہی تھی، جب اُن کا تقرر آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج قرول باغ، نئی دہلی میں ہوا تھا، جس کا ایک شعر حکیم عثمانی نے اپنے ایک مضمون میں نقل کیا ہے:

جس کا لکچر لاجواب اور جس کی باتیں دل پذیر
اب یہاں سے وہ شکیلِ خوش بیاں جانے کو ہے

حکیم عثمانی صاحب کا یہ اچھوتا مضمون ''تذکرۂ استاذ'' حکیم شکیل احمد شمسی: شخصیت اور فن''، مطبوعہ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، لال کنواں نئی دہلی میں شامل ہے۔ یہ مضمون حکیم شکیل احمد شمسی کی زندگی کا خلاصہ اور ان سے وابستہ خطوط پر محتوی ہے اور اس میں اُس مذموم سیاست کا بھی تذکرہ ہے، جس نے تکمیل الطب کالج میں ابنائے قدیم کی تنظیم کی تشکیل پر کاری ضرب لگائی اور اس طرح کالج کا ایک بڑا نقصان ہوا۔

حکیم بی این شرما کا مضمون بعنوان ''شدھ کا تصور: طب اور سائنس میں'' شائع ہوا، جس کا جواب عثمانی صاحب نے پندرہ روزہ مسیحا بمبئی کی اشاعت یکم دسمبر ۱۹۶۴ میں بعنوان ''طب میں شدھ کا تصور اور اس کا پس منظر'' شائع ہوا، اس کے علاوہ شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی سے خط وکتابت کا بھی ذکر ہے، جس سے حکیم عثمانی اور فلسفی صاحب کے مابین خاص تعلق کا پتہ چلتا ہے۔

''ٹیپو سلطان کے معالجات وتکنیکی تجربات'' سلسلۂ مطبوعات مجلس تحقیقات طبّی دہلی، مطبوعہ الجمعیۃ پریس، دہلی، دسمبر ۱۹۷۶ء، پر حکیم سید غلام مہدی رازؔ نے پندرہ روزہ ہمدرد، نئی دہلی کی کسی ایک اشاعت میں تبصرہ کیا تھا، ہمیں حاصل نہ ہوسکا۔ حکیم سید محمد شجاع الدین حسین ہمدانی لکھتے ہیں:

> ''حکیم عثمانی مستقل کتابیں لکھنے کے عادی نہیں ہیں، لیکن جب لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کی جودتِ طبع آسمان پر پرواز کرنے لگتی ہے، اس کی بہترین مثال ان کی کتاب ٹیپو سلطان کے معالجات ہے، ٹیپو سلطان میں ایک طبیب کی تلاش ایک محقق ہی کرسکتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بات کو سطحی نظر سے دیکھنا پسند نہیں کرتے، وہ جب کسی چیز کو دیکھتے ہیں تو نہایت عمیق اور دقیق نظروں سے دیکھتے ہیں اور اس میں کوئی نئی بات تلاش کر لیتے ہیں''۔

اس موضوع پر حکیم عثمانی صاحب کا منتشر یادداشتوں کو تحریر میں لانا، اُن کی اپنے ہدف [موضوع] کے تئیں جدّت، ذوقِ جستجو اور فنِ طب اور تاریخ سے گہرے شغف کا غماز ہے۔ یہ کتاب گرچہ کمیت میں بہت بھاری نہیں ہے، لیکن کیفیت میں اردو کے بڑے حجم والی کتابوں سے سہ چند بہتر ہے۔ اس میں تقریباً ۴۴ کتابوں کے حوالے شامل ہیں، جس سے مصنف کے فکری درک اور فنی پختگی کا اشارہ ملتا ہے۔ اس میں معلومات کو جس ہنرمندی اور قرینے سے پیش کیا گیا ہے، اس سے ایک منجھے ہوئے قلم کار اور حکیم شکیل احمد شمسی کے خاص شاگرد ہونے کا پتہ ملتا ہے۔ کتاب کا یہ اچھوتا اور منفرد موضوع ہمیں اس عظیم شخصیت پر دعوتِ فکر اور آئڈیل چننے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے جس نے ملّی اور ثقافتی سرمایہ کے تحفظ کے لیے جان کی بازی لگادی۔

علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''پرانے مورخوں کو بادشاہوں کی لڑائیوں اور درباری تماشوں کے سوا قوم کے تمدنی وعلمی حالات کے بیان میں بہت کم لطف آتا تھا، اس لیے ان کی کتابوں میں اس قسم کی معلومات بہت کم ملتی ہیں، اگر اس ملک کی تاریخ پوری طرح لکھی جاتی تو یہاں کے علمی کارنامے کچھ کم روشن نہ ہوتے''۔

سلطان ٹیپو نے ریسرچ کے لیے سب سے اعلیٰ قسم کی رصدگاہ بنوائی، جس کے مراقب وہ خود تھے، فن سپہ گری اور Advance Army School کی داغ بیل ڈالی، جس کا عملی مظہر راکٹ کی ایجاد ہے۔ ثانوی درجہ کی تعلیم

مفت مگر لازمی، مستحکم حکومت کے لیے مدافعانہ اتحاد defensive alliance، دنیا کی عظیم یونیورسٹی جامع العلوم کی تعمیر، نباتی ادویہ کی کاشت و پرداخت کے دو مثالی باغ، اس اہم اور متروک موضوع پر قلم اُٹھا کر حکیم عثمانی صاحب نے بڑی ژرف نگاہی کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے نہ صرف شخصیت اور Idealism کو بڑھاوا ملتا ہے، بلکہ ایسی منفرد اور وسیع الجہات شخصیتوں کو پڑھنے اور سمجھنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ اتنا منجھا ہوا، پختہ قلم کار اچانک خلوت کی ردا اپنے گرد ڈال کر حصار بند ہو گیا۔ حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ حکیم عثمانی صاحب کا اصل میدان درس و تدریس، طبابت اور انسانیت پروری تھا، جس کے لیے وہ پورے طور سے معروضی تھے، اس کے علاوہ اُن کی دلچسپی کا سامان سیاست کی گرہ کشائی تھی، جس کی زلف کے تا عمر اسیر رہے۔

'ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات' کا خلاصہ جہانِ طب، جلد ا، شمارہ ا، جون — اگست ۱۹۹۹ء میں طبع ہوا ہے۔ حکیم عثمانی صاحب کا ایک مضمون آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کے سالانہ میگزین ۸۸-۱۹۸۷ء میں ''یونانی طب میں استفراغ و تنقیہ کی اہمیت'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں اُنہوں نے ماہیت المرضی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عوارض کے تدارک اور اس کے علاج میں استفراغ و تنقیہ کی خاص اہمیت کو بیان کیا ہے نیز استفراغ کے قوانین کلی پر مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔ چونکہ حکیم عثمانی طب میں حذاقت کے مرتبہ پر فائز تھے، اس لیے اس کو خالص معالجاتی زاویہ سے برتا ہے نیز یہ بھی بتایا ہے کہ علاج و معالجہ کے باب میں استفراغ و تنقیہ کو understimate نہیں کیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ حکیم عثمانی صاحب نے 'پیکر فکر و عمل: حکیم عبدالحمید' مرتبہ حکیم محمد خالد صدیقی میں بعنوان ''الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے'' ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں حکیم عبدالحمید صاحب کی شخصیت سے بے انتہا متاثر اور مرعوب ہو کر درج ذیل قطعہ نقل کیا ہے:

الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے — سرخی بھی بدل جائے فسانہ بھی بدل جائے
باتوں سے نہ بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ — اپنے کو بدل لو تو زمانہ بھی بدل جائے

مذکورہ قطعہ حکیم عبدالحمید جیسی بردبار، اولوالعزم اور وضع دار شخصیت کا آئینہ ہونے کے ساتھ ہے ایک کہنہ مشق اور طرحدار قلم کار کی قوتِ اظہار کا بہترین نمونہ بھی ہے۔

حکیم وسیم احمد اعظمی نے جہانِ طب کے ''تکمیل الطب کالج نمبر'' میں حکیم عثمانی صاحب کے سوانحی احوال اور علمی آثار پر مختصر مگر قابلِ افتخار محاکمہ اور تجزیہ کیا ہے، جس میں حکیم عثمانی صاحب کی زندگی کے چہار زاویاتی عناصر تحقیق، طبابت، تدریس اور سیاسی عمل کا بھرپور جائزہ شامل ہے۔

حکیم عثمانی کے انتقال پُر ملال پر نوائے طب و صحت، جلد نمبر ۲۲، شمارہ ا، جنوری-مارچ ۲۰۱۳ء نے اس جاں گداز اور شہر آشوب سانحے کو 'سطورِ اولیں' کے عنوان سے اور اسی شمارے میں حکیم اشہر قدیر نے 'حکیم مظہر سبحان عثمانی — کچھ یادیں'' نام سے ایک تأثراتی مضمون لکھا ہے اور 'طبّی خبریں' کے تحت نوائے طب و صحت کے دفتر میں تعزیتی جلسہ، اس کے علاوہ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی جانب سے تعزیتی جلسہ کا بھی تذکرہ ہے۔

نوائے طب و صحت کے اول الذکر دونوں مضامین میں حکیم عثمانی مرحوم کی زندگی کا مختصر خاکہ، ذاتی تعلق کی بنا پر وابستہ یادیں اور ان کی رحلت سے پیدا ہونے والا طبّی خلا اور فنی زیاں اور لواحقین و متوسلین کو صبر کی تلقین وغیرہ زیر بحث ہیں۔

حکیم عثمانی صاحب کو نثر کی طرح نظم پر بھی قدرتِ کاملہ حاصل تھی، نثر کی زبان جس قدر شستہ ذوق کی آئینہ دار ہے، اسی طرح نظم بھی جذبات و احساسات کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ نثر کی طرح نظم میں بھی کمیت نہیں ہے، لیکن جو بھی ہے، وہ دلوں میں بے ساختہ اترنے والی ہے اور گھر کر جانے والی ہے۔ اشعار پر علمی اور فنی محاکمہ تو اہل فن اور اہل نظر جانیں، لیکن میری کوشش ہے کہ اشعار کی یہ غیر مطبوعہ بیاض 'سوزِ دروں' حکیم صاحب کے دیگر احوال و آثار کے ساتھ طبع ہو کر عام مرجع خلائق بنے اور ادبی دانشوروں میں اس کی توقیت ہو۔

حکیم عثمانی صاحب خالص تغزل کے شاعر تھے، شعوری و لاشعوری طور پر خود کو تغزل کے دائرہ کار سے باہر نہ لا سکے۔ اردو غزل کی تثلیث میں عاشقی، رندی اور تصوف ہے، اول الذکر دونوں صفات حکیم عثمانی کے یہاں ملتی ہیں اور ان دونوں میں اُنھوں نے عاشقی کو ترجیح دی ہے، اُن کی شاعری میں بلا کی غنائیت ہے اور مصرعے اس قدر سجے سجائے اور ڈھلے ڈھلائے

ہیں کہ اس میں موزونیت اور نغمگی خود بخود آ جاتی ہے اور پڑھتے وقت قاری کو ہر پل جمالیات کا ایک لطف حاصل ہوتا ہے۔ نیاز فتح پوری نے لکھا ہے:

''میں کسی شاعر کے کلام پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ وہ فطرت کی جانب سے شاعر بنا کر بھیجا گیا ہے یا وہ اپنے کو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنے میں فطرت سے جنگ کر رہا ہے''۔

اس کے صحیح مصداق حکیم مظہر سبحان عثمانی اور ان کی غزلوں کے چند منتخب اشعار دعوے کی روشن دلیل ہیں:

خوشی دیکھتے ہیں نہ غم دیکھتے ہیں
فقط تیری مرضی کو ہم دیکھتے ہیں
نہیں پائیں گے اپنی منزل وہ مظہرؔ
جو غیروں کے نقش قدم دیکھتے ہیں

اے عزم مکمل جو سہارا ترا پاؤں
دنیا کے اندھیرے میں نئی شمع جلاؤں
شاعر ہوں مگر یہ تو ضروری نہیں مظہرؔ
ہر سلسلۂ زلف کو زنجیر بناؤں

درد دل کو جو بڑھا دیتے ہیں
ہم اُنھیں دل سے دعا دیتے ہیں
مُسکراتے ہیں جب وہ اے زخمیؔ
اور ایک تیر چلا دیتے ہیں

سہارا چاہئے کوئی بشر کو
بڑھا دیجے ذرا دردِ جگر کو
بہت ہے اک جھلک جلوے کی مظہرؔ
سہارا چاہئے ذوقِ نظر کو

الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے
سرخی بھی بدل جائے، فسانہ بھی بدل جائے
باتوں سے نہ بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ
اپنے کو بدل لو تو زمانہ بھی بدل جائے

جسے تیرے غم نے سنوارا نہیں ہے
نہیں ہے وہ آنسو ہمارا نہیں ہے
کٹے زندگی دوسروں کے کرم پہ
ہمیں ایسا جینا گوارا نہیں ہے

اچھا یہ طریقہ ہے ساقی! رندوں میں ہمارا نام بھی ہے
پینے بھی نہیں دیتا ہم کو، پینے کا مگر الزام بھی ہے
دنیا کو دکھانے کی خاطر توڑوں گا نہ پیمانہ زاہد
توہین مذاق زہد بھی ہے توہین شکست جام بھی ہے

مصادر و مراجع

۱- کتاب الشفا: الالٰہیات، ابن سینا The Metaphysics of the Healing, Brigham Young. University Press 1st E dition, 2005 USA, p. 3

۲- اردو دنیا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، جولائی ۲۰۱۴، نئی دہلی، ص ۵۶

۳- جہانِ طب، تکمیل الطب کالج نمبر حکیم وسیم احمد اعظمی، ص ۲۹۹-۲۹۸ سی سی آر یو ایم، نئی دہلی۔

۴- ''تذکرۂ استاذ'' حکیم مظہر سبحان عثمانی، حکیم شکیل احمد شمسی — شخصیت اور فن، آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، لال کنواں، نئی دہلی، ص ۱۳۹-۱۴۹

۵- ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات از حکیم مظہر سبحان عثمانی، سلسلہ مطبوعات مجلس تحقیقات طبّی دہلی، الجمعیۃ پریس، دسمبر ۱۹۷۶ء

۶- نوائے طب و صحت، جنوری — مارچ، ۲۰۱۳ء، جلد ۲۲،

۷- سالانہ میگزین ۸۸-۱۹۸۷ء، اے اینڈ یو طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی، کلاسیکل پرنٹرز چاوڑی بازار

۸- ٹیپو سلطان کا علمی و طبّی ذوق از حکیم مظہر سبحان عثمانی، جہانِ طب، جون-اگست، ۱۹۹۹ء، سی سی آر یو ایم، نئی دہلی۔

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی

☆حکیم مقبول احمد خاں

☆حکیم محمد نفیس خاں

بہت سال پہلے کی بات ہے ایک سیمینار کے سلسلے میں دلی جانا ہوا، حکیم وسیم احمد اعظمی جو اس وقت سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ کے سربراہ ہیں، وہ بھی اس سیمینار میں شریک تھے۔ اس دور میں طب یونانی کے حوالے سے منعقد ہونے والی ہر تقریب میں حکیم مظہر سبحان عثمانی نمایاں حیثیت سے مدعو کیے جاتے تھے۔ اس موقع پر وسیم صاحب نے مجھ کو عثمانی صاحب کا انٹرویو لینے کے لیے اکسایا۔ پہلے تو میں چکرایا پھر انکار کیا اور آخر کار اپنی سیاسی دلچسپیوں کے تحت انٹرویو لینے کے لیے تیار ہو گیا۔

میری خوش قسمتی کہ حکیم صاحب نے مجھے پہلی ہی کال پر اپنے گھر آنے کی اجازت دے دی۔ میں دوسرے ہی دن صبح کو ان کے در دولت پر حاضر ہو گیا۔

میں ان کی رہائش گاہ کے بارے میں ایک تصوراتی محل بنا کر گیا تھا جو وہاں پہونچتے ہی زمین بوس ہو گیا۔ میں تو ایک جدید اور عالیشان بنگلے کے بارے میں سوچ کر گیا تھا لیکن وہاں تو ایک سادہ سا مکان اور اس کے سادہ مکین میرے منتظر تھے۔ بہر حال میں اس بات پر خوش اور مطمئن تھا کہ حکیم مظہر سبحان عثمانی، جو اس وقت بہت اہمیت اختیار کر گئے تھے، اپنے گھر میں میرا استقبال کر رہے تھے اور انٹرویو کے لیے رضامند ہو گئے تھے۔

سلام دعا کے بعد میں نے ان سے سوالات پوچھنے شروع کیے اور مجھے آج ان کے انتقال کے بعد بھی یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ انہوں نے مجھے اپنے بارے میں جو تفصیلات بتائیں وہ اتنی رنگا رنگ تھیں کہ حقیقت کے بجائے افسانہ کا گمان ہو جائے۔

انہوں نے مجھے اسی موقع پر یہ بتایا تھا کہ انہوں نے اپنا سیاسی سفر جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے شروع کیا تھا لیکن ان پارٹیوں کے تضاد سے بھر پور رویوں نے انہیں بھارتیہ جن سنگھ یعنی موجودہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی صفوں تک پہونچا دیا اور انہیں قومی اقلیتی کمیشن کے نائب صدر کی حیثیت سے وزارت کا مرتبہ، گاڑی اور بنگلہ بھی دلایا۔ بہر حال اس وقت تک وہ نائب صدر نہیں ہوئے تھے اور وہ انٹرویو ان کے قرول باغ کے مکان میں لیا گیا تھا۔

اس انٹرویو میں انہوں نے مجھے اپنی صحافتی اور ادارتی ذمہ داریوں کے بارے میں بھی بتایا تھا اور یہ ذکر بھی کیا تھا کہ انہوں نے شہید ٹیپو سلطان کے معالجاتی و تکنیکی تجربات پر ایک کتاب لکھی ہے جو عرصہ پہلے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا نسخہ طلب کرنے پر انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس اب کوئی بھی نسخہ نہیں ہے، اور وہ خود چاہتے ہیں کہ کوئی انہیں اس کا ایک ہی نسخہ لا دے تا کہ وہ اس پر نظر ثانی کر کے دوبارہ شائع کر سکیں۔ وہ انٹرویو میں نے ترتیب دے کر ایک دوست کو شائع کرنے کے لیے دیا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ شائع نہ ہو سکا، شاید کبھی شائع ہو جائے تو حکیم صاحب کی زندگی کے کچھ ایسے گوشے اجاگر ہو جائیں جو اس سے پہلے کسی نے دریافت نہیں کیے تھے۔

حکیم وسیم احمد اعظمی کی وساطت سے عثمانی صاحب کی کتاب کا نسخہ دیکھنے کو ملا جو دراصل فوٹو کاپی ہے اور جسے حکیم وسیم صاحب نے غالباً بنگلور کے کسی طبیب سے جن کے پاس اصل نسخہ تھا فوٹو کاپی کرا کر منگایا ہے۔ کتاب کا نام ہے 'ٹیپو سلطان کے معالجات و تکنیکی تجربات' ہے۔ اسے سلسلہ مطبوعات مجلس تحقیقات طبّی، دہلی کی طرف سے دسمبر ۱۹۷۶ء میں شائع کیا گیا ہے۔ تعداد اشاعت پانچ سو اور قیمت صرف ۶/روپئے تھی۔ ملنے کا پتہ، طبیہ

☆ ریسرچ آفیسر [یونانی]، سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ

کالج، قرولباغ، دہلی درج ہے، جو دراصل حکیم صاحب کی قیام گاہ تھی۔

کتاب کا ایک صفحہ مؤلف کے بارے میں ہے جس میں حکیم صاحب کی تاریخ پیدائش یکم جولائی ۱۹۳۸ء درج ہے، اور مشغلہ حال آنریری لکچرار ہمدرد طبّی کالج دہلی مرقوم ہے، کتاب میں کل ۶۴ صفحات ہیں اور آخری صفحہ پر مجلس تحقیقات طبّی دہلی کے اغراض و مقاصد درج ہیں۔

کتاب کا انتساب حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم و مغفور کے نام ہے، جو حکیم عبدالحمید صاحب کے تئیں ان کی عقیدت کا اظہار تھا، کتاب پر تعارفی کلمات لکھنے کا فریضہ کویراج برہم دت شرما سابق پرنسپل آیورویدک اینڈ یونانی طبّی کالج، دہلی نے انجام دیا ہے، جب کہ پیش لفظ اردو کے معروف افسانہ و ناول نگار اور ہمدرد کے مشہور حکیم جناب کوثر چاند پوری نے لکھا ہے۔ حرف آغاز خود مصنف کے قلم سے ہے، جس میں مصنف نے ہمدرد کے حکیم اقبال احمد کی طرف سے ۱۹۷۲ء میں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس میں شرکت کی دعوت کو حکم نامہ قرار دیتے ہوئے سفر میسور و سرنگا پٹنم اور وہاں آثار سلطانی کی زیارت کا موقع ملنے کا ذکر کیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں مسلم سلاطین کی علم نوازی، کتاب خانوں سے ان کا عشق اور نادر و نایاب کتابوں کے حصول کا ذوق و شوق، اور ان میں سے بعض کا شوقِ مطالعہ، ادب نوازی، طب و صحت کے علوم سے ان کی دلچسپی، خصوصاً ٹیپو سلطان کی غیر معمولی سائنسی مہارت اور طبّی حذاقت کا ذکر بڑے دل نشیں انداز میں کیا گیا ہے۔

ٹیپو سلطان کے کتب خانہ کی تعریف و توصیف کے بعد، سلطان کے قائم کردہ ''جامع العلوم'' کا خاکہ بھی بیان کیا گیا ہے جو درحقیقت اس وقت کے ہندوستان کی سب سے بڑی یونیورسٹی کی حیثیت رکھتا تھا اور جس کی بربادی کو انگریز اپنی کامیابی ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ہندوستان میں غلامی کو مضبوط کرنے کا اہم ستون سمجھتے تھے۔ صفحہ ۳۴ پر سلطان کی تصنیف کردہ کتاب ''فتح المجاہدین'' کا ذکر ہے اور اس کتاب کا ضمیمہ خاص طور پر لائق توجہ بتایا گیا ہے جس میں سگ دیوانہ، سانپ، بچھو وغیرہ زہریلے جانوروں کے کاٹ کھانے کا علاج بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سے پہلا نسخہ سانپ کے کاٹے کا علاج ہے۔

> ''جس شخص کو سانپ نے کاٹا ہو اس کو انکولے کی جڑ جس میں کانٹے نہ ہوں ایک ہون پانی میں گھس کر پلائیں اور وہی جڑ پیس کر زخم پر لیپ کریں''۔[۱]

ایک اور نسخہ اس طرح ہے:

> ''شالی کی جڑ سوکھی ہوئی یا کچی، دھو کر صاف کر کے کاٹ کر شیرہ نکالیں اور مارگزیدہ کو پلائیں، یہ جڑ ایک کدہ سے زیادہ استعمال نہ کریں ایک کدہ سے زیادہ ہو تو یہ زہر کی خاصیت پیدا کرتا ہے اور انسان مرجاتا ہے''۔[۲]

> ''گھوڑے کو بھی اگر سانپ نے کاٹ لیا ہو تو یہی علاج کریں، مگر گھوڑے کے لیے دوا کی مقدار ۴ ہون ہونی چاہیے''۔[۳]

بچھو کاٹنے کا علاج:

اگر کسی شخص کو بچھو نے کاٹ لیا ہو تو تین پتے ''کسوندی'' کے کھلائیں اور تھوڑی مقدار میں ہاتھ سے مل کر زخم پر لگائیں۔[۴]

سلطان ٹیپو شہید کو یونانی علاج سے اس قدر لگاؤ تھا اور ان کی معلومات اس قدر وسیع تھیں کہ وہ اپنے سفراء کو جو دوسرے درباروں میں متعین تھے علاج کے متعلق مشورے دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ محمد غیاث خان سفیر سلطنت خداداد برائے دربار پونہ کے نام ۱۶/احمدی ۱۷۸۵ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''پونا کی آب و ہوا کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے ہمارے اطباء نے اس مرض کو دفع کرنے کا مؤثر علاج دریافت کرلیا ہے علاج یہ ہے کہ سب سے پہلے مریض کے جسم سے پچھنے لگا کر غلیظ خون کو کھینچ لیا جائے۔ اس کے دور ہوتے ہی مریض کی حالت قابو میں آجائے گی۔ اس کے بعد بقیہ جو کچھ ہے اس کو ادویات کے ذریعہ دور کردینے سے مریض صحت یاب ہوجائے گا۔ یہی نہیں اگر کوئی نئی دوا دریافت ہوتی، تو اپنے تحقیقی مزاج کی وجہ سے سلطان اپنے عُمّال کو وہ دوا تحفہ میں بھیج کر اس کی اثر پذیری کی تحقیق بھی کرتا تھا''۔

غلام علی خان کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا:

> ''سرکار خداداد کے اس علاقہ میں ''کافور'' کے درخت دریافت ہوئے ہیں۔ اس درخت کے تیل کی دو شیشیاں تم کو بھیجی جارہی ہیں تم اپنے پیروں پر اس کا استعمال کرو اگر اس سے کچھ فائدہ پہنچے تو حضوری میں اطلاع دی جائے''۔[۶]

غالباً غلام علی خان کو گٹھیا کی تکلیف تھی جس کے لیے سلطان نے اس کو تیل کی شکل میں دوا بھیجی تھی۔ اسی طرح سلطان کے ایک اور خط میں سنگ گردہ و مثانہ کے علاج میں قے کے استعمال کا ذکر ہے۔

ایک اور خط جو چشتی یار خان کے نام ہے اور جس پر ۲۰/ بہاری ۱۷۸۶ء کی تاریخ درج ہے، اس میں گردہ کی پتھری کی دوا کے بھیجنے اور قے کی ذریعہ مثانہ میں پتھری کے علاج کا تفصیلی ذکر ہے۔

ایک اور خط جس کو نقل کرنے کا جی چاہتا ہے اور جس میں بقول

حکیم مظہر سبحان عثمانی سلطان کے اس جذبۂ مقدس کا عکس نمایاں ہے جو اپنے ملک کے علوم وفنون اور خاک وطن کی پنہاں دولتوں کے متعلق، اس کے دل میں موجزن تھا اور جس خط کی تحریر کو حکیم عثمانی صاحب حرز جاں بنائے جانے کے قابل گردانتے ہیں اور جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان ٹیپو کی شہادت صرف ایک بادشاہت، ایک سلطنت اور ایک حکومت کا خاتمہ، یا پھر صرف ایک علاقہ کا نقصان نہیں تھا بلکہ وہ طب یونانی سمیت ان تمام ہندوستانی علوم وفنون کے زوال کا تتمہ تھا جنہیں انگریز اپنے قومی علوم وفنون یا صنعت وحرفت کے ہم پلہ یا مد مقابل سمجھتے تھے۔ یہ خط خواجہ اعتمادی کے نام ہے۔

۱۴؍طلوعی [۱۷۸۵ء]

''تمہاری مرسلہ ادویات میں چند ایسے عطریات کے نام مندرج پائے گئے جو یورپین ممالک کی پیداوار ہیں لہذا حکیم محمد بیگ سے مشورہ کر کے تم ان کے بجائے یونانی ادویات تجویز کرو''۔[۷]

حکیم عثمانی آگے لکھتے ہیں:

''فرنگی سامراج جس سے ٹیپو سلطان زندگی بھر برسرپیکار رہا، ڈیڑھ سو سال تک ہندوستان کو غلام بنائے رکھنے کے بعد رخصت ہوگیا مگر افسوس کہ اہل ملک کو اس کا اندازہ بھی نہیں کہ ٹیپو جیسے صاحبِ علم وحکمت حکمراں سے محروم ہوجانے کے باعث طب یونانی کو کتنا زبردست اور عظیم نقصان پہونچا۔ ٹیپو اگر کچھ دن اور زندہ رہتا اور اسے اپنی تحقیق اور طبّی جستجو کے عزائم کو بروئے کار لانے کا موقع ملا ہوتا تو ہندوستان میں سرنگاپٹم رشکِ بغداد قرطبہ ہوتا''۔[۸]

حکیم مظہر سبحان عثمانی اپنی طبّی و معالجاتی مشغولیات اور سیاسی سرگرمیوں کے باعث تصنیفی سرگرمیوں کو زیادہ وقت نہ دے پائے تھے۔ لیکن اس ایک رسالے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر اس میدان میں وہ اپنے جوہر دکھاتے تو یقیناً طبّی دنیا کو بہت فائدہ پہونچاتے۔ جہاں تک سوال ہے ان کی طبابت کا تو میرے خیال میں کویراج برہم دت شرما سابق پرنسپل آیوویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، دہلی کا یہ اعتراف کافی سے زیادہ ہے:

''طبیہ کالج اسپتال میں ان کے پاس مریضوں کی بھاری تعداد کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کہ آج سے بہت پہلے کے روایتی طرز کے حکیموں کے مطب میں مریضوں کا ہجوم ہے''۔

میں ان کے بہت سے شاگردوں اور دوستوں سے ملا ہوں بعض ایسے حضرات سے بھی ملا ہوں جو ان کے زبردست ناقد تھے، ان میں اطباء بھی تھے اور وہ بھی جو سیاسی گلیاروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو حکیم عثمانی جیسے لوگوں کا سخت مخالف تھا، لیکن جہاں تک سوال ہے ان کی فنّی حذاقت کا، طب سے ان کی محبت کا اور اپنے قومی علمی اداروں سے ان کے بے پایاں عشق کا، سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ عثمانی صاحب بالکل سچے اور کھرے انسان، کامیاب معالج اور کامیاب سیاستداں تھے۔ ان کے مطب میں مریضوں کی بھیڑ ہمیشہ رہی۔ اس وقت بھی جب وہ طبیہ کالج میں استاذ تھے اور اس وقت بھی جب وہ ریٹائر ہوگئے تھے اور پرائیویٹ پریکٹس کر رہے تھے۔ بعض لوگوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی آمدنی اور مریضوں کا مرجوعہ دونوں بڑھ گئے تھے۔

کونسل میں جب وہ سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر ہوئے اور لکھنؤ کے سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے دورے پر آئے تو انہوں نے سب سے زیادہ توجہ طبّی تحقیق اور مریضوں کی بھلائی پر دی۔ جن سیمیناروں میں وہ شریک ہوئے ان میں انہوں نے طب یونانی کا بھرپور دفاع کیا اور اپنے مخصوص انداز میں، جس میں اردو زبان کا ادبی ذائقہ بھی ہوتا تھا، صاحبان اقتدار، اطباء اور محققین کو یونانی طب اور ہندوستانیت پر یقین رکھنے کی تلقین کو اپنا شیوہ بنائے رکھا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کو اپنے وطن گورکھپور اور اپنے دوسرے وطن اور مادر علمی کے شہر لکھنؤ سے عشق تھا مگر مقدرات پر کسی کی چلی ہے کہ ان کی چلتی، اس لیے وہ چاہنے کے باوجود اپنے وطن یا شہر نگاراں لکھنؤ میں قیام نہ کر سکے اور اپنے عملی شہر جسے جہان آباد بھی کہا جاتا ہے اقامت گزیں ہوئے اور آخر اسی شہر میں اپنی جان جانِ آفریں کے حوالہ کردی۔ ان کے انتقال کے ساتھ ہی دہلی میں قدیم وراثت کے حامل اطباء کے اس گروہ کا بھی خاتمہ ہوگیا جس کے سرخیل حکیم اجمل خاں جیسے عبقری طبیب تھے۔

حوالہ جات

۱- ٹیپو سلطان کے معالجات وتکنیکی تجربات حکیم مظہر سبحان عثمانی، سلسلۂ مطبوعات، مجلس تحقیقات [دہلی] یکم دسمبر ۱۹۷۶، ص ۳۴

۲- ایضاً: ص ۳۴

۳- ایضاً: ص ۳۵

۴- ایضاً: ص ۳۶

۵- ایضاً: ص ۴۰

۶- ایضاً: ص ۴۱

۷- ایضاً: ص ۵۹

۸- ایضاً: ص ۶۰

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی: میرے استاذ، میرے مربی

☆حکیم ضیاء الحق صدیقی

ہر طالب علم کو اپنے حصولِ علم کے مختلف ادوار میں متعدد اساتذۂ فن سے کسبِ فیض کا موقع ملتا ہے۔ گرچہ ایسے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہوتی ہے، جو تعلیم کی مقررہ میعاد ختم ہوجانے کے بعد بھی اپنے شاگردوں کی تکنیکی صلاحیتیں نکھارتے اور ملک، قوم اور معاشرہ کے تئیں ذمہ داریوں کا احساس دلاتے اور فکری رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی ایک بلند قامت اور دلآویز شخصیت کے حامل میرے استاذ، میرے مربی حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم بھی تھے۔ استاذِ محترم سے میرا تلمذانہ تعلق قریباً ۲۵ سال سے زیادہ عرصہ پر بسیط تھا اور اس عرصہ میں مجھے اُن کی شفقت، بے پناہ محبت اور بھرپور سرپرستی حاصل رہی ہے، جو میری زندگی کا گراں قدر اثاثہ ہے۔ عثمانی صاحب کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں میں ہوگی، لیکن میں اُن خوش نصیبوں میں ہوں، جنہیں اُن کا قُرب اور اعتماد نسبتاً زیادہ حاصل رہا ہے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی مشرقی اتر پردیش کے ضلع گورکھپور کے موضع صمد پور کے ایک متمول خاندان میں یکم جولائی ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ اعظم گڑھ اور فیض آباد کے متعدد مدارس میں عربی درسیات کی تحصیل کی۔ طبّی علوم کی تحصیل کے لیے لکھنؤ طبّی دبستان کے نمائندہ تکمیل الطب کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۵۹ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کا شمار لکھنؤ طبّی اسکول کے نمائندہ طبیبوں میں ہوتا ہے۔ اُن کے اساتذہ میں حکیم خواجہ شمس الدین لکھنوی، حکیم شکیل احمد شمسی اور حکیم مسیح الزماں ندوی جیسے یکتائے فن شامل تھے۔ ان میں اوّل الذکر دونوں اساتذہ کی شخصیت کے نقوش اُن پر گہرے تھے۔ حکیم شکیل احمد شمسی تو اُن کے آئیڈیل تھے۔ حکیم عثمانی صاحب کو علاج معالجہ سے غیر معمولی شغف تھا۔ اُن کے متذکرہ بالا تینوں اساتذہ بھی درس وتدریس کے ساتھ ہی مطب ومعالجہ سے بشدت وابستہ تھے اور طب کے دبستانِ لکھنؤ کا اعتبار تصور کیے جاتے تھے۔ یہ اعتبار بعد میں حکیم عثمانی صاحب کو بھی حاصل ہوا۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے تکمیل الطب کالج، لکھنؤ سے طبّی درسیات کی تکمیل کے بعد ۱۹۶۰ء میں گورکھپور میں 'ہمدرد' سے اپنی مطب کی زندگی کا آغاز کیا، پھر دہلی کے لیے رختِ سفر باندھا اور ۱۹۶۴ء میں جامعہ طبّیہ میں لکچرر اور اسپتال کے انچارج مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں ہندوستانی دواخانہ کے انچارج کا عہدہ سنبھالا، ۱۹۷۰ء میں آیورویدک اینڈ یونانی طبّیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی کے شعبۂ معالجات میں لکچرر اور اس کے اسپتال کے یونانی شعبہ کے انچارج ہوئے۔ بعد میں اسی ڈیپارٹمنٹ میں ریڈر ہوئے اور ۱۹۹۸ء میں سبک دوش ہوئے، سبک دوشی کے بعد وہیں پروفیسر ایمیریٹس مقرر ہوئے۔

درس وتدریس:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کا مقام بحیثیت معلم بہت بلند تھا، اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ درس وتدریس میں گزرا، ایک ایسے معلم کی طرح، جس کے علم و تجربہ کے حدود کی تعیین نہیں کی جاسکتی، ایک ایسے ٹیچر جن کی کلاس میں طلباء اپنی موجودگی کو یقینی اور لازمی بنا کر خوشی اور فخر کی ملی جلی کیفیت سے دوچار ہوتے۔ ایک ایسے استاذ، جن کے ایک ایک لفظ کو اُن کے شاگرد اپنی سماعتوں میں محفوظ کرلینے کا جتن کرتے۔ اُن کے کلاس روم کے ماحول کا آج جب میں تصور کرتا ہوں تو ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہوتا ہے، اُن

☆ ریسرچ آفیسر [یونانی]، سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ

کا کلاس روم میں ٹہل ٹہل کر پڑھانا اور یہ کوشش کہ 'بیک بنچرس' تک بھی آواز پہنچ جائے اور آواز بھی ایسی دلآویز کہ کانوں میں رس گھولے، ہر لفظ واضح، صاف اور بامعنی۔ طب کے گنجلک مباحث کو وہ اس انداز میں سمجھاتے کہ طالب علم کے لیے ان کا سمجھنا بہت آسان ہو جاتا۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی کے لیے یہ سب کچھ اس لیے بھی بہت آسان تھا کہ طبّی ادبِ عالیہ پر اُن کی نظر تھی، اس پر مستزاد اُن کی غیر معمولی ذہانت، اِسی لیے طلبہ اُن کی کلاس میں حاضری کو خود پر لازم کر لیتے تھے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے مجھے معالجات کا درس دیا اور مطب و نسخہ نویسی کی تربیت دی تھی، اِن مضامین کی تدریس اور تربیت میں اُنہیں کمال حاصل تھا، معالجات پڑھاتے وقت ماہیتِ مرض، اسباب، علامات، تشخیص فارقہ، اصول علاج، علاج اور پرہیز و غذا پر جس انداز میں گفتگو کرتے تھے، اس سے موضوع پر اُن کے وجدان کا پتہ چلتا تھا۔ پڑھانے کا یہ انداز اُنہوں نے حکیم شکیل احمد شمسی سے سیکھا تھا، کہ بیشتر مجالِ زندگی میں وہ اُن کے آئیڈیل تھے۔ اُن کا مطب، طب کے دبستانِ لکھنؤ کا پابند تھا، کہ یہی اُن کی اولین پسند تھی، جس کی تربیت اُنہوں نے حکیم خواجہ شمس الدین لکھنوی سے حاصل کی تھی۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی نظر طبِ جدید پر بھی تھی، اُنہوں نے یونانی طب کے مبادیات کے تناظر میں اس کا مطالعہ کیا تھا اور تشخیص مرض میں اس سے خاص مدد لیتے تھے، اصولِ تشخیص کے قدیم طریقوں کو بھی بشدت برتتے تھے، نبض، بول و براز کے ذریعہ تشخیص کو اہمیت دیتے تھے۔ اُن کی اِس روش سے طلباء کو بہت فائدہ ہوتا تھا، کہ ایک محقق نظریہ اُن کے سامنے آجاتا تھا۔

مطب و معالجہ:

یہ حقیقت ہے کہ حکیم مظہر سبحان عثمانی طب میں حذاقت کے مرتبہ پر فائز تھے، وہ طبِ جدید پر نظر رکھنے کے باوجود معالجہ میں وہ صرف طبِ یونانی کو ترجیح دیتے تھے، وہ بھی بقراطی اصولِ علاج کے ساتھ۔ اس مرحلہ میں وہ کسی بھی طرح کی آمیزش کے سخت خلاف تھے۔ میں نے اپنی انٹرن شپ کے دوران طبّیہ کالج کی اُن کی او پی ڈی میں تقریباً چھ ماہ حاضری دی۔ اُن کی او پی ڈی بڑی بھری پُری ہوتی تھی، اس میں نہ صرف دہلی، بلکہ دوسری متصل ریاستوں سے بھی بڑی تعداد میں مریض آتے اور شفایاب ہو کر جاتے۔ معالجہ میں اُن کی پہلی ترجیح مفرد دواؤں سے علاج کی ہوتی، لیکن بعض اوقات مرکب دوائیں بھی لکھ دیا کرتے۔ اُن کے مطب میں یومیہ ۵۰ سے ۱۰۰ مریض آیا کرتے، کبھی یہ تعداد ۱۰۰ سے بھی متجاوز ہو جاتی، جن میں امراض مزمنہ کے مریضوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہوتی تھی۔ امراض معدہ و امعاء، امراض گردہ و مثانہ، امراضِ جلد، وجع المفاصل اور جنسی امراض کے علاوہ ایک بڑی تعداد ڈیپریشن کے مریضوں کی ہوتی تھی۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کا مطب مرجعِ عوام و خواص تھا، اگر رکشہ چلانے والا غریب جفاکش اُن کا مریض تھا تو ایوانِ حکومت کا حاکمِ اعلیٰ بھی شفا کی تلاش میں اُن کے یہاں حاضری دیتا تھا اور حکیم صاحب کی توجہ دونوں پر یکساں ہوتی تھی۔ اُن کے یہاں شاہ و گدا، دونوں برابر تھے، کسی پر کسی کو ترجیح نہیں تھی، البتہ غریبوں کی طرف جھکاؤ کسی قدر زیادہ تھا۔ میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں یرقان میں مبتلا ہوا، چند یوم تک طالب علمانہ جوش میں 'خود علاجی' کرتا رہا، لیکن شفا نہ ملی اور دیگر عوارض کے اندیشے سے عثمانی صاحب کے علاج میں آیا اور بفضل خداوندی جلد ہی مکمل شفا مل گئی۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی شخصیت کے دو پہلو سب سے نمایاں تھے، تدریس اور مطب، چنانچہ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی اُنہوں نے مطب کا سلسلہ جاری رکھا، بلکہ اور بھی یکسوئی کے ساتھ علاج میں مصروف ہو گئے تھے۔ مریضوں کا مرجوعہ اُسی طرح تھا، بلکہ اس سے کچھ سِوا۔ غرض مطب و معالجہ کے حوالہ سے اُنہوں نے بہت مصروف زندگی گزاری اور تاحیات بیماروں کی خدمت کی۔

طبّی اداروں سے وابستگی:

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے بہت سرگرم زندگی گزاری ہے، طبِ یونانی کے حوالہ سے بھی اور سیاست کے حوالہ سے بھی۔ طبّی اداروں سے وابستگی کا حال یہ تھا کہ ہندوستان کے سب سے بڑے طبّی تحقیقاتی ادارے سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی کی متعدد کمیٹیوں کے اہم اور سرگرم رُکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیں، ریسرچ آفیسر اور دوسری اسامیوں کے سلکشن میں نمایاں طور پر شامل رہے۔ طبّی تعلیمی اداروں سے بھی مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے اور سب سے اہم بات یہ کہ جس کمیٹی میں رہے، اپنے فنی اور شخصی وجود کا احساس دلاتے رہے۔

پان کا شوق:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کو پان کھانے کا بڑا پاکیزہ مذاق تھا، اس میں بھی اُن کی نفاستِ طبع کو بڑا دخل تھا، وہ ہر کس و ناکس کے ہاں کا پان

نہیں کھاتے تھے۔ کالج سے قریباً ایک فرلانگ دور ''سنجو پان والا'' اُن کی پسند کے پان لگاتا تھا اور مقررہ وقت پر، دونوں پہر پہنچاتا تھا، اگر کسی وجہ سے پان نہیں پہنچا تو کلاس یا او پی ڈی سے کسی کو بھیج کر منگوایا جاتا، اُن کی پان کھانے کی عادت ایسی تھی کہ کلاس، او پی ڈی اور عام محفلوں میں بھی کھایا کرتے تھے، اُن کے پان کی خوشبو بھی کیا خوب ہوتی تھی، کہ سارا ماحول بھینا بھینا ہو جاتا تھا۔ اُن کے پان کھانے کے طریقے میں بھی بڑی نفاست تھی، پان کی گلوری جس نفاست سے منہ میں رکھتے، وہ دیکھتے بنتی تھی۔ لیکن روایتی حکیموں کے برخلاف پیک کا ذرا بھی نشان کہیں نہیں ملتا تھا۔

ظرافتِ طبع:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی طبیعت میں بے پناہ ظرافت تھی، جس کا اظہار اطبّاء کی جماعت میں خوب خوب ہوتا تھا، طلباء کی موجودگی میں بھی بے ساختہ اس طرح کی باتیں ہو جایا کرتی تھیں، لیکن اس میں لیے دیئے رہنے کی امکانی کوشش بھی ہوتی تھی، تاہم زیرک طلبہ اس سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے، کیونکہ اس میں بے ساختگی ہی کچھ اس ڈھب کی ہوتی تھی۔ معاصر اطبّاء میں ذرا اور بھی کھل جاتے تھے، لیکن اس میں بھی اُن کا وقار قائم رہتا تھا۔ اُنہوں نے کبھی بھی اپنے گرد خود ساختہ سنجیدگی اور علمیت کا حصار نہیں کھینچا تھا۔ ڈاکٹر خاور ہاشمی نے ماہنامہ ہمدرد، دہلی کی جلد ۵۶، شمارہ ۲، کے اداریہ میں اُن ظرافت اور بذلہ سنجی کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''عثمانی صاحب مرحوم نہایت بذلہ سنج اور خوش مزاج شخصیت کے حامل تھے، اُن جیسا بلند اور زندگی کی توانائی سے بھرپور قہقہہ طبّی دنیا میں اور کہیں نہیں سنا۔ قہقہے کے پیچھے سستا ٹھٹھول یا پھکڑ پن نہیں ہوتا تھا، ایک سنجیدگی اور سلیقہ ہوتا تھا، یہ حزن و ملال کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبھرتا تھا اور اس میں زندگی گوارا اور خوشگوار بنانے کی ایک کوشش ہوتی تھی۔''

سیاست کی طرف رجحان:

حکیم مظہر سبحان عثمانی کو ملکی سیاست سے نہ صرف دلچسپی، بلکہ موقع محل کی رعایت سے عملی وابستگی بھی تھی۔ اس میں بھی اُنہوں نے اپنی کمیونٹی کے عام مزاج کے خلاف جس پارٹی سے رشتہ قائم کیا تھا، وہ 'جن سنگھ' تھی، جو بعد میں 'بھارتیہ جنتا پارٹی' قرار پائی۔ اس پارٹی سے اُن کی وابستگی کی وجہ سے اُنہیں ایک دور میں غیر معمولی نقصان بھی اُٹھانا اور ملازمت سے معطّلی تک نوبت آئی، لیکن اُنہیں اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اُنہوں نے مزاج ہی کچھ ایسا پایا تھا کہ وہی کہو جو خود کو سچا لگے اور وہی کرو جو خود کو اچھا لگے، وہ معاشرے کے عام مزاج اور رائج سوچ سے ذرا بھی متزلزل نہ ہوتے تھے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی بھی نے اُن کی فراخ دلانہ قدر افزائی کی اور اُنہیں پارٹی میں اور پارٹی سے باہر بڑے اہم عہدوں پر فائز کیا۔ وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کی ریاستی اور مرکزی کمیٹیوں کے اہم اراکین میں شمار کیے جاتے تھے۔ کچھ کمیٹیوں کی سربراہی بھی تفویض ہوئی تھی۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی مجھ پر اس قدر اعتماد کرتے تھے کہ بعض سیاسی مقاصد سے وہ مجھے بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر دفتر بھیجنے میں ذرا بھی جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے۔ وہیں میں نے سراج پراچہ صاحب کو دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے اپنے دولت کدہ پر بلا کر پارٹی کے ایک جلسہ میں اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ طلبہ کو لانے کا حکم دیا تھا اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے استاذِ محترم کے حکم کی بھرپور تعمیل کی تھی۔ اسی جلسہ میں پارٹی کے سرکردہ مسلم چہرہ سکندر بخت اور مشہور فلمی اداکار شترو گھن سنہا کو پہلی بار بہت قریب سے دیکھا تھا۔

مرکز میں جب بھارتیہ جنتا پارٹی کا اثر و رسوخ بڑھا تو حکیم مظہر سبحان عثمانی کی خدمات کا قومی سطح پر اس طرح اعتراف کیا گیا کہ اُنہیں نیشنل کمیشن فار مائنارٹیز کا وائس چیرمین مقرر کیا گیا، آئینی اعتبار سے اس عہدہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اس منصب پر رہ کر انہوں نے اقلیتوں کی فلاح کے لیے بہت کام کیے اور متعدد رفاہی اور ترقیاتی پالیسیوں کے وضع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

آج استاذ محترم حکیم مظہر سبحان عثمانی ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی یادوں کا ایک ہجوم ساتھ ہے۔

کتابیات

۱- احمد، حماد [۲۰۱۳ء] ماہنامہ ہمدرد، ہمدرد دواخانہ، دہلی

۲- احمد، سہیل [۲۰۱۳ء]، پروسیڈنگ آف نیشنل سمینار آن ایمرجنگ ٹرینڈس اِن دی ڈیولپمنٹ آف یونانی سسٹم آف میڈیسن، اسٹیٹ تکمیل الطب کالج اینڈ ہاسپٹل، لکھنؤ، مطبع ارون پروفیشنل سروس، چوک، لکھنؤ

۳- عبدالرزاق، حکیم محمد [۱۹۸۷ء]، حکیم شکیل احمد شمسی: شخصیت اور خدمات، ناشر: آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، دہلی، طابع بھارت آفسیٹ، دہلی

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی

سے ایک انٹرویو

☆حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی

حکیم مظہر سبحان عثمانی سے یہ انٹرویو ۱۹۹۵ء کے وسط میں اس وقت لیا گیا تھا، جب کہ اُن کا شمار اے اینڈ یو طبیہ کالج، قرول باغ کے مسندِ تدریس کے ممتاز اساتذہ میں ہوتا تھا اور معالجات وطبابت اُن کی خصوصی دلچسپی کے محور بن گئے تھے، اُس پر مستزاد مرحوم کا سحر آگیں زورِ خطابت۔ اس انٹرویو میں بچپن سے لے کر طبیّہ کالج میں ملازمت تک کی زندگی کے مختلف ادوار اور پہلوؤں پر براہ راست روشنی پڑتی ہے، اس طرح اس کی حیثیت آج یقیناً دستاویزی ہوگئی۔ نوائے طب وصحت میں روبرو کے زیرِ عنوان اکتوبر-دسمبر ۱۹۹۵ء کے شمارہ میں شائع شدہ یہ انٹرویو قند مکرر کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔

س: آپ کے والد محترم کا نام؟

ج: میرے والد ماجد کا اسم گرامی منظور احمد تھا۔

س: آپ کا وطن اور خاندانی پس منظر؟

ج: میرا وطن موضع صمد پور ضلع گورکھپور [اتر پردیش] ہے، جو کہ میرے مورث اعلیٰ شاہ عبدالصمد رحمۃ اللہ علیہ کے نام نامی واسم گرامی سے منسوب ہے۔ آبا واجداد کو نوابینِ اودھ سے بائیس مواضعات کی جاگیر ملی ہوئی تھی، جس پر قبضہ وتصرّف آزادیٔ وطن کے بعد خاتمۂ زمینداری تک باقی تھا۔

س: ازراہِ کرم ابتدائی نیز ثانوی تعلیم پر بھی روشنی ڈالنے کی زحمت فرمائیں۔

ج: رسمِ مکتب کا آغاز بریلوی مکتبِ فکر کے عالم دین مولانا نعیم الدین مصباحی کے والد بزرگوار اور میری خاندانی جائداد کے نگراں مولوی منشی عاشق علی مرحوم کی اتالیقی میں ہوا۔ ابتدائی تعلیم کی تکمیل مدرسہ ناصر العلوم قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڑھ سے کی۔ علاّمہ شبلی نعمانی کی ابتدائی تعلیم بھی اسی مدرسہ سے انجام پذیر ہوئی تھی۔ ثانوی تعلیم انجمن اسلامیہ گورکھپور سے مکمل کی۔ اس کے بعد مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں زیرِ تعلیم رہنے کے بعد مُروّج درسِ نظامیہ کی تحصیل کی غرض سے مشرقی یوپی کے مشہور جامعات بیت العلوم سرائے میر، کنز العلوم ٹانڈہ، مفتاح العلوم مئوناتھ بھنجن میں زیرِ تعلیم رہ کر نابغۂ عصر اساتذۂ کرام سے اکتساب فیض

☆ سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر وموجودہ آنریری کنسلٹنٹ [یونانی]، سی، سی، آر، یو، ایم، دلکشا، این، ۴۹، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵ ای میل: azmikas@gmail.com

کی سعادت حاصل کی۔

س: آپ کی طبّی تعلیم کا داعیہ کیا تھا نیز طبّی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟

ج: ۱۹۵۹ء میں تکمیل الطب کالج لکھنؤ سے فن طب کی تکمیل کی۔ الہٰ آباد عربک اینڈ پرشین ایجوکیشن بورڈ کے امتحان کی تیاری کے دوران علامہ حکیم محمد کبیر الدین کی کتاب ''افادۂ کبیر'' زیر مطالعہ رہنے کے باعث فنِ طب کی تعلیم کی طرف توجہ اور رغبت پیدا ہوئی۔

س: اساتذۂ کرام، جن سے آپ بطور خاص متاثر ہوئے؟

ج: اساتذۂ کرام جنہوں نے مجھے متاثر کیا، اُن میں جناب حکیم شکیل احمد شمسی اور شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ شفاء الملک مرحوم کے زیرِ تلمذ رہ کر رموزِ مطب و نسخہ نویسی سمجھنے کا مجھے موقع ملا، وہ میری زندگی کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔

س: آپ کی شعلہ بیانی طبّی دنیا میں ضرب المثل بن گئی ہے۔ بلاشبہ اس فطری صلاحیت کو اُبھارنے کے لیے بھی کوئی خاص امر باعثِ مہمیز ہوا ہوگا۔

ج: فن تقریر کا شوق مجھے بچپن سے تھا۔ انجمن اسلامیہ گورکھپور کے زیر اہتمام باقاعدگی کے ساتھ جلسۂ سیرت منعقد کیا جاتا تھا، جس میں وقت کے منتخب مقررین مدعو کیے جاتے تھے۔ طلبہ کو بھی سیرت کے موضوع پر بولنے کی ریاضت اور مشق کرائی جاتی تھی۔ شوقِ تقریر کے اظہار کا عملی موقع مجھے یہیں پر حاصل ہوا۔ میرے اس شوق کو پروان چڑھانے میں میرے خالو مولوی سید غلام محی الدین کا بھی ہاتھ ہے جو کہ اُس وقت جارج اسلامیہ کالج، بخشی پور، گورکھپور میں فارسی ادب کے استاد تھے اور جن کی علومِ شرقیہ اور ادبِ لطیفہ پر گہری نظر تھی۔ آپ کے سوال کے جواب میں ایک دلچسپ واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ماضی میں جمعیۃ علماءِ کانپور کے زیر اہتمام ہر سال ''رجبی شریف'' کے نام سے عظیم الشان اجتماع کا انعقاد عمل میں آیا کرتا تھا۔ غالباً ۱۳ مارچ یا اپریل ۱۹۵۵ء کی بات ہے، یہ اجتماع شہر کانپور کے مشہور پریڈ گراؤنڈ میں ہونا طے پایا تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا محفوظ الرحمٰن نامی، پنڈت سندر لال جیسے مشاہیرِ عصر، مقرّرین کی فہرست میں شامل تھے۔ اسی وقت کانپور میں مسلمانوں کے دو محاذی خیمے باہم دست بہ گریباں تھے۔ ایک خیمہ جمعیۃ علماء اور نیشنلسٹ مسلمانوں پر مشتمل تھا اور دوسرا کانپور کے ایک اردو روزنامہ کے حامیوں اور کانگریس مخالف مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ جلسہ کی کارروائی شروع ہوتے ہی اسٹیج پر پتھروں کی بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ متوقع خطرہ کے پیش نظر یہ طے پایا کہ کوئی ایک مقرر اس خطرے کا چیلنج قبول کرے اور باقی حضرات اسٹیج سے ہٹ جائیں۔ یہ قرعۂ فال میرے نام نکلا۔ میں نے بولنا شروع کردیا۔ پتھروں کی بارش کا سلسلہ چند ساعت تک جاری رہنے کے بعد بند ہوگیا۔ غالباً میری بے خوفی اور طمانیتِ قلب نے پتھر پھینکنے والوں کا حوصلہ پست کردیا یا مجھے سننے کے بعد سنگ بکف مٹھیوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

س: آپ کے عہدِ طالب علمی کا کوئی اہم واقعہ؟

ج: مطب و نسخہ نویسی کی کلاس شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین لکھنوی کے ذاتی مطب پر ہوا کرتی تھی۔ طلبہ کی جماعت صف بند ہوکر حکیم صاحب کے ایک جانب لمبی بینچ پر بیٹھ جاتی تھی۔ حکیم صاحب کے قُرب میں اوّلیں نشستوں پر بیٹھنے کی ہمت صرف چند طلباء ہی کر پاتے تھے، کیونکہ حکیم صاحب ''بلا کسرِ تنفس'' ایک ہی سانس میں مفردات پر مشتمل طویل نسخے لکھواتے تھے۔ اگر نسخہ لکھنے والے طالب علم نے درمیان میں کچھ پوچھ لیا تو اس کی شامت آجاتی تھی۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ایک دن میں وقت سے کچھ پہلے پہنچ گیا، میرا تکلف یا حکیم صاحب کا تلطف، مجھے خلافِ معمول حکیم صاحب کے پاس پہلی نشست پر بیٹھنا پڑا۔ حکیم صاحب نے مریضوں کو دیکھنا اور نسخہ لکھوانا شروع کردیا۔ جیسا کہ متوقع تھا میں ان کی برق رفتاری کا ساتھ نہیں دے پایا۔ میں نے پوچھ لیا ''کیا فرمایا'' بس کیا تھا حکیم صاحب کی تغضب مآبی دیکھنے کے لائق تھی، حکیم صاحب نے مجھے میری نشست سے اٹھا دیا، فرمایا کہاں سے آئے ہو، تمہارے گھر والے کیا کرتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے جواباً عرض کیا، خاندان کے لوگ کاشت کاری کرتے ہیں، فرمایا گھر

واپس جاؤ اور گھاس کھودو۔ یہ واقعہ میری طالب علمانہ زندگی میں ایک ''تازیانۂ عبرت'' ثابت ہوا۔ چند دنوں میں میں نے اپنے آپ کو اس قابل بنالیا کہ حکیم صاحب کی خاص نظرِ التفات کا مستحق قرار پایا۔

س: آپ کی تدریسی صلاحیتیں تو سب پر منکشف ہیں۔ آپ طب یونانی کے ایک کامیاب پریکٹشنر بھی ہیں۔ آپ نے پریکٹس کب سے شروع کی نیز آپ کی معالجانہ زندگی کی کامیابی کا راز کیا ہے؟

ج: طبّی تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے وطن گورکھپور میں باقاعدہ مطب کا آغاز کردیا تھا۔ یونانی ادویہ کی شفا بخشی سے میں پوری طرح مطمئن ہوں۔ میری معالجانہ زندگی کی کامیابی کا راز یونانی طریق علاج کی افادیت پر یقین واثق اور اعتماد کامل ہے۔

س: آپ کی معالجانہ زندگی کا کوئی ناقابل فراموش واقعہ؟

ج: بیشتر اطباء کی معالجانہ زندگی میں ناقابل فراموش اور اہم واقعات کا ظہور ہوا ہے اور ہوتا رہے گا۔ میری معالجانہ زندگی بھی اس طرح کے اہم اور دلچسپ واقعات سے خالی نہیں۔ آپ کے سوال کے جواب میں ایک واقعے کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ دہلی پولیس کے ایک ملازم نور محمد صاحب کی ۱۷ سال کی شاہینہ نام کی لڑکی کو دردِ سر، دورانِ سر، خفقان اور قے کے ساتھ بے ہوشی کے دورے پڑنے کی شکایت تھی۔ دہلی ایڈمنسٹریشن کے ایک مشہور ہسپتال کے نیورولوجی ڈپارٹمنٹ کے ڈاکٹروں کی تشخیص کے مطابق لڑکی سلعۂ دماغ (Brain Tumour) کی مریضہ تھی جس کا علاج عملِ جراحت [آپریشن] کے ذریعے کیا جانا طے پاچکا تھا۔ لڑکی آپریشن کے لیے آپریشن تھیٹر تک پہنچادی گئی تھی، جیسا کہ دستور ہے آپریشن سے پہلے لڑکی کے والدین کو ایک مطبوعہ پروفارما دستخط کے لیے دیا گیا۔ لڑکی کی ماں نے پوچھ لیا یہ کس لیے؟ پاس کھڑے ہوئے کسی شخص نے کہا کہ یہ دستخط اس لیے کرائے جاتے ہیں کہ آپریشن کے دوران اگر مریض کی موت ہوجائے تو آپ لوگ اس کی ذمہ داری ڈاکٹروں پر نہیں ڈالیں گے۔ لڑکی کی ماں نے آپریشن کرانے سے منع کردیا اور لڑکی کو اپنے گھر واپس لے آئی۔ لڑکی کے والد نور محمد صاحب اس سے پہلے کسی عارضے میں مبتلا ہوکر میرے علاج سے شفایاب ہوئے تھے۔ لڑکی کی ماں نے اُن سے اصرار کیا کہ اس کو بھی حکیم صاحب کو دکھلاؤ جن کے علاج سے تم ٹھیک ہوئے تھے۔ ہر چند کہ لڑکی کی ماں کو یہ سمجھایا گیا کہ یہ سرجیکل کیس ہے۔ اس میں حکیمی علاج سے کیا ہوگا؟ مگر لڑکی کی ماں کی ضد کے آگے سب بے بس ہوگئے اور لڑکی کو میرے پاس بغرض علاج لے آئے۔ مریض اور مرض کی روداد سننے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ دردِ سر، دورانِ سر اور قے کا تعلق امتلاءِ صفرا سے ہے اور بے ہوشی کے دورے ہسٹیریائی نوعیت کے ہیں۔ معدّ لاتِ صفرا اور مسکناتِ اعصاب کے ذریعہ علاج کیا گیا اور مریضہ کو شفاءِ کلی حاصل ہوئی۔

س: آپ نے تدریسی زندگی کا آغاز کب اور کہاں سے کیا؟ کیا اردو زبان نیز جدید تحقیقات، طب یونانی کے فروغ کے لیے ناگزیر ہیں؟

ج: میری تدریسی زندگی کا آغاز اپریل ۱۹۶۴ء سے ہوا، جب جامعہ طبیّہ [ہمدرد طبّی کالج] میں بہ حیثیت سینئر لیکچرر معالجات وانچارج شفاخانہ میرا تقرر عمل میں آیا۔ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ یونانی درسیات کے لیے اردو زبان کا علم بہت ضروری ہے۔ کسی بھی فن یا سائنس کی ذہنی قبولیت اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ طالب علم اس علم کے اصل اساس اور مآخذ تک کماحقہٗ رسائی نہ رکھتا ہو۔ اس کڑوی سچائی کا جرعۂ تلخ طب یونانی کے اساتذہ کو پینا پڑ رہا ہے، مگر تصویر کا ایک دوسرا تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ طبّی کالجوں کے بیشتر اطبّاء عافیت پسندی کا شکار ہیں، اُن کا ذہن ایک گنبدِ بے روزن بنا ہوا ہے۔ جس میں تازہ بصیرت اور عصری حقیقت کی ہوا کے جھونکوں کا فقدان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے طریقِ درس کا انداز بس ایک خانہ پُری کا سا رہ گیا ہے۔ قدیم صداقتوں کو عصری زاویوں سے پرکھنے اور علمی طرزِ استدلال سے ہی درسیات کو طلبہ کے لیے قابلِ قبول بنایا جاسکتا ہے۔ موجودہ صورتِ حال کچھ اس طرح کی ہے کہ ہمارے لیکچروں کو ہمارے تلامذہ ایک لقمۂ تلخ سمجھ کر

اپنے منہ میں ڈال لیتے ہیں اور امتحان سے چھٹکارا پانے کے بعد اسے باہر اُگل دیتے ہیں۔

س: آپ نے ملازمت کب اور کہاں سے شروع کی؟

ج: سب سے پہلے جزوی طور پر ۱۹۶۰ء میں ہمدرد ایجنسی گورکھپور کے کے مطب سے وابستہ ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں جامعہ طبیّہ ہمدرد دہلی میں ملازم ہوا۔ پھر وہاں سے مستعفی ہوکر ۱۹۶۹ء میں ہندوستانی دواخانہ دہلی میں بحیثیت حکیم انچارج میرا تقرر ہوا۔ کچھ دنوں تک اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بھی بحیثیت لیکچرر معالجات کام کرنے کا موقع ملا اور موجودہ وقت میں آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ میں بحیثیت صدر شعبۂ معالجات کام کررہا ہوں۔ تقریباً ۳۰ سال کی لمبی مدت تک مسلسل معالجات اور مطب سے وابستہ رہنے کا مجھے موقع ملا ہے۔

س: آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس سے وابستگی کے سلسلے میں بھی ہمارے قارئین کو آگہی درکار ہے۔

ج: سب سے پہلے ۱۹۵۹ء میں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں شریک ہوا۔ اس اجلاس میں حکیم کبیر الدین، شفاء الملک حکیم احمد عثمانی، صدر الاطباء حکیم محمد الیاس خاں، شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی اور عالی جناب حکیم عبدالحمید صاحب جیسے عمائدین فن شریک تھے۔ اس موقع پر میرے خیالات کو پندرہ روزہ ''مسیحا'' بمبئی نے ''اطباء اور سیاست'' کے زیرِ عنوان شائع کیا تھا۔ دہلی میں آنے کے بعد ۱۹۶۶ء سے آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی سے وابستہ ہوں۔ گزشتہ ۶ سال سے دہلی کی صوبائی طبّی کانفرنس کے نائب صدر اور پھر صدر کے عہدے پر کام کررہا ہوں۔

س: ایک عام تاثر آج کل یہ پیدا ہوچکا ہے کہ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی فعالیت میں نمایاں کمی آگئی ہے، اگر یہ درست ہے تو اس کے اسباب اور تدارک کے طریقے؟

ج: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ طبّی کانفرنس کی فعالیت کم ہوئی ہے جب کہ اس فعالیت کی ضرورت اب کچھ زیادہ ہی ہے۔ فعالیت کی کمی کے اسباب متعدد ہیں۔ اطبا کی جو نئی نسل سامنے آئی ہے وہ مکمل طور پر کانفرنس کے قدیم تنظیمی ڈھانچے سے اپنے آپ کو جذباتی اور ذہنی طور پر غیر وابستہ پاتی ہے۔ اس کے پیچھے جو اسباب وعلل کارفرما ہیں اُن پر متعدد مواقع پر اظہار خیال کیا جاچکا ہے اور اب بھی ضرورت ہے کہ ہم باہم مل کر اس تنظیم کو اطباءِ جمہور کے لیے زیادہ سے زیادہ پُرکشش اور نفع بخش بنا کر پیش کریں۔

س: تدریس اور صوبائی کانفرنس سے وابستگی کے علاوہ دوسری علمی وفنی مصروفیات کیا ہیں؟

ج: کالج کی اور بحیثیت صدر یونانی طبّی کانفرنس صوبہ دہلی کی مصروفیات کے علاوہ متعدد علمی اور سماجی تنظیموں سے وابستہ ہوں۔ دہلی گورنمنٹ نے پہلی مرتبہ آیورویدک اینڈ یونانی کا الگ ڈائرکٹریٹ قائم کیا ہے، جس کی ایڈوائزری کمیٹی کا میں ممبر ہوں۔ علاوہ بریں سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن کی سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر اور کلینکل ریسرچ سب کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی مصروفیات ہیں۔

س: طبِ یونانی کا مستقبل ہمارے ملک میں حوصلہ افزا ہے یا حوصلہ شکن؟ اس کی مقبولیت کی راہیں کیسے ہموار ہوسکتی ہیں؟

ج: میں طبِ یونانی کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ آج کے دور میں جب کہ لوگ اور خاص طور پر دانشور طبقہ انگریزی طریقۂ علاج کے ذیلی مضر اثرات سے واقف ہوکر دوسرے متبادل طریقہ ہائے علاج کی طرف متوجہ ہورہا ہے، طب یونانی کے حاملین کے لیے ایک سنہری موقع فراہم ہورہا ہے کہ وہ اپنے فن کی افادیت کو زیادہ سے زیادہ عام کریں۔

س: طبِ یونانی کی پریکٹس سے عام اطباء گریزاں کیوں ہیں؟

ج: اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر اطباء جو کہ طبیّہ کالجوں سے نکل رہے ہیں، اس فن کی خوبیوں کے ذاتی مشاہدے سے محروم ہیں۔ بیشتر اساتذہ اپنے ذاتی مطب میں انگریزی ادویات کا

استعمال کرتے ہیں اور جب صورتِ حال یہ ہو تو تلامذہ کے ذہن و دماغ میں طبِ یونانی کی معالجانہ افادیت کا مشکوک ہونا ایک امرِ لازمی ہے۔ طبیّہ کالجوں سے ملحق اسپتالوں میں مریضوں کے معالجے و علاج پر کماحقہٗ طبِ یونانی کے بنیادی اصولِ علاج پر توجہ نہیں دی جاتی۔ طلبہ کو مطب و اصولِ علاج کے بارے میں جو عملی ٹریننگ دی جاتی ہے وہ آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ یونانی طریقۂ علاج ایک گہرے علم، وسیع مطالعہ اور تجربے کا متقاضی ہے اور اس کی محرومی کے نتیجے میں نئی نسل کے اطباء میں اس فن پر مکمل اعتماد و یقین نہیں ہو پاتا اور نتیجے میں وہ انگریزی ادویہ کے استعمال کی راہ پر چل پڑتے ہیں، جو اُن کے لیے زیادہ سہل العمل دکھائی دیتا ہے۔

س: ماضی میں بالعموم اچھے طبیب، اچھے شاعر بھی ہوا کرتے تھے۔ اگر ہم اس کا بہ نظرِ غائر جائزہ لیں تو نفسیات کی کارفرمائی ملے گی، کیونکہ شاعر اتنا حساس ہوتا ہے کہ اُسے مخاطب کے محسوسات کی تہہ تک پہنچنے میں دیر نہیں لگتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ایک کہنہ مشق شاعر بھی ہیں۔ کیا آپ اپنے مشقِ سخن، اصلاحِ سخن نیز رنگِ سخن پر بھی روشنی ڈالنا پسند فرمائیں گے؟

ج: شعر و سخن سے دلچسپی عہدِ طالب علمی سے ہی رہی ہے۔ میرے حقیقی خالو سید غلام محی الدین صاحب نے ابتداء میں اصلاحِ سخن فرمائی، بعد میں تکمیل الطب کالج میں تعلیم کے دوران استاذی حکیم شکیل احمد شمسی، جو خود شعر و سخن کا بلند ذوق رکھتے تھے، بلکہ اعلیٰ درجے کے شاعر بھی تھے، ہر موقع پر اس میدان میں میری حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ حکیم صاحب کی شاعری کا اثر میری شاعری پر بھی نمایاں ہے۔ یہ بات اس وقت واضح طور پر میرے سامنے آئی جب انہوں نے اپنا مجموعۂ کلام ''قیدِ حیات و بندِ غم'' مجھے از راہِ نوازش مرحمت فرمایا۔ چند اشعار پیش کر رہا ہوں جس سے واضح ہو جائے گا کہ مرحوم کی شاعری کا پَرتو میری شاعری پر کتنا پڑا۔

حکیم شمسی کا شعر:

سایۂ زلف میں رُک لیجئے دم بھر لیکن
یہیں سو جایئے، اس درجہ گھنیرا بھی نہیں

اسی موضوع پر میرا شعر:

دل کا آرام فقط سایۂ گیسو میں نہیں
محفلِ دہر میں سامانِ قرار اور بھی ہیں

شمسی صاحب کا ایک شعر:

غمِ عاشقی نے بخشی مری زندگی کو شاہی
کہ جبیں وہیں جھکائی جہاں دل نے دی گواہی

میرا شعر:

مظہرؔ وہ بُت کدہ ہو، کلیسا ہو یا حرم
جب تک نہ دل جھکے کہیں سجدہ نہ کیجیے

شمسی صاحب کا ایک اور شعر:

یہ بھی صدقہ ہے کسی چشمِ کرم کا شمسیؔ
دل کو ہر سمت پکارا گیا اور لب نہ ہلا

میرا شعر ملاحظہ فرمایئے:

دل بن گیا زباں اور ہلے نہیں لب
ہم نے یوں بھی تجھے پکارا ہے

اس توارد ذہنی کا علم مجھے اس وقت ہوا جب کہ استادِ محترم کا مجموعۂ کلام ہمدست ہوا۔

یہاں اس امر کا اظہار بے محل نہ ہوگا کہ تکمیل الطب کالج میں سب سے پہلے حافظ علی ظہیر صاحب کے زیرِ صدارت ایک مشاعرہ میں ایک غزل پیش کی تھی، جس کا مقطع یہ تھا۔

نہیں پائیں گے اپنی منزل وہ مظہرؔ
جو غیروں کے نقشِ قدم دیکھتے ہیں

اس غزل پر شفاء الملک حکیم عبدالمعید مرحوم نے مجھے انعام سے نوازا تھا۔

•••

عکس تحریر

حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم کی شخصیت بڑی رنگا رنگ تھی۔ تنوع اور تفرد دونوں اُن کی ذات میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ ایک حاذق طبیب، قابل استاذ، شعلہ بیان خطیب، تحقیق کے علمبردار اور سیاست کے شناور تھے؛ یہ تو سبھی جانتے ہیں۔ اُن کی زبان دانی اور شعری ذوق سے بھی اہل علم واقف ہیں، لیکن اُن کی شخصیت کا ایک روشن پہلو اور بھی ہے، جس سے واقفیت از بسکہ لازم ہے۔ عثمانی صاحب اپنے بچپن ولڑکپن میں اس نظام تعلیم کا حصہ بنے جس میں ابتدائی و ثانوی تعلیم روایتی انداز کے مکاتب و مدارس میں دی جاتی تھی۔ اردو، عربی اور فارسی زبان وادب کی تعلیم جہاں اس نظام کا ضروری اور خوبصورت حصہ تھی، وہیں تقریر وتحریر کی تربیت اس کا لازمی جزو۔ اظہار و بیان کے دونوں وسیلوں پر قدرت حاصل کرنا اساتذہ وطلبہ کا وہ نصب العین ہوتا، جس کے حصول کے بعد وہ ایک کامیاب عملی زندگی کی توقع رکھتے۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی نے اس روایتی نظام تعلیم کے تمام تر حسن و جمال کو اپنی ذات میں سمو کر طبّی تعلیم کا رخ کیا۔ تعلیمی سلسلہ مکمل ہونے کے بعد اُن کے دو مشاغل ہوئے؛ ذات کا غم اور کائنات کا غم۔ اول الذکر کے لیے طبابت اور موخر الذکر کے لیے صحافت کا انتخاب کیا اور دونوں میں خوب خوب جوہر دکھائے۔ طبابت کی اثر انگیزی کا تو ایک عالم گواہ ہے لیکن عثمانی صاحب کے صحافتی رنگ سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔ اُس زمانے میں اردو صحافت کا معیار بہت بلند تھا، گو تقسیم ملک کے سانحے میں جہاں بہت سے اہل کمال وطن سے ہجرت کر گئے تھے، وہیں باقی رہ جانے والوں پر ذہنی تکان غالب تھی۔ اُن میں وہ مستعدی اور جرأت مفقود تھی جو بے باک صحافت کے لیے مطلوب ہوتی ہے، پھر بھی عامر عثمانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور مولانا عثمان فارقلیط وغیرہ کی شکل میں صحافیوں کی ایسی جماعت موجود تھی، جو مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد کی روایت کی پاسبانی بخوبی کر رہی تھی۔ مدرسے کی تعلیم، لکھنؤ کی تہذیب اور حکیم شکیل احمد شمسی کی شاگردی نے حکیم مظہر سبحان عثمانی کے اندر ایک اعلیٰ درجہ کا ادبی مذاق پیدا کر دیا تھا۔ اُن کے بارے میں جو سنا، دیکھا اور اُن کی تحریروں سے اخذ کیا ہے، اِس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ حساسیت اور شفافیت اُن کی شخصیت کے دو نمایاں اوصاف تھے۔ اندرون و بیرون کا تضاد اُن کے ہاں نہیں تھا۔ جو کہا سامنے کہا، جو کیا ڈنکے کی چوٹ پر کیا۔ زمانے کو برا لگے یا دنیا ملامت کرے، وہ ہمیشہ اپنے اس شعر کی عملی تصویر بنے رہے ؎

زاہدی وہ بت کدہ، کلیسا ہو یا حرم
جب تک نہ دل جھکے کبھی سجدہ نہ کیجیے

اسی افتادِ طبع کے سبب شاید وہ صحافت کی جانب متوجہ ہوئے تھے۔ گو زندگی کا یہ دور مختصر رہا تاہم اُن کی اس زمانے کی نگارشات پڑھنے کے بعد اہل نظر شاید راقم سطور کے اس خیال سے اتفاق کریں کہ اگر وہ اسی میدان میں جمے رہتے تو بھی ملک وقوم کی وقیع خدمات انجام دیتے۔ تقسیم ہند کے مابعد اثرات کا درد اُن کی تحریروں میں ہے۔ بعض ہم وطنوں کے ساتھ ناانصافی، حکومت وقت کی بے توجہی، اغیار کی سازش، اپنوں کی غفلت، ملی رہنماؤں کی تساہلی اور معاشرے کی

بے راہ روی؛ سبھی کو اُنہوں نے موضوعِ سخن بنایا اور کمال جرأت سے بڑے بڑوں کا مواخذہ کیا لیکن پوری ذمہ داری کے ساتھ۔ شاید یہی دیانت دارانہ صحافت ہے۔ وہ لکھنؤ سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ 'برادری' کے شریک مدیر تھے، جس کا اداریہ بھی وہی لکھتے۔ 'شذرات' کے تحت سیاسی حالات کا تجزیہ بھی کرتے۔ ماہنامہ 'تجلی' دیوبند کے کالم 'مسجد سے میخانے تک' کے طرز پر 'برادری' میں 'امرود بخت شاہجی' کے قلمی نام سے 'کعبہ سے بت خانے تک' کے عنوان سے ایک مزاحیہ کالم بھی لکھا کرتے تھے جس کو مولانا عبدالماجد دریابادی اور عامر عثمانی نے بھی پسند فرمایا تھا۔ اس کے علاوہ بمبئی سے شائع ہونے والے 'مسیحا' اور بریلی سے نکلنے والے 'دکھ سکھ' سے بھی اُن کی وابستگی رہی۔

'کعبہ سے بت خانے تک' کالم کے تحت جو کچھ شائع ہوا وہ طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ مزاح نگاری سب کے بس کی بات نہیں، بقول مشتاق یوسفی:

''حسِ مزاح ہی دراصل انسان کی چھٹی حس ہے۔ یہ ہو تو انسان ہر مقام سے آسان گزر جاتا ہے

ع ۔ بے نشہ کس کو طاقتِ آشوبِ آگہی

یُوں تو مزاح، مذہب اور الکحل ہر چیز میں بآسانی حل ہو جاتے ہیں، بالخصوص اردو ادب میں لیکن مزاح کے اپنے تقاضے، اپنے ادب آداب ہیں۔ شرطِ اول یہ کہ برہمی، بیزاری اور کدُورت دل میں راہ نہ پائے۔ ورنہ یہ بومرنگ پلٹ کر خودشکاری کا کام تمام کر دیتا ہے۔ مزا تو جب ہے کہ آگ بھی لگے اور کوئی اُنگلی نہ اُٹھا سکے کہ ''یہ دُھواں سا کہاں سے اُٹھتا ہے؟'' مزاح نگار اُس وقت تک تبسم زیرِ لب کا سزاوار نہیں، جب تک اُس نے دنیا اور اہلِ دنیا سے رَج کے پیار نہ کیا ہو۔ اُن سے، اُن کی بے مہری و کم نگاہی سے، اُن کی سرخُوشی و ہُشیاری سے، اُن کی تردامنی اور تقدُس سے''۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی مزاحیہ تحریریں شاید سب سے زیادہ قابل توجہ ہیں کہ اُنہوں نے ادب کی اس مشکل صنف کو بھی بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ ایک اور بات؛ اُن کی مزاحیہ تحریروں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے پر طب و حکمت سے ان کے رشتے کا بھی پتہ ملتا ہے۔ بہتیرے الفاظ و ترکیبیں بطور مثال پیش کی جاسکتی ہیں: متلی، اسقاط، خون کی نئی گردش، جراحت کا اندمال، افیون زدہ زندگی، مارفیا کا انجکشن، چودھری خفقان اور صوفی شکم علی وغیرہ۔

حکیم مظہر سبحان عثمانی کی طبّی نگارشات بھی اپنے موضوع کا حق ادا کرتی ہیں۔ انداز دلکش ہے اور بیانیے میں سلاست اور روانی ہے، معلومات کی ترسیل میں تاریخ کا وجدان اور عصری تقاضوں سے آگہی ہے۔

قند مکرر کے طور پر عثمانی صاحب کی دستیاب تحریروں کو اس شمارے میں شائع کیا جارہا ہے کہ اس سے نہ صرف اُنہیں یکجائی حاصل ہوگی، بلکہ باذوق قارئین اُن کے قلم کی شگفتگی اور رنگارنگی کو بھی محسوس کرسکیں گے۔ اِسی شمارے میں اُن کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ غزلیں بھی جابجا گل بوٹوں کی طرح ٹانکی گئی ہیں تاکہ پورا شمارہ اُن کی نکہت سے معطر رہے۔

اخیر میں حکیم مظہر سبحان عثمانی کے حوالے سے راقم سطور کے ایک ذاتی مشاہدے کا ذکر بھی بے محل نہیں۔ سبھی جانتے ہیں کہ وہ شستہ زبان لکھتے اور بولتے تھے۔ الفاظ کے مخارج [بطور خاص عربی] کی صحیح اور واضح ادائیگی کا بھی خیال رکھتے۔ یوں تو کونسل کے ہیڈکوارٹرس کی اہم میٹنگوں میں وہ اکثر تشریف لاتے اور اُن سے نیاز حاصل ہوتا۔ فون پر بھی متعدد مرتبہ ہم کلام ہونے کا موقع ملا۔ دورانِ گفتگو حروف حلقی کی اُن کی ادائیگی سے میں محظوظ ہوتا۔ مجھے اُن سے اُن کے گھر پر دوبار ملاقات کا شرف حاصل ہوا؛ کونسل کے سابق ڈائرکٹر جنرل حکیم محمد خالد صدیقی صاحب نے 'پیکر فکر و عمل۔ حکیم عبدالحمید' کے لیے عثمانی صاحب کا مضمون حاصل کرنے مجھے اُن کے گھر بھیجا۔ اُنہوں نے مضمون کا املا کرایا۔ دورانِ املا 'تنازع للبقا' کے لفظ کو بڑے تاکیدی مخرج سے ادا کیا اور مجھ سے پوچھا کیا لکھا؟ میں نے بھی صحیح مخرج کے ساتھ لفظ دہرادیا۔ محظوظ ہوئے۔ پوچھا عربی سے واقف ہو؟ اثباتی جواب سن کر اور خوش ہوئے۔

میں خود پر رشک کرسکتا ہوں کہ مجھے اُن سے روبرو ہونے اور ہم کلامی کی سعادت حاصل ہوئی!

امان اللہ

●●●

حکیم اجمل خاں کا قومی تصور اور انقلابی کردار

حکیم مظہر سبحان عثمانی

انیسویں صدی کا نصف آخر ہماری قومی زندگی کا اہم ترین باب ہے۔ غیر ملکی اقتدار کی جڑیں اسی زمانہ میں مستحکم ہوئیں۔ یہی زمانہ شرق وغرب کے افکار باہمی کے تصادم اور دو تہذیبوں کے باہمی فصل وانفصال کا ہے۔ ہندوستانیوں میں جدید تعلیمی بیداری اور قومی اصلاح کی منظّم جدوجہد کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ راجہ رام موہن رائے، سوامی دیانند سرسوتی اور سرسید احمد خاں جیسے مصلح اور جدید ہندوستان کے ذہنی معمار اسی عہد سے وابستہ ہیں۔ اسی دور بیداری کا ایک اہم نام حکیم حافظ محمد اجمل خاں شیدؔا ہے۔ جو ۱۱ فروری ۱۸۶۸ء کو طب مشرقی کے ایک ایسے خاندانِ اجتہاد میں پیدا ہوئے جو صدیوں تک نہ صرف آل تیمور کے دربار شاہی میں ممتاز وسرفراز رہا بلکہ قلعہ معلّٰی کے باہر بھی ہر خاص وعام اور امیر وغریب کا مرجع ومحترم تھا۔

حکیم اجمل خاں کی زندگی کے مختلف باب ہیں اور ہر باب میں ان کی عظمت اور انفرادیت کے بے شمار اوراق ہیں۔ وہ ہندوستان کے طبیب اعظم تھے، حاذق معالج اور قادر الکلام شاعر تھے، سحر بیان خطیب تھے، جنگِ آزادی کے صفِ اول کے رہنما تھے، انڈین نیشنل کانگریس کے صدر اور ہندو مسلم اتحاد کے داعی اعظم تھے۔ راجوں مہاراجوں کے معتمد اور محترم لارڈوں اور نوجوانوں کے رفیق و پہلو نشین تھے اور غریبوں و بے کسوں کے محبوب ومشفق تھے۔ سرکار انگریزی نے انہیں حاذق الملک کا خطاب دیا۔ قوم نے مسیح الملک کہہ کر اس اعزاز کو ان کے نام کا جزء ولازم بنا دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے انہیں بے تاج بادشاہ کہا۔ دیش پتا گاندھی جی نے ''خاموشی کا دیوتا'' کہہ کر پکارا۔ لارڈ ہارڈنگ انہیں 'میگنیٹ آف انڈیا' کہا کرتے تھے۔ ریونیڈ اینڈروز کو ان کی زندگی کی تمثیل انجیل مقدس میں نظر آئی۔ وہ کیا تھے اور کیا نہ تھے، لفظوں کی صناعی اور حرفوں کی مینا کاری سے ان کی شخصیت کا ایسا خاکہ کھینچنا جیسا کہ حق ہے، از بسکہ مشکل ہے۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں اگرچہ ایک روایتی طرز کے انسان تھے مگر ان کا ذہن انقلابی تھا۔ وہ اطباء کے ذہن میں جہاں نہ کوئی روزن تھا نہ دروازہ، جو ایک گنبد بے در بنا ہوا تھا، نئی فضا اور نئی ہوا کی تازگی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ معلومات کو سمیٹ کر نتائج اخذ کرنا اور تحقیق وتلاش سے ذہن کو منور کرنا ان کا علمی موقف تھا۔ طبیہ کالج کی درسیات میں مفید اضافات ہوں یا اس کے شعبہ ریسرچ کے مقاصد، مجلس تحقیقات طبّی کی غرض وغایت ہو یا نصابی اصلاحات کی مساعی ہوں یا یونانی دواسازی کی صنعت کو سائنٹفک راہ پر لانے کے لیے ہندوستانی دواخانہ کی تشکیل، ہر جگہ ان کا نقطۂ نظر انقلابی نظر آئے گا۔ وہ علمی جمود اور فنّی تعصب کے سخت مخالف تھے اور اسے طب یونانی کی موت کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے قدیم صداقتوں کو جدید زاویوں سے پرکھنے اور جانچنے کے لیے علم العلاج میں نئی راہوں کو جگہ دی اور روش عام سے ہٹ کر ۱۹۰۹ء میں مدرسہ طبیہ کے تحت شعبۂ زنانہ کے قیام کی صورت میں ہندوستانی طب کی تاریخ میں پہلی بار قبالت کاری اور زچہ گیری کی عملی تربیت کی بنیاد رکھی۔ اس موقع پر انہوں نے فرمایا:

> ''جس چیز کے لیے ہم طالبات کو دعوت دیتے ہیں، وہ ہمارے ملک کی شریف اقوام کے لیے بالکل اجنبی اور نئی بات ہے۔ کوئی تعلیمی کام کامل نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ سوسائٹی کے نصف حصہ یعنی عورتوں کے ساتھ سچی ہمدردی کا عنصر اس میں شامل نہ ہو''۔[۱]

تحریک ندوہ:

تحریک ندوہ کے اسٹیج سے درس نظامی کے قدیم روایتی نصاب تعلیم پر تنقید اور عربی مدارس میں زمانہ حال کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظام تعلیم کے اجراء پر زور حکیم صاحب کے ترقی پسندانہ خیالات اور انقلابی کردار کے آئینہ دار ہیں۔ اجمل اعظم کی زندگی کا سب سے روشن پہلوان کا قومی تصور ہے۔ ان کو اپنے ملک، اس کے ماضی اور اپنے اسلاف کے علمی ورثے سے جتنا لگاؤ تھا، اتنا ہی وہ اپنی قوم کی تنگ ظرفی اور کوتاہ نظری کے مخالف تھے۔ ان کے ہم عصروں میں دو طرح کے لوگ تھے ایک وہ جو ''پدرم سلطان بود'' اور ''ہمچوں دیگرے نیست'' کے نعرۂ بے معنیٰ کے تحت ہر نئی روشنی کو دشمنِ بصارت اور ہر تازہ خیال کو ضد بصیرت سمجھتے ہوئے افسانوی شتر مرغ کی طرح اپنی گردن عظمت رفتہ کے ریگ زار میں چھپائے بیٹھے تھے۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جن کو نئی روشنی کی چکا چوند نے تجدد کی اس سطح پر پہنچا دیا تھا جہاں ؎

یاد ماضی عذاب ہے یا رب

کا مصرعہ صادق آتا ہے۔ حکیم اجمل خاں ان ہوشمندوں میں تھے جن کی ذات میں ماضی اپنے محاسن، حال اپنے تقاضوں اور مستقبل اپنی بشارتوں کے ساتھ ایک سکیم بن جاتا ہے۔ یادِ ماضی ان کے نزدیک عذاب جان نہ تھی بلکہ تعمیر نو کا سامان تھی۔ رجعت پسندی نہ تھی بلکہ نئے فکر و خیال کا پس منظر تھی۔ تقریباً ایک صدی پہلے وہ اپنے علمی سرمایہ اور نئی میراث کے بارے میں اس طرح سوچتے تھے اور آنے والے وقت پر ان کی نظر کتنی گہری تھی، اس کی ایک جھلک فہرست کتب خانہ رامپور پر ان کے رقم کردہ دیباچہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

دنیا کے تمدن و ترقی کے آثار مختلف صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ کسی جگہ کوئی قدیمی شہر اتفاق سے نکل آتا ہے تو آثار قدیمہ کے شیدا اپنی معلومات میں قیمتی اضافہ کرتے ہیں۔ انہیں اس شہر کے مکانات اور شہر کی ساخت سے اہلِ شہر کی ضرورتوں اور مذاق کا اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جس طرح پچھلے زمانہ کے صناعوں کی چیزیں ان لوگوں کے مخصوص حالات کو روشنی میں لاتی ہیں، اسی طرح ہر ایک گزشتہ قوم کی تصنیف و تالیف آئندہ نسلوں کے لیے اس قوم کے خیالات کی طرف رہبری کرتی ہیں۔ مشرقی علوم و فنون کا آفتاب گو کہ اپنے زمانہ میں برابر عروج پر رہا اور بہت سی قوموں نے اس کی روشنی سے دنیا میں فائدے حاصل کیے لیکن اب یہ آفتاب گہنا گیا ہے اور زمانے نے اپنی عادت کے مطابق ایک دوسرا آفتاب پیدا کرلیا ہے جو اہل زمانہ کی ضرورتوں کو پورا کررہا ہے۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر عام لوگوں کی توجہ اور ان کا التفات اپنے نئے مہمان کی جانب زیادہ ہونا چاہیے اور روز افزوں ہوتا بھی جارہا ہے۔ اس انقلاب کا نتیجہ جیسا کہ پچھلی قومیں برداشت کرچکی ہیں، ہمارے لیے بھی ہوگا ہم اپنی پچھلی عظمت اور وقعت کو گمنامی کے ہاتھ فروخت کرڈالیں گے۔ اگر ہم ان کے قائم رکھنے کا خیال نہ کریں۔[۲]

اُس وقت جب کہ قومی یک جہتی اور نیشنل انٹی گریشن کا نعرہ ہماری سیاسی ڈکشنری میں اپنی جگہ بھی نہ پاسکا تھا، حکیموں اور ویدوں کے رشتۂ فنی اور اخوت باہمی کے منجمد سرچشمہ کو متحدہ قومیت کے جوئے رواں میں تبدیل کردینا مسیح الملک کا وہ کارنامہ ہے جسے ملک بھلانا بھی چاہے تو تاریخ بھولنے نہ دے گی۔

ویدک اور طب کو ایک دوسرے کے دوش بدوش لانے کے لیے مسیح الملک کی تحریک اتحاد پر اطباء کے ایک بااثر طبقہ نے یہ کہہ کر اعتراض کیا تھا کہ اس اتحاد سے ویدک تو فائدہ حاصل کرے گی مگر طب یونانی کو نقصان پہنچے گا۔ اس طرح کچھ وید حضرات نے بھی اس تحریک کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہوئے اختلاف ظاہر کیا تھا۔ اس اختلاف کے پیش نظر ویدوں اور حکیموں کو خطاب کرتے ہوئے حکیم صاحب نے جو تقریر فرمائی اس کا ایک ایک لفظ ان کے قومی خیالات کی عکاسی کرتا ہے۔

> دنیاوی زندگی کی بقاء کے لیے اس کے ہر ہر عضو کی اصلی حرارت کا قائم رہنا ضروری ہے اور بقاء ہر حال میں ایک دوسرے کی مدد پر موقوف ہے۔ اگر معدہ غذا ہی نہ لے اور یہ کہہ کر چھوڑ دے کہ مجھ کو قلب و جگر سے کیا رابطہ جو ان کے لیے محنت کروں تو وہ دن قریب ہوگا کہ معدہ اپنے فعل سے بیکار ہوجائے گا اور اپنی غلطی پر افسوس محسوس کرے گا۔[۳]

مشہور نیشنلسٹ اور صحافی قاضی عبدالغفار صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس [طبّی] تحریک کا ایک قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ حکیم صاحب اول دن سے ویدک اور یونانی طب کی متحدہ اور مشترکہ ترقی کے لیے کوشاں تھے۔ سیاسی حیثیت سے اس وقت ہندو مسلم اتحاد کا سوال زیادہ نمایاں نہ ہوا تھا جیسا کہ بعد کو ہوا۔ لیکن اپنے ملک کی زندگی میں اس اشتراک اور اتحاد کی اہمیت بہت پہلے سے حکیم صاحب کی نظر کے سامنے تھی۔ دراصل ان کی ساری عوامی جدوجہد کا بنیاد ہی وہ تھا''۔[۴]

مہاتما گاندھی کی صاف گوئی اور جرأت بیانی مشہور و مسلم ہے۔ مروّت اور مصلحت پر مبنی کوئی بات ان کے ضمیر کے خلاف تھی۔ طبیہ کالج کے افتتاح کے وقت گاندھی جی نے جو تقریر کی اس کا اقتباس قابل ملاحظہ ہے:

''میں صدق دل سے اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے اس کالج کا افتتاح سیاسی غرض سے کیا ہے۔ میں حکیم صاحب کو ہندو مسلم اتحاد کا رکن اعظم سمجھتا ہوں جس کے بدوں ہم کوئی ترقی نہیں کر سکتے۔ میں اس کالج کو بھی اس یگانگت کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں''۔[۵]

طبیہ کالج میں یونانی اور ویدک طبوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دے کر حکیم اجمل خاں نے فنی رواداری اور طبّی یک جہتی کے ساتھ قومی تاریخ میں وسعت ظرفی اور کشادہ دلی کی ایک ناقابل فراموش روایت قائم کی ہے۔ حکیم صاحب طب یونانی اور ویدک کو ایک ہی ماخذ کی دو شقیں سمجھتے تھے۔ ویدوں اور طبیبوں کے اتحاد کو وہ ''مدافعتی اتحاد'' کے بجائے قومی اتحاد بنانا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ اتحاد محض برائے حصول مقصد نہ تھا بلکہ فی نفسہ مقصود بالذات تھا جسے انہوں نے اپنے دل کی آواز اور انسانی عقیدہ سمجھ کر اختیار فرمایا تھا۔ وہ ویدوں اور طبیبوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتے تھے:

''خدا گواہ ہے کہ وید اور طبیب میرے لیے سب یکساں ہیں اور علم ویدک اور طب یونانی کو جو نقصان اب تک پہنچ چکا ہے اور آئندہ پہنچ سکتا ہے اس کی تلافی کے واسطے ہم سب کو مل کر کوشش کرنی چاہیے''۔[۶]

طبّی تحریک سے حکیم صاحب کی والہانہ شیفتگی اور دیسی طبوں کی بقاء و حفاظت کے لیے ان کی محنت شاقہ صرف اس لیے نہ تھی کہ اس پیشہ سے ان کا تعلق تھا بلکہ وسیع تر قومی تصور کے پیش نظر دیسی طریقہائے علاج کی خدمت کو وہ وطن کی خدمت اور محبت کے ہم معنیٰ سمجھتے تھے:

''یہ طبیں ہماری ہیں جس طرح انسان اپنی چیزوں سے فطری اور پیدائشی طور پر محبت رکھتا ہے اسی طرح ہم ان سے محبت رکھتے ہیں اور جہاں تک ہمارے امکان میں ہے ہم انہیں بربادی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ اگر ہم اپنے طور پر اپنے وطن سے محبت رکھتے ہیں اور ہمیں اپنے دیس کی عادات، رسم و رواج، صنعت و حرفت اور وہ علوم و فنون جن پر ہمارے لاکھوں بزرگوں نے دماغ سوزیاں کیں، بھلے معلوم ہوتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی طبوں کے ساتھ بھی محبت کریں اور ان کی ترقی میں جو اندرونی و بیرونی رکاوٹیں ہوں انہیں دور کریں''۔[۷]

مسیح الملک مرحوم نے طبیہ کالج کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے فرمایا:

''اگر ہم اپنے ملک کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیں تو اس کے لیے ہمیں جہاں دوسری قومی چیزوں کو سنبھالنا ہے اتنا ہی ہمیں دیسی طریقۂ علاج کی طرف توجہ کرنی نہایت ضروری ہے۔ سچی ترقی کا دارومدار ان ہی چیزوں پر ہوگا اور جب تک ہم باہر کی چیزوں سے بے نیاز نہ ہوں گے اس وقت تک ہم اپنے ملک کی صحیح خدمت کرنے سے قاصر رہیں گے۔[۸]

مسیح الملک کے قومی تصور کا محور صرف دیسی طبیں نہ تھیں۔ عام ملکی اور وطنی معاملات میں ان کے احساسات کس قدر قومی اور ہندوستانی تھے اس کا اندازہ ایک غیر ملکی بحری سفر کے دوران ان کے خود مرتبہ روزنامچہ سے اخذ کردہ مندرجہ ذیل تاثرات سے لگایا جا سکتا ہے:

''ہندوستان کی غلامی کے اثرات میں سے یورپین تہذیب کی تقلید ایک ایسا اثر ہے جو اس قوم سے دور رہنا چاہیے جو کسی آئندہ زمانے میں اپنی قومیت کو اپنی روایات اپنی شائستگی اور تہذیب کو برقرار رکھنے کی غرض سے محفوظ رکھنا اور ایک ایشیائی قوم کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتی ہے۔ یہ تقلید گو کہ ہندوستان کے ہر فرد کے لیے باعث شرم ہو سکتی ہے۔ لیکن اس جہاز کی ہندوستانی خواتین کی حرکات و سکنات ہم سب کے دلوں کو زیادہ دکھا رہی تھیں۔ جس کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ ہم بدقسمتی سے اپنی تعلیم و تربیت کے خود مالک نہیں ہیں اور جس راستہ پر ہم اپنی قومی تعلیم و تربیت کو لانا چاہتے ہیں نہیں لا سکتے۔ یہ سب چیزیں ہندوستانیوں کو اس وقت میسر ہو سکتی ہیں جب کہ وہ اپنے ملک کے انتظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے سکیں اور اس کے ساتھ ہی ملکی اور قومی نقطۂ نگاہ سے تعلیم و تربیت کا بندوبست کر سکیں''۔[۹]

اجمل اعظم اس آزاد ہندوستان کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں کی درسگاہیں قومی تصورات کی مبلغ ہوں اور جہاں نونہالانِ وطن کی تعلیم و تربیت وطنی خصوصیات کی آئینہ دار ہوں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں جن دو درسگاہوں کو اپنے خیالات کی عملی تمثیل بنا کر پیش کرنا چاہا، ان میں ایک آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج ہے جسے گاندھی جی نے ہندو مسلم یگانگت کا پیش خیمہ قرار دیا تھا۔ دوسری درسگاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے جسے حکیم صاحب اپنے بڑھاپے کی اولاد کہا کرتے تھے۔ جامعہ ملیہ کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر بہ حیثیت امیر جامعہ تقریر کرتے ہوئے مرحوم نے فرمایا:

''ہم نے اصولی حیثیت سے تعلیم کو صحیح شاہراہ پر ضرور ڈال دیا ہے اور جہاں ہم نے سچے مسلمان پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کیں وہاں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے کہ تعلیم وتربیت میں ماحول کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ اور اسلامیت کے ساتھ وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا بھی ہمارے پیش نظر ہے چنانچہ اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ جہاں ہندو طلبہ کے لیے بہت سے اسلامی معاملات پر معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ وہاں مسلمان طلبہ بھی اہم ہندو رسوم وتہذیب وتمدن سے ناآشنا نہ رہیں گے۔ ایک متحدہ ہندوستانی قومیت کی اساس محکم اسی باہمی فہم وتفہیم پر منحصر ہے''۔[۱۰]

اس موقع پر طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے حکیم صاحب نے فرمایا:

''وہ سمجھ لیں کہ دنیا میں وہ ایک خادم اور داعی کی حیثیت سے داخل ہو رہے ہیں۔ کسی گروہ یا فرقہ کی خدمت کے لیے نہیں بلکہ نوع انسان کی خدمت کے لیے''۔[۱۱]

حکیم اجمل خاں کے سماجی شعور کی تربیت مسلمانوں کے خالص روایتی ماحول میں ہوئی تھی۔ اسلامی تعلیمات اور مشرقی تہذیب کا ان کی زندگی پر گہرا اثر تھا لیکن ان کی اسلامیت ان کے وطن دوستی کے جذبہ کی تقویت کا سامان تھی۔ ان کے سوچنے کا انداز خالص ہندوستانی تھا۔ مصنوعی حریفانہ خیالات اور خواہ مخواہ کی مذہبی شدت پسندی سے ان کا جو بُعد تھا وہ ان کے اس عقیدہ پر مبنی تھا کہ اسلام دلآزاری کا نہیں رواداری اور تالیف قلب کا نام ہے۔ طبقاتی کش مکش کو ہوا دینے کا نہیں بلکہ انسانی اخوت اور وطنی بھائی چارہ کو فروغ دینے کا نام ہے۔ جب وہ مسلم لیگ کے اسٹیج پر قربانی گاؤ کے مسئلہ پر عام مسلمانوں کے جذباتی نقطۂ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے شرعی اور عقلی دلائل سے اسے غیر ضروری قرار دیتے ہیں تو اس کے پس پردہ ان کا یہی جذبہ کارفرما تھا۔ انہوں نے اپنی وسیع تر مذہبی معلومات سے اس مسئلہ میں علماء وقت کو اپنے موقف کا ہمنوا بنا لیا تھا۔ حکیم صاحب کے اس موقف کے متعلق گاندھی جی نے 'ینگ انڈیا' میں حسب ذیل الفاظ میں تبصرہ کیا تھا:

''مسئلہ قربانی کے متعلق حاذق الملک حکیم اجمل خاں نے اپنے بے مثل خطبہ صدارت میں مذہبی اور عملی نقطہ نظر سے بحث کی ہے۔ حاذق الملک حکیم اجمل خاں کے خطبہ صدارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا یہ خیال کہ قرآن وحدیث گائے کی قربانی کو لازمی قرار نہیں دیتے جس قدر وطن پرستی کے جذبات پر اتنا ہی فہم عامہ اور اخلاق حسنہ پر مبنی تھا۔ یہ حکیم صاحب کی درحقیقت بہت بلند خیالی اور عالی حوصلگی تھی اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے مسلمان ہموطن اسی بلند خیالی کے ساتھ اس اپیل پر اور حکیم صاحب کی ان عملی تجاویز پر لبیک کہیں گے جو بقول ان کے ایمانداری، سچائی اور دل کی گہرائی سے پیدا ہوتی ہے۔[۱۲]

حکیم صاحب کی اسلامیت ان کی ہندوستانیت پر اور ان کی ہندوستانیت ان کی اسلامیت پر ناز کرتی تھی۔ ''حب الوطن من الایمان'' جتنا راسخ اور معنیٰ خیز ان کے یہاں تھا شاید دوسرے مسلمان قومی لیڈروں کے یہاں نہ تھا۔ جمعیۃ علماء کی تحریک ''تنظیم شرعی'' کے وہ مخالف تھے بقول قاضی عبدالغفار صاحب:

''حکیم صاحب کے مذہبی احساسات قومی تھے۔ لیکن وہ مذہبی فرقہ کے اقتدار اعلیٰ کو ایک دودھاری تلوار سمجھتے تھے اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایسا نظام پیدا کرنا پسند نہ کرتے تھے جس میں مذہبی آمریت کا کوئی پہلو پیدا ہوتا ہو۔ وہ جمعیۃ علماء کے بعض گوشوں میں خواہش اقتدار کا عکس دیکھ رہے تھے اور اسے ملکی سیاست کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جس وقت جمعیۃ علماء نے اس تنظیم شرعی کا تخیل پیش کیا اور اس تنظیم کے تحت ایک امیر شریعت کے تقرر کی تجویز سامنے لائی گئی تو حکیم صاحب نے اس سے اختلاف کیا۔[۱۳]

مسیح الملک مرحوم کا قومی تصور مشہور بزرگ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کا وہ فتویٰ بھی برداشت نہ کر سکا جس کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ دشمنانِ اسلام یعنی انگریز کی حکومت سے ہجرت کر کے آزاد اسلامی ممالک میں چلے جائیں۔ بقول قاضی صاحب:

''حکیم صاحب اس تحریک کو سراسر جذباتی سمجھتے تھے اور وطن پرستی کے مفہوم کے منفی شمار کرتے تھے۔ وہ آزادی کی جنگ کو وطن کی زمین پر لڑے جانے کے حق میں تھے۔[۱۴]

حکیم صاحب خلافت کی تحریک کو بھی مذہبی وابستگی کی شکل میں قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ جب مصطفےٰ کمال پاشا کے زیر قیادت ترکوں نے خلافت اسلامیہ کی قبا چاک کر ڈالی اور ترکی سے خلیفۃ المسلمین کا منصب ختم کر کے جمہوری نظام کی بنیاد ڈالی تو ہندوستان کے علماء اور مذہبی حلقوں کی طرف سے اس پر سخت غم وغصہ کا اظہار کیا گیا اور حکومت ترکیہ کو احتجاجی برقیے روانہ کیے گئے مگر حکیم صاحب باوجود اس کے کہ وہ شروع سے خلافت تحریک میں دلچسپی لیتے رہے، اس موقع پر خاموشی اور بے تعلقی برتی بلکہ ناگواری کے ساتھ فرمایا:

''کوئی قوم ہو کوئی مذہب ہو جس میں تنگ دلی ہے، وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے بہت زیادہ دنیا میں اپنی روشنی پھیلائی۔ فراخدلی کے ساتھ اسلام انصاف کا حامی ہے۔ انصاف وعدل کے سامنے دوست دشمن ایک ہیں۔ مگر افسوس کہ آج مسلمانوں نے اس سبق کو فراموش کر دیا اور کجروی نے ان کے قدم جادہ مستقیم سے ہٹا دیئے ہیں''۔[۱۵]

حکیم صاحب کی زندگی کے آخری چند سال ان کی صحت اور اعصابی بیماری کے سخت ترین سال تھے۔ یوں تو وہ پہلے سے دل کے مریض تھے۔ مگر صبح وشام کی

مسلسل محنت، شب و روز کی انتھک جدوجہد نے انہیں اور بھی کمزور کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر فرقہ وارانہ فسادات نے پوری کر دی۔ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈر سوراجی اور نوچنجری کے دو حریف گروپوں میں بٹے ہوئے اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ کونسلوں میں جانے اور باہر رہنے کی جنگ میں مصروف تھے۔ گاندھی جی پبلک زندگی سے علاحدہ ہو کر سابرمتی آشرم میں بیٹھ گئے اور حکیم صاحب نے نینی تال کے قریب گھوڑا کھال میں جائے پناہ ڈھونڈ لی۔ بقول قاضی صاحب:

''اس طرح ۱۹۲۴ء میں قومی میدان سے دو بڑے رہنماؤں نے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ یعنی مہاتما گاندھی اور حکیم صاحب دونوں نے ایک ہی قسم کی مایوسی اور ناکامی سے تنگ آ کر اپنے اپنے لیے گوشۂ تنہائی تلاش کیا''۔[۱۶]

حکیم صاحب نے عید قربان کے موقع پر نینی تال سے مسلمانوں کے لیے جو پیغام بھیجا اس کا ایک ایک لفظ سوز اور دردمندی میں ڈوبا ہوا ہے:

''کچھ عرصہ سے میں نہایت رنج و غم کے ساتھ ہندو اور مسلمانوں میں قابل افسوس غلط فہمیوں کے ارتقاء کا مطالعہ کر رہا ہوں جس نے اس بدقسمت ملک کے ہندو مسلمانوں کے بڑے حلقوں میں موجودہ کشیدگی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں ان واقعات کو عارضی اور گزر جانے والی گھٹا کی طرح سمجھتا ہوں جس نے کچھ عرصہ کے لیے ہماری امیدوں کے آفتاب کی شعاعوں کو ڈھانک لیا ہے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ ہمارے مستقبل اور قومی مفاد کی حفاظت اور ملکی تمناؤں کے بر آنے کا دارومدار ہندو مسلم اتحاد پر ہے۔ میں اپنے مسلمان بھائیوں سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہمارے ملک و مذہب کی تاریخ کے اس اہم موقع کا لحاظ رکھیں اور ان امور کو نظر انداز کرتے ہوئے جن سے دلوں کو تکلیف پہنچی ہے، قربانی گاؤ کو ترک کرنے کے اپنے رویہ کو جاری رکھیں۔ اگر میں اپنی خرابی صحت سے عارضی گوشہ نشینی سے مجبور نہ ہوتا تو میں اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین غلط فہمی رفع کرنے کے لیے صرف کرتا اس لیے کہ انہیں کے تعاون پر ہمارے مستقبل کا مفاد اور ہندوستان کی نجات کا دارومدار ہے''۔[۱۷]

انگریزوں کا پھیلایا ہوا زہر اپنا کام کر رہا تھا۔ جذبات کے طوفان میں اچھے اچھے لوگوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے۔ حکیم صاحب کے دل پر جو بیت رہی تھی وہ صرف وہی نہیں بلکہ دوسرے بھی سمجھ رہے تھے۔ ان کے مرض کی مخصوص نوعیت اور نظام عصبی پر اثر انداز ہونے والے ملکی حالات سے ان کی زندگی کو جو خطرہ درپیش تھا اس سے ان کے ہمدرد اور بہی خواہ باخبر تھے۔ چنانچہ مشورہ ہوا کہ کچھ دنوں کے لیے ملک سے باہر ہو آیئے۔ بقول قاضی صاحب مجروح دل، آزردہ مزاج، تباہ حال صحت اور مایوسیوں کا یہ پشتارہ بطور زادراہ لے کر ۱۰/اپریل ۱۹۲۵ء کو دیار غیر کی جانب روانہ ہوا۔ خود حکیم صاحب نے جو روزنامچہ سفر مرتب کیا اس کے الفاظ یہ ہیں:

''اب ۱۹۲۵ء میں پھر ہندوستان سے باہر جا رہا ہوں۔ یہ تیسرا سفر دماغ و اعصاب کو جن کی حالت برسوں متواتر تکان کی وجہ سے واقعی طور پر قابل رحم ہو گئی تھی، آرام و سکون پہنچانے اور اس وجہ سے جو صدمہ عام صحت کو پہنچ گیا ہے اسے دور کرنے کی غرض سے ناگزیر طور پر اختیار کیا گیا ہے''۔[۱۸]

حکیم صاحب گئے تھے سکون دل ڈھونڈنے مگر قوم و ملک کے اس سچے فدا کار کا ذہن ملکی حالات سے بے نیاز کیسے رہ سکتا تھا۔ دیار غیر میں بھی اپنوں کے حالات اور وطن کی بدنصیبی کے کوائف ''گریہ خاموش'' بن کر ان کی رگ رگ سے ان کی زندگی کا خون چوس رہے تھے۔ مصر میں ''انجمن رابطہ ہندیہ'' کی دعوت میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

''میں مصر میں بھی ہندوستانیوں کا اتحاد نہیں دیکھتا جیسا کہ ہونا چاہیے۔ ایسی حالت میرے لیے دل خوش کن نہیں ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جو حضرات اس وقت موجود ہیں وہ غریب الوطنی میں مٹھی بھر ہندوستانیوں کو متحد و متفق کرنے کی زندگی بسر کریں گے''۔[۱۹]

حکیم صاحب کے نزدیک ہندوستانیوں کے اتحاد کا مفہوم صرف ہندو مسلم اتحاد نہیں بلکہ قوم کی تمام اکائیوں کا اتحاد تھا۔ زبان کے اختلافات ہوں، صوبوں کے جھگڑے ہوں یا شمال و جنوب کی کشیدگی، غرض یہ کہ ہر طرح کے اختلاف و انتشار کو وہ قومی ترقی میں مانع سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ آپس میں ہندو ہندو کے فساد اور مسلمان مسلمان کے جھگڑے کو بھی وہ ہندوستان کے قومی ارتقاء کے خلاف سمجھتے تھے۔ جب حکیم صاحب سفر سے واپس آئے تو اخبار خلافت کو ایک بیان دیتے ہوئے فرمایا:

آج ضرورت تھی کہ ہندوستان آزادی ایشیا کا علمبردار ہوتا مگر یہ امر کس قدر باعث شرم ہے کہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں بلکہ ہندو ہندو بھی آپس میں دست و گریباں ہیں''۔[۲۰]

یوں تو حکیم صاحب کی زندگی کی تمام دلچسپیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں اور ان کو اپنی منزل سامنے نظر آ رہی تھی۔ لیکن اپنی زندگی کے آخری بارہ مہینوں میں بھی وہ اپنے تین مخصوص فرائض بدستور انجام دیتے رہے یعنی آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ہندو مسلم اتحاد۔ ان تینوں کے متعلق ان کی دلچسپیاں علالت میں بھی ویسی ہی تھیں جیسی کہ تندرستی کی حالت میں تھیں۔ اپنی وفات کے چند ماہ قبل شریف منزل میں ہندو مسلم نمائندوں کے ایک اجتماع میں جو فرقہ وارانہ کشیدگی پر غور کرنے اور باہم غلط فہمیوں کو دور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا اور جس میں ایک مصالحتی بورڈ بنا کر حکیم صاحب کو اس کا چیئرمین بنایا گیا تھا۔ تقریر کرتے

ہوئے حکیم صاحب نے فرمایا:

''میں گزشتہ دو سال سے علیل ہوں۔ علالت کے باعث میں اس قابل نہ تھا کہ کسی پبلک جلسہ میں تقریر کروں لیکن ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں''۔[۲۱]

حکیم صاحب کی نیک نیتی پر ہندوؤں کو بھی اتنا ہی بھروسہ تھا جتنا کہ مسلمانوں کو۔ وہ تنہا مسلمان لیڈر تھے جنہیں ہندو مہا سبھا نے اپنا صدر مجلس استقبالیہ منتخب کر کے ان کی قومی رواداری اور عالی ظرفی پر اظہار اعتماد کیا تھا۔ اگر حکیم صاحب کچھ دن اور زندہ رہتے تو شاید مسلم لیگ کے زیر اثر مسلمانوں کو اور اجمل کے ہندوستان کو وہ بدنصیب دن نہ دیکھنا پڑتا جو بعد میں دیکھنا پڑا مگر قضا و قدر کے آگے کس کی چلی ہے۔ آخر کار یہ جراحت مجسم، جگر سوختہ، سینہ فگار، کشتہ آلام، قومی یک جہتی کا مثالی انسان، حکیم محمود خاں کا عہد آفریں بیٹا، حکیم صادق علی خاں کا پوتا، اشرف الحکماء حکیم شریف خاں کا پڑپوتا اور اکمل الحکماء حکیم اکمل خاں کا نگر پوتا ۲۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو اپنے تمام تر زخمی احساسات کے ساتھ اپنے اس مالک کے حضور پہنچ گیا جو تمام بندوں کا خدا ہے اور جو بلا لحاظ مذہب و ملت ہر انسان کا خالق ہے۔

حوالہ جات

۱- سیرت اجمل، ص ۲۴
۲- قاضی محمد عبدالغفار، حیات اجمل، ۱۹۵۰ء، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ص ۹۳
۳- حیات اجمل: ص ۹۳
۴- ایضاً: ص ۶۲
۵- ایضاً: ص ۲۴۱
۶- اجمل میگزین فروری ۱۹۳۸ء
۷- طبّی کانفرنس کراچی کے جلسہ میں مسیح الملک کا خطبہ صدارت بحوالہ اجمل میگزین فروری ۱۹۳۸ء
۸- حیات اجمل
۹- ایضاً
۱۰- یادوں کی دنیا از ڈاکٹر یوسف حسنین خاں
۱۱- حیات اجمل
۱۲- ایضاً
۱۳- ایضاً
۱۴- ایضاً
۱۵- ایضاً: ص ۲۹۹
۱۶- ایضاً: ص ۳۲۶
۱۷- ایضاً: ص ۲۸۷
۱۸- ایضاً: ص ۳۳۲
۱۹- ایضاً: ص ۳۵۶
۲۰- ایضاً: ص ۳۷۳
۲۱- ایضاً: ص ۴۳۲

[مطبوعہ: سالانہ میگزین ۹۲-۱۹۹۱ء، آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی، صفحہ ۵-۱۴]

●●●

الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے

حکیم مظہر سبحان عثمانی

اولوالعزمی، منصوبہ بندی، خوداعتمادی، وضع داری، تحقیق وعلم پروری، طمانیت قلب وخدمت خلق جیسی صفات عالیہ کے حسن امتزاج کا نام حکیم عبدالحمید ہے۔ نوراللہ مرقدہ۔ لفظوں کی مینا کاری اور حرفوں کی صناعی سے اس شخصیت کی معنویت کا ایسا خاکہ کھینچنا جیسا کہ حق ہے، ایک مشکل کام ہے۔

تغلق آبادی نئی دہلی میں نوے ایکڑ زمین پر واقع خوبصورت اور سربلند عمارتوں کا شہر جامعہ ہمدرد، دورِ جدید کے ایک نئے شاہ جہاں کی یاد دلاتا ہے۔ حکیم صاحب مرحوم کے انتقال پر انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا نے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنے اداریے میں بجا طور پر لکھا تھا: ''حکیم صاحب کی جدوجہد کے نتیجے میں طب یونانی عالمی سطح پر متعارف ہوئی''۔

مگر حکیم صاحب کی فکر رسا صرف طب یونانی ہی تک محدود نہیں تھی۔ اسلامیات، سماجیات، ادبیات اور نہ جانے کتنے علوم وفنون ان کی نگاہ تحقیق وذوق جستجو کے محور تھے۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، سنٹر فار ایڈوانس وسوشیولوجکل اسٹڈیز، سنٹر فار ساؤتھ ایشین اسٹڈیز، سنٹر فار فیڈرل اسٹڈیز، ہمدرد اسٹڈی سرکل، ہمدرد آرکائیوز اینڈ ریسرچ سینٹر اور غالب اکیڈمی اس کی چند مثالیں ہیں۔ جن لوگوں نے حکیم صاحب مرحوم کے ایما پر ان کی مالی اعانت سے ان کی نگرانی میں ادب وعمرانیات میں کام کیے وہ کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ان میں پروفیسر رشید الدین خاں سابق صدر شعبۂ سماجیات، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، پروفیسر اعجاز عسکری، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، پروفیسر محمد حسن دہلی یونیورسٹی، نیشنل آرکائیوز کے سابق ڈائرکٹر جناب ترمذی جیسے بلند مرتبہ اہل علم شامل ہیں۔

ذرا تصور کیجئے ۱۹۴۷ء کا وہ زمانہ جب تقسیم وطن کے نتیجے میں دہلی آگ وخون کے دریا میں ڈوبی ہوئی تھی۔ لوگ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر جائے پناہ کی تلاش میں بھاگ رہے تھے۔ اس وقت حکیم عبدالحمید اپنے خوابوں کے ایک گلستان علم وحکمت کی تلاش تعبیر میں تغلق آباد کی خاردار جھاڑیوں کی خاک چھان رہے تھے۔ یہ وہی سرزمین علم وحکمت ہے جہاں آج خوبصورت اور بلند عمارتوں کا شہر، جامعہ ہمدرد، دور جدید کے ایک نئے شاہ جہاں کی یاد دلا رہا ہے۔ استقامت اور یقین محکم کی یہ ایک ایسی مثال ہے جو صدیوں تک تنازع للبقاء کے میدان میں مسلمانوں کے لیے مشعل راہ بنی رہے گی۔

حکیم صاحب کے مورث اعلیٰ سترہویں صدی کے اوائل میں کاشغر، ترکستان سے آکر پشاور میں آباد ہوئے تھے۔ پھر یہ خاندان، ملتان، پانی پت اور پیلی بھیت بغرض سکونت منتقل ہوتا رہا۔ پھر ۱۸۲۰ء میں دہلی آیا اور پرانی دہلی کے حوض قاضی کے علاقے میں ایک کرایے کے مکان میں آباد ہوا۔ ہمدرد کی ابتداء حوض قاضی کی ایک چھوٹی سی دکان میں محض سو روپے کے سرمایہ سے ہوئی۔ پھر یہ ہمدرد مارچ ۱۹۲۲ء میں لال کنویں میں منتقل ہوا۔ حکیم عبدالحمید کے والد ماجد حکیم حافظ عبدالمجید پہلے ہندوستانی دواخانے میں کام کر چکے تھے۔ وہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کی شخصیت سے کافی متاثر تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ہمدرد کو ایک اعلیٰ درجے کا فلاحی ادارہ بنانے کا خواب دیکھا۔ جب ۲۲ جون ۱۹۲۲ء کو حکیم المجید کا انتقال ہوا تو اس وقت تیرہ سالہ حکیم عبدالحمید نے ہمدرد کے انتظام اور تعمیر وترقی کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنے والد کے خوابوں کی تعبیر کی تکمیل میں رواں دواں ہوئے۔ وہ اپنے وقت کے طبیب اعظم تھے۔ باوجود اس کے کہ ان کو ہر طرح کے آرام وتعیش کے وسائل حاصل تھے مگر انہوں نے عافیت پسندی سے اپنے آپ کو بہت دور رکھا۔ موسم گرما میں وہ زمین پر چٹائی بچھا کر سوتے تھے اور

سردیوں کے موسم میں بستر کے طور پر ہلکی توشک کا استعمال کرتے تھے۔ شدت کی سردیوں میں بھی وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کیا کرتے تھے۔ زیادہ تر وہ اپنے کپڑے خود دھوتے تھے۔ اپنے جوتوں پر خود پالش کرتے تھے۔ زندگی انتہائی سادہ تھی اور غذا بھی بہت سادہ استعمال کیا کرتے تھے۔ ان کی زندگی ایک درویش اور بوریا نشین جیسے شخص کی تھی۔ گاندھی جی نے حکیم اجمل خاں کو 'خاموشی کا دیوتا' کہا تھا اور وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے انہیں 'میگنٹ آف انڈیا' قرار دیا تھا۔ بالکل اسی طرح حکیم عبدالحمید بھی خاموشی کے دیوتا تھے اور ان میں ایک خاص طرح کی مقناطیسی کشش پائی جاتی تھی۔

''نذر حمید'' مرتبہ مالک رام وفا میں خواجہ حسن ثانی نظامی نے لکھا ہے:

''حکیم صاحب عمر کے اس حصے میں ہیں جب ہندوستانی اصول سے تو آدمی کا کام دوسروں کو سکھانے کا رہ جاتا ہے، خود سیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن وہ اس بڑھاپے میں بھی بہت سا وقت خود سیکھنے میں لگاتے ہیں۔ اپنے تجربوں سے دوسروں کو فیض یاب کرنے کے ساتھ دوسروں کے تجربوں میں برابر شریک رہتے ہیں''۔

اس سلسلے میں اپنا ایک ذاتی مشاہدہ بھی یہاں پر نقل کرنا چاہتا ہوں۔

اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پروفیسر معالجات کا انتخاب ہونا تھا۔ حکیم صاحب مرحوم سیلکشن کمیٹی کے ایکسپرٹ ممبر تھے اور ان کے ساتھ سی سی آر یو ایم کے اس وقت کے ڈائرکٹر حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم بھی سلیکشن کمیٹی کے ممبر تھے۔ جب یہ قافلہ بذریعہ کار علی گڑھ کے لیے روانہ ہوا تو مرحوم عبدالرزاق صاحب نے مجھے بھی علی گڑھ چلنے کے لیے اپنے ساتھ لے لیا۔ وہاں پر یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ہم لوگوں نے قیام کیا۔ حکیم عبدالحمید مرحوم گیسٹ ہاؤس کے صحن میں ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ میں ان کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ علمی گفتگو ہو رہی تھی۔ دوران گفتگو بیخ کبر کا ذکر چل پڑا۔ میں نے اس وقت جب یہ کہا کہ اس دوا کا پھول بطور اچار بھی استعمال ہوتا ہے اور پنجاب کے لوگ بکثرت اس کو پسند کرتے ہیں اور وہ اپنی زبان میں اس کو ٹینٹی بولتے ہیں تو میں نے دیکھا کہ حکیم صاحب نے فوراً اپنی جیب سے چھوٹی سی ایک پاکٹ ڈائری نکالی اور اس میں کچھ لکھنے لگے۔

حکیم صاحب اپنے وقت کے طبیب اعظم تھے۔ تقریباً ایک کروڑ مریضوں کے علاج کا ان کو موقع ملا۔ بہت سارے قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے نوازے جا چکے تھے۔ جامعہ ہمدرد کے بانی چانسلر تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بھی چانسلر تھے۔ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے صدر تھے۔ عاجزی وانکساری ان کی طبیعت ثانیہ تھی۔ حکیم صاحب خاموش طبع شخصیت کے مالک تھے مگر برجستگی وحاضر جوابی میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ حکیم صاحب کی زیر قیادت یونانی طبّی کانفرنس کا ایک وفد جس میں راقم الحروف اور حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم بھی شامل تھے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر جناب سید حامد صاحب سے ملنے علی گڑھ پہنچا۔ مسئلہ تھا سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کو مسلم یونیورسٹی کی زمین منتقل کرنے کا۔ وائس چانسلر صاحب کی منظوری کا ڈرافٹ تیار ہو کر دستخط کے لیے جب ان کے سامنے لایا گیا تو انہوں نے حکیم صاحب کی طرف ہاتھ بڑھا کر یہ کہتے ہوئے ان کا قلم مانگا کہ لائیے آپ ہی کے قلم سے میں دستخط کرتا ہوں۔ حکیم صاحب نے برجستہ کہا ''تاکہ اسے بقلم خود نہ کہا جا سکے''۔

آج سے تقریباً بیس سال پہلے حکیم صاحب کی شخصیت سے متاثر ہو کر ایک قطعہ جس کا ایک مصرعہ زیب عنوان کے طور پر اوپر لکھا گیا ہے، اس قطعہ کو مکمل کرتے ہوئے میں اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

الفاظ جگہ پائیں جو دامن میں عمل کے
سرخی بھی بدل جائے، فسانہ بھی بدل جائے
باتوں سے نہ بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ
اپنے کو بدل لو تو زمانہ بھی بدل جائے

[مطبوعہ: پیکر فکر وعمل: حکیم عبدالحمید، ترتیب: حکیم محمد خالد صدیقی، صفحہ ۱۵۹-۱۶۲، اشاعت: ۲۰۱۰ء، فراز خالد، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی]

●●●

تذکرہ استاذ

حکیم مظہر سبحان عثمانی

ہر طالب علم کو تحصیل علم کے مختلف المراحل دور میں متعدد اساتذہ فن سے کسب فیض کا موقع ملتا ہے۔ مگر ایسے اساتذہ کم ہوتے ہیں جو مدارس و جامعات کی مقررہ میعاد تعلیم ختم ہو جانے کے بعد بھی اپنے تلامذہ کی علمی سطح اور فکری رجحان کو بلند سے بلند تر کرنے کے لیے دم آخر تک چشمہ فیض بنے رہتے ہیں۔ ایسے ہی اساتذہ فن کی صف میں ایک قد آور اور دلآویز شخصیت میرے اُستاد شکیل احمد شمسی کی بھی تھی۔ اُستاد مرحوم سے اپنے تلمذانہ تعلق کے گزشتہ تیس سال کے طویل زمانہ پر نظر ڈالتا ہوں تو ان کی پُر فیض رفاقت، بے پایاں محبت اور گرانمایہ سرپرستی کے آگے سر نیاز خم ہو جاتا ہے۔ یوں تو ہزاروں فرزندان طب کو حکیم صاحب کی شاگردی پر ناز ہوگا، ہونا بھی چاہیے مگر جو قرب و اعتماد مجھے حاصل تھا اس پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ حکیم صاحب صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے اسم بامسمی تھے وہ رامپوری وجاہت، لکھنوی نفاست اور خاندانِ عزیزی کے آداب طبابت کے ایک حسین مرقع تھے وہ کلاس میں لکچر دیتے وقت طلبا کو پیچیدہ طرز استدلال سے مرعوب کرنے یا اسباق کے کڑوے گھونٹ پلانے کے بجائے فنی مباحث کو جرعہ شیریں بنا کر پیش کیا کرتے تھے۔ نجی گفتگو میں بھی ان کا لہجہ نرم و شیریں، الفاظ موزوں و برمحل اور طرز ادا ایسی تھی کہ سُننے والا ان کی شگفتہ مزاج طبیعت اور پروقار شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اپنے سے بہت چھوٹے لوگوں سے اس طرح ملتے تھے جیسے وہ لوگ نہ صرف ان کے برابر میں بلکہ ان سے مرتبہ میں بلند ہیں ایسا ہی معاملہ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ بھی رکھتے تھے جو دراصل ان کی اپنی عظمت اور طبعی فراخدلی کا ثبوت تھا۔ ایک خط کے جواب میں مجھے لکھتے ہیں۔

۷۸۶

حکیم عبدالعزیز روڈ، لکھنؤ

۱۸ ۳/۶۴

محبّ محترم! سلام مسنون

خط مل گیا میں نے متعلقہ ارباب اختیار کو لکھ دیا ہے۔ جس نئی کوالیفکیشن کے اضافہ کی اطلاع آپ نے دی ہے۔ اس پر مبارکباد قبول کیجئے، ایک ایسے شخص کی مبارکباد جو ابھی تک خود اس کوالیفکیشن سے محروم ہے۔ یکسانیت مذاق اور آپ کے علمی وفنّی جذبہ نے آپ کو مجھ سے قریب تر کر رکھا ہے اور یہ آپ ہی کی خوبی ہے۔

شکیل

حکیم صاحب ایک کہنہ مشق شاعر تھے ان کے اشعار کا مجموعہ ''قید حیات و بندِ غم'' کے نام سے ان کے زمانہ حیات ہی میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکا ہے۔ مرحوم نے اس کی ایک دستخط شدہ کاپی ''عزیز محترم حکیم مظہر سبحان عثمانی کی خدمت میں'' لکھ کر راقم الحروف کو مرحمت فرمائی تھی اور فرمایا تھا کہ کتاب کے آغاز میں اعتراف اور اختتام پر انحراف کے زیرِ عنوانات جو تاثرات قلم بند کیے گئے ہیں اُن کو میں خاص طور پر پڑھوں اور اپنی رائے سے انہیں مطلع کروں، حکیم صاحب نے تقریباً ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے کلام میں پختگی اور فنکاری پائی جاتی ہے، ان کی شاعری ان کے کردار اور سیرت کا آئینہ اور خود ان پر گزری ہوئی کیفیتوں کا مرقع ہے۔ حکیم صاحب فنی درسیات اور طبّی سیاسیات میں ہی نہیں بلکہ ہر معاملہ میں مرکزِ فکر بن کر میری افتادِ طبع سے ہم آہنگ ایک مثالی شخصیت کے

طور پر میرے پیش پیش رہے ہیں۔ یکسانیت مذاق اور اتحادِ فکر کی یہ حقیقت حکیم صاحب پر بھی منکشف تھی جس کا اظہار ان کے مکتوب مورخہ ۱۸/اپریل ۱۹۶۴ء سے ہوتا ہے۔ راقم الحروف کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی رہی ہے اور کبھی کبھی ''آورد'' نہیں بلکہ ''آمد'' کے تحت شعر موزوں ہوتے رہے ہیں اُستاد مرحوم سے ''یکسانیت فکر'' کی جھلک شعر و سخن کی دنیا میں بھی نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہوں۔

غزل کے چند اشعار:

نئی حیات نے عالم نیا سنوارا ہے — جو تیرے در سے دُور گزری ہے
مزا یہ ہے کہ اسی زندگی نے مارا ہے — مجھے اس زندگی نے مارا ہے
سفینہ خود ہی تلاطم پسند ہے شمسی — اہلِ ہمّت کو ہر جگہ ہے سکوں
نہیں تو ہر نفس موج خود کنارا ہے — جو ہے طوفاں وہی کنارا ہے

[حکیم شکیل احمد شمسی] — [حکیم مظہر سبحان]

۱۹۵۵ء کی بات ہے حکیم صاحب کا تقرر مشہور طبّی درس گاہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، نئی دہلی میں پرنسپل کے عہدے پر ہو گیا تھا۔ حکیم صاحب کا تکمیل الطب کالج، لکھنؤ کو چھوڑ کر دہلی چلے جانا طلبہ کالج کے لیے کسی سانحہ سے کم نہ تھا۔ طلبہ میں جب یہ خبر عام ہوئی تو پورا کالج رنج و غم کی فضا میں ڈوب گیا اسٹوڈینٹ یونین نے حکیم صاحب کے اعزاز میں ایک الوداعیہ جلسہ کا اہتمام کیا۔ اس موقع کے لیے میں نے ایک الوداعیہ نظم بھی لکھی تھی جس کا ایک شعر آج بھی ذہن میں محفوظ ہے۔

جس کا لکچر لا جواب اور جس کی باتیں دل پذیر
اب یہاں سے وہ شکیل خوش بیاں جانے کو ہے

یہ تاثر صرف میرا تنہا نہ تھا بلکہ تمام طلبہ کالج کا تھا اس سے حکیم صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کے بارے میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو طلبہ میں ان کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کے وصف سے تعلق رکھتا ہے۔ حکیم صاحب سے طلبہ کی قلبی وابستگی کو دیکھتے ہوئے ان کی دہلی روانگی کے وقت لکھنؤ کے چار باغ ریلوے اسٹیشن پر لوگوں کا بھاری تعداد میں جمع ہونا اور جذباتی نعروں سے ماحول کو پر ہنگام بنانا ایک متوقع امر تھا۔ حکیم صاحب ایسا نہیں چاہتے تھے۔ حکیم صاحب نے مجھ سے فرمایا ''میں دہلی جا رہا ہوں مگر لکھنؤ چھوڑ کر وہاں کتنے عرصہ تک رہ سکوں گا فی الحال کچھ نہیں کہہ سکتا آپ طلبہ کو ریلوے اسٹیشن پر جمع ہونے سے روکیے چند دنوں بعد لکھنؤ آنے کا ارادہ ہے اس وقت اپنے قطعی فیصلہ سے آپ لوگوں کو آگاہ کروں گا پھر آپ لوگ جس انداز اور جس تعداد میں مجھے رخصت کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر آئیں مجھے کوئی عذر نہیں ہوگا۔ اگرچہ طلبہ کو ریلوے اسٹیشن پر آنے اور حکیم صاحب کو الوداع کرنے سے روکنا ایک مُشکل کام تھا بہر حال حکیم صاحب کی خواہش کا احترام کیا گیا صرف ہم چند مخصوص لوگوں نے اسٹیشن پہنچ کر چشم پرنم کے ساتھ حکیم صاحب کو الوداع کہا۔ وہی ہوا جس کا اشارہ حکیم صاحب کی باتوں سے ہم لوگوں کو مل چکا تھا چند روز بعد ہی حکیم صاحب دہلی کی ملازمت چھوڑ کر اپنی مادر درس گاہ تکمیل الطب کالج لکھنؤ میں اپنی سابقہ ملازمت پر لوٹ آئے۔ ہم طلبہ کالج نے حکیم صاحب کی واپسی کا خیر مقدمی جلسہ اور بھی شان و اہتمام کے ساتھ منعقد کیا اس موقع پر حکیم صاحب نے سوز و کیف میں ڈوبی ہوئی ایک مرصّع غزل بھی سنائی جو حکیم صاحب کے مجموعہ اشعار ''قیدِ حیات و بندِ غم'' میں ''مراجعت لکھنؤ'' کے زیرِ عنوان شامل ہے۔ غزل کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

مجھے آنے لگی پھر یاد ایام کہن ساقی — جنوں آمادۂ وحشت ہے دل توبہ شکن ساقی
تصور میں اُبھر آئی ہے پھر وہ انجمن ساقی — محبت تھی جہاں ہوش و خرد پر خندہ زن ساقی
سلامت تیری شام میکدہ کی بزم آرائی — مجھے لیکن بُلاتی ہے مِری صبح وطن ساقی
جہاں پینے کی ہمت ہی نہیں لیکن بہکتے ہیں — وہاں توہینِ رندی کا تماشائی نہ بن ساقی

حکیم صاحب کا تعلق ریاست رامپور کے ایک علمی خانوادہ سے تھا۔ آپ کے نانا شمس العلماء حکیم مولوی منور علی، پروفیسر ڈھاکہ یونیورسٹی کا شمار اپنے وقت کے صاحبان کمال لوگوں میں ہوتا تھا۔ ان ہی کی آغوش تربیت میں مرحوم کے علمی ذوق اور فکری رُجحان کو آب و رنگ ملا۔ آپ نے مدرسہ عالیہ رامپور سے دستار فضیلت حاصل کرنے کے بعد فاضل ادب عربی کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا تھا جو کہ عربی لٹریچر میں نہایت اعلیٰ درجہ کا امتحان سمجھا جاتا تھا۔ اردو، فارسی اور عربی زبانوں پر عبور رکھنے کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ طب کی تکمیل برِّصغیر ہند کی مشہور طبّی درس گاہ تکمیل الطب کالج سے کی تھی۔ شفاء الملک

حکیم عبدالحمید اور شفاء الملک حکیم عبدالمعید جیسے مشاہیر فن سے آپ کو رشتہ تلمذ حاصل تھا۔ طبّی تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے وطن رامپور میں مطب شروع کیا۔ کچھ دنوں تک حبیبیہ طبیہ کالج ڈھاکہ میں پروفیسر کے عہدہ پر بھی مامور رہے پھر لکھنؤ آ گئے اور مادر درسگاہ تکمیل الطب کالج سے متعلق ہو گئے۔ وائس پرنسپل پھر پرنسپل کے درجہ تک رسائی پائی اور بالآخر رضا کارانہ طور پر از خود سبکدوشی حاصل کر لی۔ کالج سے قطع تعلق کے بعد آپ نے اپنی توجہ کا محور مطب اور ملک کی طبّی تعلیم وطبّی سیاسیات تک محدود رکھا کبھی کبھی شعر وادب کی منتخب نشستوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ حکیم صاحب کے مزاج میں جدت اور اختراع پسندی کا ایک خاص انداز پایا جاتا تھا جس کا اظہار ان کے انوکھے طریقِ مطب سے ہوتا تھا۔ آپ کا شمار ہندوستان کے معدودے چند کامیاب اور مصروف ترین یونانی معالجین میں ہوتا تھا اپنی مصروف معالجانہ زندگی کے باوجود طبّی کانفرنس کے اجتماعات، یونانی طب سے متعلق مرکزی وزارت صحت کی مختلف کمیٹیوں میں باقاعدگی اور دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے تھے جہاں ان کے مشوروں کو بڑی قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حکیم صاحب کی تعلیم وتربیت خالص مشرقی ماحول میں ہوئی تھی، خاندانی پس منظر بھی مشرقی ہی تھا۔ مگر وہ کورانہ تقلید کے قطعاً قائل نہ تھے۔ طب یونانی کے تعلق سے وہ ایک ایسے موقف کو اختیار اور عام کرنا چاہتے تھے جس میں آئندہ آنے والے تصورات کو جذب کرنے اور پھر بھی اپنی اصلیت پر قائم رہنے کی صلاحیت ہو۔ ایک موقع پر وہ لکھتے ہیں:

''معاف فرمائیں میرے بزرگ اور احباب! باوجود ایک متعصب طبیب ہونے کے میں کبھی اس کا قائل نہ ہو سکا کہ طبّی ریسرچ بوعلی سینا اور رازی پر ختم ہو گئی، اوراق پارینہ ہمارے لیے سبق آموز ضرور ہیں لیکن مشعلِ راہ نہیں بدگمانی نہ کیجئے میں یہ نہیں کہتا کہ ''ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ'' لیکن شاید اس سے آپ بھی انکار نہ فرما سکیں کہ اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور۔ عیب چھپا کر ہم زندہ نہیں رہ سکتے عیب دُور کر کے حیاتِ جاوداں پا سکتے ہیں۔ میں خود ان لوگوں میں ہوں جو یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ بہت سے نئے امراض اور نئی تحقیقات پُرانی کتابوں سے ثابت کی جا سکتی ہیں لیکن یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ فلاں بیماری ہماری درسی کتب میں مدون نہیں ہے۔ تنگ نظر مذہبی مولویوں کی طرح اطباء کی طلب وتحقیق بھی گلدستہ طاق نسیاں ہو کر رہ گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پچھلے کچھ دنوں یہ فن انہیں بزرگوں کی آغوش میں پروان چڑھا۔

[الطبیب لاہور، فروری ۱۹۴۰ء]

گزشتہ ربع صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ سے ہندوستان کی طبّی درسگاہوں میں حصول اقتدار کے لیے گندی سیاست اور رکیک داؤں پیچ کا جو دور چلا آ رہا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے اس کا سامنا حکیم صاحب کو بھی کرنا پڑا مگر حکیم صاحب بہت ہی حساس اور نازک طبع واقع ہوئے تھے۔ گروہی سیاست اور کید وفریب ان کے بس کی بات تھی نہ ان کی شرافت مزاجی اس سے ہم آہنگ ہو سکتی تھی جب کہ کالج میں ان کے مقابل حریف اس میدان کے آزمودہ کار کھلاڑی تھے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کر سکتے تھے۔ انجام کار وہی ہوا جو ہونا تھا یعنی حکیم صاحب نے استعفیٰ دے کر تکمیل الطب کالج سے قطع تعلق کر لیا۔ ان معاملات پر حکیم صاحب نے راقم الحروف کے نام اپنے مکتوبات میں جس انداز سے اظہار خیال فرمایا ہے اس سے ان کی شخصیت، طبیعت، افتادِ فکر کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

حکیم عبدالعزیز روڈ، لکھنؤ

۲۲/ اکتوبر ۱۹۶۴ء

محبّ محترم! سلام مسنون

میری صحت کسی عصبی تناؤ کی متحمل نہیں رہی ہے اس لیے ترک ملازمت قطعی اور بالکل قریبی ہے۔ اولڈ بوائز کے سلسلے میں کسی تردید یا تصحیح کی ضرورت نہیں ہے مبہم چیز کو مبہم ہی رہنے دیا جائے تو بہتر ہے۔ اصل موقف یہ ہے کہ طبقۂ اطباء جو ایک غیر حکیم کو کسی طبّی ادارہ کا سربراہ دیکھنے کا متحمل نہیں ہے اور علی گڑھ اس سلسلے میں عملی نمونہ موجود ہے۔ وہ ایک دوسرے ادارہ پر بالکل غیر فنّی اجارہ داری کیوں برداشت کرے۔

حکیم بی۔ این شرما صاحب کا ایک مضمون پمفلٹ کی شکل میں ملا ہے۔ عجیب ژولیدہ خیالی کا شاہکار ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ شدھ کے مقام سے واپسی ہے یا سابقہ موقف سے تبریٰ یا ہوا کا رُخ پہچان کر سیاسی کرتب؟ آپ کو اپنی ملازمت اور رفقاء کار کی مصالح ضرور سامنے رکھنا چاہیے گھر پھونک کر تماشا دیکھنا بالکل جذباتی بات ہے جو عقلمندی کے خلاف ہے۔ مجھے آپ کے خلوص اور دوستی پر پورا بھروسہ ہے۔ میں نے اعجاز صاحب کو مشورہ دیا ہے کہ اولڈ بوائز کا اجتماع سہارنپور کے متوقع اجلاس کانفرنس میں کر لیں۔ یہ سہل ترین صورت ہے عندالملاقات مفصل گفتگو ہو گی مگر ملاقات! یہ بات بتانا مشکل ہے غالباً ۹/ نومبر کو سہارنپور میں ورکنگ کمیٹی صوبائی کا جلسہ ہو، اس وقت آپ سہارنپور آ سکتے ہیں دہلی سے زیادہ دور نہیں ہے۔

شکیل

اولڈ بوائز سے مراد تکمیل الطب کالج کے ''ابنائے قدیم کی تنظیم'' سے ہے جسے حکیم صاحب معرض وجود میں لانا چاہتے تھے۔حکیم صاحب نے اس کی تشکیل کی ذمہ داری راقم الحروف اور حکیم اعجاز احمد جذبی بریلوی مرحوم کے سپرد کر رکھی تھی۔طبّی کانفرنس سہارنپور کے صوبائی اجلاس منعقدہ نومبر ۱۹۶۴ء کے موقع پر اس کام کا آغاز ہونا تھا اس موقع پر پاکستان کے مشہور معالج اور طبّی مورخ جناب حکیم نیّر واسطی بھی تشریف لائے تھے جنہوں نے تکمیل الطب کالج سے رشتہ فرزندیت رکھنے کے باعث اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے قیام کی تجویز کی گرمجوشی کے ساتھ تائید کی تھی۔مگر کالج کے ہی ایک سینئر استاد حکیم مسیح الزماں ندوی مرحوم کے مخالفانہ رویہ کے باعث انجمن ابنائے قدیم کی تشکیل کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔حکیم عبدالحسیب صاحب مرحوم کی مداخلت پر اس وقت یہ طے پایا کہ آئندہ ابنائے قدیم کا اجتماع بڑے پیمانہ پر لکھنؤ میں بلایا جائے گا اور جمہوری انداز کے تمام تقاضوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس کام کو انجام دیا جائے گا۔تفریق اور انتشار سے بچنے کے لیے ہم لوگوں نے بھی اپنی طرف سے اس جانب کوئی پیش رفت نہ کرنے کا اظہار کرتے ہوئے حکیم عبدالحسیب صاحب مرحوم کی رائے سے اتفاق کر لیا تھا مگر سہارنپور میں جو کچھ طے ہوا تھا وہ صرف مسئلہ کو ٹالنے اور معرض التوا میں ڈالنے کی بات تھی۔اس سلسلے میں راقم الحروف اور حکیم مسیح الزماں صاحب کے درمیان خط و کتابت بھی جاری رہی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔راقم الحروف نے اس مقصد کی تکمیل کے لیے مشرقی اضلاع اور لکھنؤ کے اسفار بھی کیے جس کی رپورٹ مشرق [گورکھپور] کی اشاعت ۷ر فروری ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔اس سلسلہ میں شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی مرحوم کے دولت کدہ پر ایک اجتماع ہوا۔حکیم اعجاز احمد جذبی بریلی سے اور راقم الحروف دہلی سے لکھنؤ پہنچے دیگر ابنائے قدیم بھی آئے۔مگر چار باغ ریلوے اسٹیشن پر ہم لوگوں نے اپنے خلاف دیواروں پر مذمتی پوسٹر دیکھ کر اور جھوائی ٹولہ کی تنگ گلیوں میں ''مردہ باد'' کے نعروں کو سن کر یہ سمجھ لیا تھا کہ اب اس معاملہ میں زیرِ تعلیم طلباء کو بھی آلہ کار بنا لیا گیا ہے۔حاصل کلام یہ کہ اس میٹنگ سے بھی ابنائے قدیم کی تنظیم قائم ہونے کی جو تھوڑی بہت امید تھی وہ ختم ہو گئی بلکہ مخالفت میں مزید شدت کا پہلو نمایاں ہونے لگا۔حکیم مسیح الزماں مرحوم نے راقم الحروف کے نام اپنے خط میں جو چند مخصوص طنزیہ جملے استعمال کیے تھے اس کا ذکر صورت حال کو سمجھنے کے لیے کافی ہے وہ لکھتے ہیں:

''بہر حال اگر آپ کچھ پُر امید ہوں اور کالج و ادارہ کی بقاء کے لیے کچھ کر سکنے کا حوصلہ رکھتے ہوں تو ضرور میدان میں آجائیے۔لیکن یہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ شرط ''اوّل قدم آنست کہ مجنوں باشی'' اور مجنوں کے قالب میں ڈھل جانے کے بعد تو پھر ماوتو کا کوئی سوال نہ ہوگا دیکھئے اس سحرا [صحرا] میں کیسے کیسے بگولوں سے مقابلہ کرنا پڑا ہے شاید آبلہ پا کا تصور آپ کی کچھ رہبری کر سکے اور آپ ہی کے سر کالج کی فلاح و بہبود کا سہرا بندھے۔دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اپنی کریمی سے کوئی شکل پیدا فرماویں جو کالج کے تنِ بے روح میں ایک بار پھر حرارت پیدا کر دے۔آمین

دعا کا طالب

آپ کا: مسیح الزماں ندوی

حکیم شکیل احمد مرحوم نے اپنے خط میں کسی طبّی ادارہ میں کسی غیر حکیم کو سربراہ بنائے رکھنے کی جو بات کہی ہے اس سے خان بہادر اقبال علی ایڈوکیٹ کی طرف اشارہ ہے جو شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب کے سمدھی ہوتے تھے اور تکمیل الطب کالج کے سکریٹری تھے۔

حکیم بی این شرما کے پمفلٹ کا عنوان تھا ''شدھ کا تصور طب اور سائنس میں''۔اس مضمون میں ایلوپیتھی اور یونانی طب کے انضمام کی وکالت کی گئی تھی۔اس مضمون کو پڑھنے کے بعد شفاء الملک حکیم عبداللطیف مرحوم نے اپنی برہمی کا اظہار فرماتے ہوئے مجھے اس کا جواب دینے کا حکم فرمایا تھا۔راقم الحروف کی طرف سے اس مضمون کا جواب پندرہ روزہ 'مسیحا' بمبئی کی اشاعت یکم دسمبر ۱۹۶۴ء میں ''طب میں شدھ کا تصور اور اس کا پس منظر'' کے عنوان سے شائع ہوا۔حکیم بی۔این شرما اس وقت آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے جنرل سکریٹری تھے اور ان کی جانب سے طب یونانی کے بارے میں کسی ایسے موقف کی وکالت جو طبقہ اطباء کی اس جمہوری تنظیم کے اختیار کردہ مسلک کے خلاف ہو اس پر حکیم عبداللطیف فلسفی یا حکیم شکیل احمد شمسی کا معترض ہونا ایک فطری بات تھی۔

حکیم شکیل احمد شمسی کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔طب کے قدیم ذخائر پر عبور کامل حاصل تھا۔قدیم و جدید کے متصادم تصورات میں وہ غضب کی تطبیقی صلاحیت رکھتے تھے۔ان کے مطالعہ کی ہمہ گیری کا جو تاثر مجھ پر بحیثیت ایک شاگرد تھا وہ تو اپنی جگہ ایک حقیقت ہے بطور اظہار واقعہ ایک مثال تحریر ہے۔

شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی پرنسپل جامعہ طبیہ دہلی نے راقم الحروف کو ایک خط بالفاظ ذیل تحریر فرمایا۔

محبی حکیم سبحانی صاحب

''براہِ کرم تحقیق کر کے مطلع کیجئے کہ ''لَدُ ود'' کونسی دوا ہے ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلعم کو بخار آیا تھا اس میں یہ دوا ام المومنین حضرت میمونہؓ نے چٹائی تھی''۔

تحقیق کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ پاکستان میں حضرت عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''لمعات'' کا ترجمہ ہو رہا تھا اس کتاب میں کسی حدیث میں لفظ ''لَدُ ود'' کا ذکر آیا تھا اور مترجم کو اس کی تشریح بیان کرنی تھی انہوں نے اس کے لیے شفاء الملک مرحوم سے رابطہ قائم کیا تھا'' میں نے تقریباً تمام قابل حصول طبّی لغات کے اوراق چھان مارے تھے مگر مجھے کہیں بھی اس کی تشریح نہیں ملی۔ حسن اتفاق سے ان دنوں کسی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے ملک کے نامور اطبائے یونانی بلیماران کے طبّی کانفرنس کے دفتر میں جمع تھے۔ میں نے بشمول علامہ حکیم کبیرالدین متعدد اطباء سے اس اصطلاح کے بارے میں واقفیت چاہی مگر کسی کی طرف سے بھی جواب نہیں ملا۔ علامہ نے مشورہ دیا کہ اپنے استاذ سے پوچھو۔ حکیم شکیل مرحوم نے میرے استفسار پر فوراً فرمایا مشکوۃ شریف کے باب کتاب الطب اور اس پر حاشیہ مولانا عبدالحئ فرنگی محلی دیکھو، کتاب الطب کو دیکھنے پر معلوم ہوا کہ عرب ''لدود'' کے نام سے اس دواء سیال کو موسوم کرتے تھے جو ایک گوشہ دہن سے ڈال کر دوسرے گوشۂ دہن سے خارج کرادی جاتی تھی۔ اس طرح کے عمل میں بالعموم قسط شیرین جیسی دواء سیال شکل میں کام میں لائی جاتی تھی۔

استاذ مرحوم سے آخری ملاقات دہلی میں ستمبر کے اواخر میں ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے کناٹ پلیس کے ایک ہوٹل میں عشائیہ لیا اور ۱۷ر نومبر میں سری نگر میں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کی مجوزہ میٹنگ میں شرکت کا پروگرام بنایا۔ مگر حکیم صاحب اپنی علالت کے باعث اس میٹنگ میں شریک نہیں ہو سکے۔ اپنے آخری خط میں لکھتے ہیں۔

محترمی! سلام مسنون

پرسش احوال کا شکریہ۔ ابھی تک عمل جراحی سے تو بچ گیا ہوں اور بتدریج طبیعت بھی بہتر ہو رہی ہے خود اعتمادی بھی واپس آ رہی ہے۔ اُمید ہے چند یوم میں حسبِ عمر نارمل ہو جاؤں گا۔

اگر اس دوران دہلی کا کوئی کام وغیرہ پیدا ہوا تو آنے کی ہمت ہے۔ امید ہے جناب مع الخیر ہوں گے اور کشمیر کا سفر بخیریت گزرا ہوگا۔ والسلام

۲۸/۱۰/۸۵ شکیل

۱۲ر نومبر ۸۵ء کی شب میں تقریباً ۱۰ بجے سنٹرل کونسل برائے ریسرچ ان یونانی میڈیسن کے ڈائرکٹر جناب حکیم عبدالرزاق صاحب کا فون آیا۔ اطلاع تھی کہ ایک سانحہ انگیز خبر ہے۔ باوجود اصرار کے کچھ اور نہیں بتایا اور یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ انتظار کیجئے تھوڑی دیر بعد پھر فون کروں گا۔ آدھے گھنٹے کے بعد حکیم صاحب کا دوسری بار فون آیا اور یہ اندوہناک خبر سنائی کہ حکیم شکیل احمد شمسی آج دو بجے دن لکھنؤ میں ہم لوگوں کو داغ مفارقت دے کر عالم جاودانی کو کوچ کر گئے۔ اس سانحہ انگیز خبر کا دل و دماغ پر جو اثر ہوا اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں۔ رات کے ۱۱ بج چکے تھے۔ دوسرے دن دو بجے نماز جنازہ پڑھائی جانے والی تھی بڑی مشکل سے ہم دونوں کا صبح کے ہوائی جہاز سے لکھنؤ پہنچنے کا بندوبست ہوا اور استاذ مرحوم کے آخری دیدار اور ان کے جسد خاکی کو کاندھا دینے کا موقع نصیب ہوا۔ عیش باغ قبرستان میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔ جنازہ میں لکھنؤ و بیرون لکھنؤ کے علمی، ادبی، طبّی، سماجی اور سیاسی حلقوں کے سوگواروں کا ہجوم تھا ان کی وفات کے سوگ میں عبدالعزیز روڈ اور آس پاس کی دکانیں بند ہو گئیں۔ اخبارات نے ان کے انتقال کی خبر کو سیاہ سرخیوں سے شائع کیا، وفات کے وقت ان کی عمر ۷۳ سال کی تھی۔ مرحوم کی قلمی یادگاروں میں کتاب الولادت، طبّی کیمیاء، رسالہ حمیات اور بحران قابلِ ذکر یادگاریں ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں حج بیت اللہ کی سعادت سے بھی مشرف ہو چکے تھے۔ سفر حج مبارک کے تاثرات ''ارضِ حرم'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی وفات نہ صرف میرے لیے بلکہ پوری طبّی دنیا کے لیے ایک سانحہ عظیم ہے۔

غبارِ کارواں ہیں رفتہ رفتہ مٹتے جاتے ہیں
ہمیں رویا کرے گی شام غم کی تیرگی ساقی

[شکیل شمسی]

[مطبوعہ: حکیم شکیل احمد شمسی: شخصیت اور خدمات، مرتبہ: حکیم محمد عبدالرزاق، شائع کردہ، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۳۸-۱۵۰]

●●●

حنین ہندی ـــــ زبدۃ الحکماء علامہ حکیم محمد کبیر الدین

حکیم مظہر سبحان عثمانی

علامہ حکیم محمد کبیر الدین صاحب کا آبائی وطن صوبہ بہار ہے۔ بہار زمانہ قدیم سے علم وحکمت کا مرکز رہا ہے۔ نہ صرف علم وحکمت بلکہ اصول جہاں بانی اور شان حکمرانی میں بھی اس نے دنیا کو نئی سمت اور نئی راہ دکھلائی ہے۔ چندر گپت موریہ اور اشوک اعظم جیسے جلیل القدر فرمانرواؤں کا تعلق اسی سرزمین ہند سے تھا۔ بین الاقوامی اہمیت کی حامل نالندہ یونیورسٹی بھی یہیں پر ہوا کرتی تھی۔ بہار کا قدیم نام ''ویہار'' تھا جو کہ درس گاہ یا مدرسہ کا ہم معنی لفظ ہے۔ طبقات ناصری میں ہے۔

''ویہار بلغت ہندی اسم مدرسہ باشد''

چونکہ زمانہ قدیم میں اس خطہ ہند پر ویہاروں یعنی درس گاہوں کا ایک وسیع وعریض جال پھیلا ہوا تھا اس لیے یہ علاقہ اس نام سے موسوم ہوا۔ ویہار ہی کی بدلی ہوئی شکل بہار ہے۔

زبدۃ الحکماء علامہ حکیم محمد کبیر الدین اسی صوبہ بہار کے مشہور مقام شیخ پورہ ضلع مونگیر میں ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر مکمل کی۔ بعد ازاں لکھنؤ کے کیننگ کالج میں داخل ہوئے اس کے بعد کانپور تشریف لے گئے اور وہاں حضرت مولانا احمد حسن کانپوری کے زیر عاطفت ادب عربی، معقولات اور منقولات کے امتحانات امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کیے۔ عربی تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۰۹ء میں مدرسہ طبیہ دہلی میں داخل ہوئے اور حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں اور مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان کے زیر تلمذ رہ کر فن طب کی تکمیل کی۔ طبیہ کالج لاہور سے زبدۃ الحکماء کی سند بھی حاصل کی۔ مسیح الملک کی جوہر شناس آنکھوں نے علامہ کی علمی صلاحیتوں کو ان کی طالب علمی کے زمانہ ہی میں پہچان لیا تھا طبّی تعلیم کی فراغت کے بعد ۱۹۱۷ء میں وہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج دہلی میں پروفیسر مقرر کیے گئے اور تشریح منافع اعضاء اور علم الامراض کے مضامین ان کے سپرد درس کیے گئے۔ ۱۹۳۵ء تک وہ آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج سے منسلک رہے، اس کے بعد صدر الاطباء حکیم محمد الیاس خان کے اشتراک وتعاون سے جامعہ طبیہ کے نام سے ایک نئے کالج کی بنیاد ڈالی جو بہت جلد برصغیر ہند کا ایک ممتاز طبّی ادارہ بن گیا اب یہ ادارہ ہمدرد طبّی کالج کے نام سے ہمدرد یونیورسٹی کا ایک حصہ ہے۔ حکیم محمد کبیر الدین نے 'مسیح الملک' کے نام سے ایک طبّی محلّہ کا اجراء بھی کیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں حکیم صاحب نظام دکن کی دعوت پر حیدر آباد تشریف لے گئے اور نظامیہ طبیہ کالج حیدر آباد میں وائس پرنسپل مقرر کیے گئے۔ آپ نے بازار نور الامراء میں دفتر المسیح کے نام سے اپنا اشاعتی ادارہ بھی قائم کیا اور طبّی کتب کے تراجم وتالیف کے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ ۱۹۵۶ء میں آپ کو طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سریریات کا استاذ مقرر کیا گیا۔ اس کالج سے آپ کا تعلق ۱۹۶۰ء تک قائم رہا۔ کچھ دنوں تک ہمدرد دواخانہ کے شعبہ ترجمہ وتالیف کے مشیر کے طور پر بھی کام کیا۔ ۹/جنوری ۱۹۷۶ء کو حنین، جبیش اور قسطا کا یہ نقیب اپنی جان جان آفریں کو سپرد کر کے ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گیا۔ تدفین چمیلیان کے قبرستان میں کی گئی۔ الحاج حکیم عبدالحمید صاحب، چانسلر ہمدرد یونیورسٹی اور حکیم صاحب مرحوم کے ممتاز تلامذہ حکیم گردت سنگھ الگ پرنسپل جامعہ طبیہ دہلی اور حکیم سید اشتیاق احمد لکچرر، آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج وغیرہ وقت تدفین موجود تھے۔ اس راقم الحروف کو بھی طب یونانی کی اس مایہ ناز ہستی کے جنازہ کو کاندھا دینے کی سعادت حاصل ہوئی۔

قدیم وجدید نظریات طب کے تعلق سے علامہ کا تقابلی مطالعہ بہت ہی وسیع وعمیق تھا۔عربی، فارسی اور اردو لسانیات پر ان کو قدرت کاملہ حاصل تھی لاطینی زبان بھی جانتے تھے۔حکیم سید اشتیاق احمد لکچرر آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج کا بیان ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ایم اے کی ایک طالبہ، انگلش لٹریچر کی مشکلات سمجھنے کے لیے علامہ کے پاس آیا کرتی تھیں۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انگریزی ادب ولٹریچر پر ان کو کس قدر عبور حاصل تھا۔

علامہ کی طبّی خدمات:

اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ابھی تک علامہ کی طبّی خدمات کی اہمیت کا کما حقہ جائزہ نہیں لیا گیا۔بعض لوگ یہ کہہ کر کہ وہ چند یونانی کتب کے مترجم تھے ان کے علمی قد کو چھوٹا کرنے کی مکروہ کوششیں کرتے نظر آئیں گے مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر علامہ کی تخلیقی کاوشوں کو حذف کر دیا جائے تو یونانی طب کا اردو سرمایہ ادب تہی دامن ہو جائے گا۔کلیات، تشریح، منافع الاعضاء، علم الادویہ، صیدلہ، علم التکلیس، مرکبات، معالجات، جراحیات، علم الجراثیم، لغات طب، کونسا موضوع ہے جو علامہ کے رشحات قلم کا شرمندہ تالیف نہیں ہے۔ پروفیسر فلپ حتی نے اپنی مشہور کتاب ''ہسٹری آف عرب'' میں طب یونانی کے عرب مترجمین کی مساعی کی قدر و قیمت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

''تہذیبی تاریخ کے نقطہ نظر سے کسی قوم کی ذہنی ترقی میں تالیف وترجمہ، طبع زاد تصنیف سے کم لازمی نہیں۔ارسطو، جالینوس اور بطلیموس نے جو تحقیقات کی تھیں وہ اگر ناپید ہوگئی ہوتیں تو دنیا کا دامن علم ان کے کارناموں سے ایسا ہی خالی رہتا جیسے وہ کبھی وجود ہی میں نہیں آئی تھیں۔تاہم یہ واقعہ ہے کہ ترجمہ اور تالیف کے درمیان ہمیشہ واضح حد فاصل قائم نہیں کی گئی۔عرب مترجموں میں بہت سے مترجم ایسے بھی ہیں جنہوں نے ترجموں کے روپ میں دنیا کو طبع زاد تصانیف سے مالا مال کیا ہے۔[عرب اور اسلام، پروفیسر مبارز الدین]

علامہ نے یونانی طب کی قدیم کتابوں کا صرف ترجمہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس پر اپنی جودت فکر کی گہری چھاپ بھی چھوڑی ہے۔ بلاشبہ انہوں نے برصغیر ہند کے طبّی کارواں کی علمی قیادت کی ہے۔علامہ کی بعض تخلیقی کاوشیں نہ صرف طبع زاد ہیں بلکہ ہندوستان کے طبّی سرمایہ ادب کی آبرو کہے جانے کی مستحق ہیں۔

کتاب الاخلاط، کلیات الادویہ، افادۂ کبیر، ارمغان جیسی کتابیں اسی فہرست میں شامل ہیں۔افادۂ کبیر کے متعلق لکھنؤ اسکول کے مشہور طبّی دانشور حکیم حافظ جلیل احمد پرنسپل، طبیہ کالج، لاہور لکھتے ہیں:

''بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ تصنیف وتالیف کے عام معیار سے بہت بلند کتاب ہے۔محققانہ اور مجتہدانہ انداز پر تالیف کی گئی ہے اور صدیوں کے بعد تجدید طب کی پہلی کامیاب اور قابل قدر کوشش ہے''۔

علامہ کے علمی کام کی اہمیت، اس کی افادیت اور ضرورت کو سمجھنے کے لیے اس کو وقت کے صحیح تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔اس کے لیے علامہ کی کتاب ''کتاب الادویہ'' پر لکھے ان کے دیباچہ کی چند سطور یہاں نقل کر رہا ہوں:

''ہر زمانہ کی ایک اہم ضرورت اور ہر ضرورت کے ایفاء کے لیے ایک موزوں وقت ہوا کرتا ہے۔۱۹۱۰ء سے قبل ہی جو میری تعلیم کا زمانہ تھا۔علوم عربیہ کی کساد بازاری کا احساس ہونے لگا تھا اور علم طب کو عربی زبان میں حاصل کرنے والے طلباء کی تعداد روز بروز گھٹ رہی تھی۔وہ زمانہ گزر چکا تھا جب کہ ہندوستان میں فارسی زبان تقریباً مادری زبان کے برابر سمجھی جاتی تھی اور عربی زبان کا جاننا تعلیم یافتہ ہونے کے لیے ضروری شرط ہوتا تھا۔نبض شناسان زمانہ یہ تشخیص کر چکے تھے کہ اگر طب قدیم کو ہندوستان میں زندہ رکھنا اور ترقی دینا مقصود ہے تو اس کو اردو زبان میں منتقل کرنا ناگزیر ہے۔اسی طرح اگر طب جدید سے طلباء کو روشناس کرانا اور جدید ترین معلومات سے ان کو باخبر رکھنا پیش نظر ہے تو ملکی زبان میں اس کو ملبوس کیے بغیر یہ غرض وسیع پیمانہ پر حاصل ہونا قطعاً محال ہے۔اسی ضرورت کے لحاظ سے ہمارے استاذ معظم مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب مرحوم نے مدرسہ طبیہ دہلی میں طب کی تعلیم کے لیے عربی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی تعلیم دینے کا انتظام شروع فرمایا اور طب جدید کے بعض مضامین کی تعلیم بھی بذریعہ اردو زبان داخل نصاب ہوئی۔لیکن بڑی دشواری یہ تھی کہ اس وقت اردو زبان میں طب قدیم وطب جدید کی جو چند کتابیں موجود تھیں ان کی حیثیت محض تراجم کی تھی اور زبان وبیان کے لحاظ سے ان کا معیار اس قدر ادنیٰ تھا کہ طلبہ کے لیے ان کتابوں کا پڑھنا اور سمجھنا براہ راست اصل عربی اور انگریزی کتابوں کے پڑھنے اور سمجھنے سے کہیں زیادہ

دشوار اور غیر دلچسپ تھا۔ اس کے علاوہ ان کا طرز تدوین اور ان کی ترتیب مضامین بھی ایسی اجنبی تھی کہ ان کے پڑھنے اور پڑھانے سے تعلیم کی ترغیب کی بجائے طلباء کی طبیعتوں میں کراہت ونفرت پیدا ہوتی تھی۔ جب میں نے اپنا دور تعلیم ختم کر کے زندگی کے کسی مستقل میدان میں قدم رکھنے کا ارادہ کیا تو حضرت استاذ مسیح الملک مرحوم نے بکمال شفقت مجھے ایما فرمایا کہ میں کسی دوسرے طبّی شعبہ کو اختیار کرنے کی بجائے تالیف وترجمہ کی اہم خدمت میں اپنی زندگی کو مصروف کروں اور عہد حاضر کی ضرورت تعلیم و تعلم کے ایفاء میں مشغول ہو جاؤں جو حالات موجودہ کے لحاظ سے طب کی ایک بڑی خدمت تھی حضرت استاد مرحوم نے منشاء مبارک کو بتکرار ان الفاظ میں واضح فرمایا:

''دنیوی ثروت وکسب معاش کے لیے فن علاج کی طرف تو اکثر اہل فن راغب ہیں جس کی وجہ سے اچھے، معالجین کی معقول تعداد ملک میں موجود ہے اور بڑھتی رہے گی لیکن اچھے مولفین، مترجمین اور مدرسین کی تعداد تقریباً نفی کے برابر ہے جس کے صاف طور پر یہ معنی ہیں کہ ایک شیریں بار آور اور تنومند درخت کی جڑیں کھوکھلی ہو رہی ہیں اور انقلاب زمانہ کے تیز وتند جھونکے مستقبل قریب میں اس کو سرنگوں کر دیں گے''۔

اسی دیباچہ میں علامہ اپنی تالیفی مساعی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ ایک انفرادی کام نہ تھا بلکہ ایک جماعت کا کام تھا اور اس کے لیے ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ طب قدیم وطب جدید کے نظریات کا مقابلتاً مطالعہ، اختلافی مسائل میں منشاء اختلاف کا دریافت کرنا، وجوہ اختلاف کو قلمبند کر کے مسلک راجح ومرجوح قرار دے کر مسائل کی صحیح صورت متعین کرنا اور اس طرح ایک ایسا صحیح اور صاف نصاب طبّی دنیا کے سامنے پیش کرنا کوئی آسان کام نہ تھا جو آج علمی دنیا میں تنقید کی کسوٹی پر سچا اتر سکے اس کام کی نوعیت ترجمہ وتالیف بلکہ تصنیف سے بھی بالاتر تھی جس کے بغیر طب کی تجدید واحیاء اور چھ سات صدی کے طبّی جمود بلکہ طبّی موت کو حرکت وزندگی سے تبدیل کرنا ممکن نہ تھا''۔

مجلس تحقیقات:

طب یونانی کا اہل علم حلقہ جانتا ہے کہ مسیح الملک حکیم اجمل نے طب یونانی کی اصلاح وتدوین جدید کے لیے ''مجلس تحقیقات'' کے نام سے ایک علمی ادارہ قائم کیا تھا۔ ۲/جولائی ۱۹۲۲ء کو بمقام راجپورہ دہرہ دون اس مجلس تحقیقات کے افتتاح کے وقت حضرت مسیح الملک نے اپنے قلم مبارک سے صفحہ قرطاس کو ایک تاریخی عہد نامہ کی ترقیم سے زینت بخشی اور اس کو اپنے دستخط سے مزین فرما کر اپنے رفقاء کار سے بھی قبول عہد اور مدۃ العمر اس فنّی فریضہ سے عہدہ برآ ہونے کی سعی جاری رکھنے کے وعدہ پر دستخط ثبت کرائے۔

مسیح الملک کے ان رفقاء کار میں ایک نام علامہ حکیم محمد کبیر الدین کا بھی تھا۔ مسیح الملک کے سانحہ انتقال کے بعد مجلس تحقیقات کا شیرازہ بکھر گیا مگر منشاء استاد کی تکمیل کی تڑپ نے علامہ کو خود اپنی ذات میں ایک ''مجلس'' بنا دیا تھا وہ اپنی زندگی کے آخری چند برسوں کو چھوڑ کر جن میں کہ ضعف وعلالت نے انہیں صاحب فراش بنا دیا تھا تمام زندگی وہ مسیح الملک کے مشن پر گامزن رہے۔

میں نے علامہ کو پہلی بار ۱۹۵۹ء میں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ علی گڑھ کے موقع پر دیکھا تھا۔ اپریل ۱۹۶۴ء میں جب کہ میں جامعہ طبیہ دہلی میں سینئر لکچرر معالجات وانچارج شفاخانہ مقرر ہوا تو علامہ میں بذلہ سنجی اور ظرافت کا مادہ بھی تھا۔ ایک موقع پر میں نے پوچھ لیا مزاج کیسا ہے؟ فرمایا، میاں مزاج کہاں اب تو سوء مزاج ہے۔

وہ اپنی ذاتی زندگی میں سادہ صفت انسان تھے۔ نمود ونمائش سے بہت دور تھے جب بھی مجھے ان کے دولت کدہ پر حاضری کا موقع ملا ان کو کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول پایا۔ تلامذہ ان سے بہت محبت کرتے تھے وہ بہت سے نادار اور غریب طلباء کی خفیہ طور پر مالی مدد بھی کرتے تھے۔

[مطبوعہ: حکیم محمد کبیر الدین۔ حیات وکارنامے، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، ۵ پنچشیل شاپنگ سنٹر، نئی دہلی، جنوری ۱۹۹۵ء، صفحہ ۱۳-۱۷]

●●●

حکیم محمد عبدالرزاق — ایک مقناطیسی شخصیت

حکیم مظہر سبحان عثمانی

حکیم عبدالرزاق صاحب کا نام جب بھی سامنے آتا ہے یا کبھی تصور یا ان کا خاکہ ذہن میں آتا ہے تو مجھے ایک شعر یاد آتا ہے ۔

بہت ہیں جن کو تمنا ہے زندہ رہنے کی
مگر وہ کم ہیں جو سمجھیں کہ زندگی کیا

دراصل حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم کی ساری زندگی اور ان کی جدوجہد، ان کے کارنامے، ان کے شب و روز کا سفر، ان کا حضر ایک مسلسل رواں دواں زندگی کے مانند تھا۔ انہوں نے زندگی کے آخری لمحہ تک فن طب یونانی کی بقا اور ترویج کے لیے صرف کیا۔ دراصل ان کی پوری زندگی کا اگر جائزہ لیا جائے تو نہ صرف اس زندگی کا جو طالب علمی کے دور کے بعد کی زندگی ہے بلکہ اس زندگی کا جو دورانِ تعلیم ان کی زندگی تھی، تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ شروع ہی سے ایک کشمکش پسند طبیعت اور خصوصیات کے حامل تھے۔ آپ یاد کیجئے ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۱ء اور ۱۹۵۲ء کا زمانہ جب کہ ملک تقسیم ہوا تھا اس کا زخم ذہنوں میں تازہ تھا، تناؤ تھا، کشیدگی تھی اور آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج میں حکیم عبدالرزاق مرحوم اسٹوڈنٹ یونین کے الیکشن کے لیے کھڑے ہوئے جب کہ مسلم طلبا کی تعداد مشکل سے دس یا بارہ ہوگی، لیکن وہ اپنی سحر انگیز اور کشش آمیز شخصیت کی وجہ سے بہت بڑی اکثریت سے کامیاب ہوئے اور وہاں اپنے اثرات اور اثر انگیزی کا مظاہرہ کیا۔

حکیم عبدالرزاق سے میرا تعلق تقریباً تیس سال سے رہا ہے۔ دہلی میں رہتے ہوئے، دہلی سے باہر مختلف سفروں میں ساتھ رہا ہے۔ یونانی ریسرچ کونسل کی سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی جس کا میں ممبر رہا ہوں، ان کے ساتھ کام کرنے کا اور ان کو سمجھنے کا کافی موقع ملا ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم ان کے وطن حیدرآباد میں ہوئی وہاں سے انہوں نے میٹریکولیشن کیا، اس کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا، آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج سے انہوں نے طبّی فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد بہت دنوں تک تقریباً ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۵ء تک وہ ہمدرد دواخانہ سے وابستہ رہے اور ان کو حکیم عبدالحمید صاحب قبلہ کی سرپرستی میں کام کرنے کا موقع ملا اور مجھے یاد ہے کہ اکثر مواقع پر وہ حکیم صاحب کے فیضان کا ذکر کیا کرتے تھے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ ان میں وہ کام کرنے کی لگن اور تڑپ تھی۔ حکیم صاحب سے ان کو کافی فیض ملا جس کا وہ کئی واقعات کا ذکر کر کے حوالہ دیتے رہے۔ حکیم عبدالرزاق صاحب نے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان سے باہر مختلف ممالک میں طب یونانی کی نمائندگی کرتے ہوئے طب یونانی کی خصوصیت اور طب یونانی کی افادیت لوگوں سے منوائی، وہ مقامات، وہ ممالک جو کبھی طب یونانی کے گہوارہ ہوا کرتے تھے، مثلاً عرب ممالک کا انہوں نے دورہ کیا۔ عالمی ادارۂ صحت کے نمائندہ کی حیثیت سے وہ وہاں گئے۔

مختلف عرب ممالک کے سلاطین سے، وہاں کے وزراء صحت سے ان کی ملاقاتیں رہیں، بحث و مباحثہ رہا اور انہیں وہ قائل کر گئے کہ دراصل یہ آپ کا داعیہ تھا، آپ کا فرض تھا کہ آپ اس فن کو زندہ کرتے، مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۷ء میں کویت کے وزیر صحت شیخ عبدالرحمٰن العوضی صاحب آئے تھے۔ یہاں ہندوستان میں ان کو وہ لے کر طبیہ کالج بھی آئے، ہمدرد بھی لے گئے، آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز بھی لے گئے اور انہوں نے ان کے ذہن میں یہ بٹھایا کہ طب یونانی ایک ایسا فن ہے جس کا زیادہ فرض آپ پر لاحق ہوتا ہے کہ اسے آپ اپنے ملک میں زندہ کریں۔ اسی کا ایک نتیجہ ہے کہ کویت میں آج سے دس بارہ سال پہلے طب یونانی پر ریسرچ کا ایک مرکز قائم ہوا اور صرف یہی نہیں بلکہ حکیم عبدالرزاق صاحب کی کوششوں سے دوسرے عرب ممالک میں بھی طب یونانی پر کام کرنے کا ایک رجحان پیدا ہوا۔ اس سلسلہ میں سعودی عربیہ کی جامعات میں جڑی بوٹیوں پر کام کا سلسلہ جاری ہوا۔ بغداد میں بھی طب یونانی کے مطالعہ کا ایک سنٹر

قائم ہوا۔ ابوظہبی میں بھی اس سلسلہ میں وہ کامیاب رہے یہاں تک کہ جب وہ عمرہ کر کے واپس آ رہے تھے آج سے تقریباً ایک سال پہلے ۱۸ اپریل کو، اس وقت بھی وہ وہاں کے ارباب حکومت سے ایک ملاقات ہو چکے تھے، اور دوسری ملاقات، دوسری نشست طب یونانی کی افادیت کے بارے میں، ان کے ملک میں ان کے قیام کے بارے میں وقت طے ہو چکا تھا۔ افسوس وہ نہ ہو سکی، اس سے پہلے وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

حکیم عبدالرزاق کی شخصیت کا سب سے بھرپور مظاہرہ ہندوستان کے اندر طب یونانی کے فروغ اور اس کی ترقی کے سلسلے میں ملتا ہے۔ انہوں نے نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن بنگلور کے لیے اپنی کوششوں سے تقریباً 150 ایکڑ اراضی حاصل کر لی۔ انہوں نے کشمیر میں حضرت بل کے سامنے کشمیر یونیورسٹی سے بالکل ملا ہوا قطعہ اراضی حاصل کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں یاد کریں گے وہ حضرات جو علی گڑھ میں حکیم عبدالرزاق اور حکیم عبدالحمید صاحب اور اس وقت راقم خود بھی شامل تھا۔ ان کے ساتھ سید حامد صاحب کے پاس حاضر ہوئے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قطعہ اراضی جو بہت بڑا تھا، سی سی آر یو ایم کے لیے انہوں نے حاصل کیا۔ دراصل ان کی یہ فکر رساتھی اور گفتگو کی جو طرز ادا تھی وہ بالکل نرالی اور انوکھی طرز ادا تھی۔ بڑے بڑے وزراء، فقراء، بڑے بڑے حکام جو فائلوں کو آگے بڑھانے میں اڑچنیں پیدا کرتے تھے اور ایک مرتبہ جب حکیم عبدالرزاق سے گفتگو ہو جایا کرتی تھی وہ بالکل ان کے سامنے سرخمیدہ ہو جایا کرتے تھے اور ان کی بات کو انکار کرنے کی ان میں ہمت نہیں ہوتی تھی، یہ مجھے یاد ہے۔ ایک دفعہ لارڈ ہارڈنگ نے حکیم اجمل خاں کو میگنیٹ آف انڈیا کہا تھا لیکن میں کہتا ہوں کہ دور حاضر میں حکیم عبدالرزاق ایک مقناطیسی شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے اندر ایک بے پناہ کشش تھی۔ ایک ایسا اثر تھا، ان کی بات میں، ان کی گفتگو میں جو مخاطب ہوا کرتا تھا ان کی بات کو مان لیا کرتا تھا۔

انہوں نے اطباء کو جو بہت سے طبیب حضرات دیہاتی علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں، گاؤں میں رہتے ہیں سادگی کی زندگی گزارتے ہیں، وہ نہیں جانتے تھے کہ تاج پیلس کیا ہوتا ہے، وہ نہیں جانتے تھے کہ راشٹر پتی بھون کیا ہوتا ہے، کیسے نقش و نگار ہیں، وہ نہیں جانتے تھے کہ حیدرآباد کے راج بھون میں کس طرح کی زندگی ہے۔ وہ حکیم عبدالرزاق اطباء کا ایک ہجوم لیے ہوئے کبھی راشٹر پتی بھون میں موجود ہیں اور گیانی ذیل سنگھ سے ان کی پذیرائی کرا رہے ہیں کبھی راج بھون حیدرآباد میں وہ کمد بین جوشی سے ان کی ضیافت کروا رہے ہیں، کبھی راج بھون دہلی میں ان کی ضیافت کرا رہے ہیں، حکیم عبدالرزاق نے اطباء کے وقار ان کی عزت نفس کا جتنا خیال رکھا میں سمجھتا ہوں کہ کم ہی لوگ ہوں گے جو اس بات کے بارے میں ان کی برابری اور ہم پلہ ہونے کا دعوی کر سکتے ہیں۔ حکیم عبدالرزاق نے نہ صرف یہ کیا بلکہ اطباء کے پے اسکیل کے بارے میں، ان کے یو جی سی گریڈ دینے کے بارے میں، خود طبّی کالج گواہ ہیں، اس معاملے میں انہوں نے یو جی سی اسکیل دلوانے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ دوسرے تمام اداروں میں جو طلبہ کے پے اسکیل تھے۔ اس میں اضافہ کرنے میں اور ماڈرن، ایلوپیتھی کے لوگوں کے برابر پے اسکیل دلانے میں انتہائی محنت کی اور اس میں وہ کامیاب رہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں انہوں نے یونیورسٹی میں پوسٹ گریجویٹ کورس میں، اس کو کھولنے میں اس کو جاری کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ حکیم عبدالرزاق سی سی آر یو ایم کے ڈائرکٹر ہونے سے پہلے وزارت صحت میں ایس آر او کی پوسٹ پر فائز ہوئے تھے، اس کے بعد ڈپٹی ایڈوائزر بنے اس کے بعد سنٹرل ریسرچ کونسل کے بانی اور اس کے ڈائرکٹر بنے اور اس ادارے کے تحت اور اس تنظیم کے تحت سارے ملک میں یونانی کی تنظیم و ترویج، ترقی اور تحقیق کا ایک ایسا لمبا جال بچھایا جسے ہم دیکھ کر یاد کرتے ہیں جو ایک زمانہ کا کام تھا اسے ایک مختصر مدت میں حکیم عبدالرزاق نے اس کو انجام دیا۔ میں صرف یہ کہوں گا کہ حکیم عبدالرزاق کے کارناموں کے متعلق جو ریسرچ کونسل کے توسط سے انہوں نے انجام دیا اس کے بارے میں پروفیسر رنجیت رائے چودھری صاحب نے بڑی وضاحت کے ساتھ ذکر کر دیا ہے۔ ان کی دیگر تفصیلات میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے یہ بڑی قابل ستائش بات ہے کہ ان کے صاحبزادے جناب سہیل صاحب نے ان کی یاد میں ایک میموریل فاؤنڈیشن کا قیام کیا اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس موقع پر میں ان کو اور مسز ام الفضل کو مبارکباد دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس پلیٹ فارم سے، اس تنظیم سے حکیم صاحب کی خدمات کا اعادہ کیا جاتا رہے گا اور ہم سب لوگوں کو اس سے فیض حاصل ہوتا رہے گا، ایک ولولہ، ایک حوصلہ ملتا رہے گا۔ اسی کے ساتھ شکریہ

[مطبوعہ: پروسیڈنگ آف دی فرسٹ حکیم محمد عبدالرزاق میموریل لیکچر، ۹ اپریل ۱۹۹۳ء آن ریلیونس آف دی یونانی سسٹم آف میڈیسن ان ماڈرن ٹائمز از ڈاکٹر ایس، زیڈ، قاسم، ناشر: حکیم محمد عبدالرزاق فاؤنڈیشن، نئی دہلی]

●●●

یونانی طِب میں استفراغ وتنقیہ کی اہمیت

حکیم مظہر سبحان عثمانی

طب یونانی میں تمام مزاجی امراض کا علاج مندرجہ ذیل دوطریقوں پر کیا جاتا ہے:

۱- تعدیل وتبدیل مزاج

۲- تنقیہ واستفراغ مادہ

پہلا طریقہ سوءمزاج سادہ میں برتا جاتا ہے یعنی اس وقت جب کہ کسی خلطی اور رطوبی شرکت کے بغیر محض خارجی ماحول، اثرات موسم، ماکول ومشروب وغیرہ کے تحت عضو کا مزاج طبعی متغیر ہوجاتا ہے اس صورت میں اخراج مادہ کے بغیر صرف معدلات کے ذریعہ مزاج عضو کو اعتدال پر لایا جاتا ہے۔ خواہ سوءمزاج مادی کمّی ہو یا سوءمزاج مادی کیفی استحالاتی تغیرات کے نقص کے سبب اخلاط کے قدر طبعی میں بگاڑ پیدا ہوجانا سوءمزاج مادی کمی ہے اور اجسام خبیثہ وحیوانات غریبہ کی سرایت کاری یا کسی اور سبب سے رطوبات بدنی میں فساد لاحق ہوجانا، سوءمزاج مادی کیفی ہے۔ فصد، قی، اسہال ادرار، تعریق وغیرہ وہ استفراغی اعمال ہیں جن کے ذریعے اعضاء بدن سے مواد مرض کا تنقیہ وصفائی کا کام انجام پاتا ہے۔

فضلات بدن اور مواد مرض:

عمل تنفس نیز ماکول ومشروب کی صورت میں جو مواد بدن میں پہنچتے رہتے ہیں اور اعضاء کے اندر جو رطوبات موجود ہوتی ہیں ان میں استحالات اور تغیرات کا ایک سلسلہ ہر وقت جاری وساری رہتا ہے اسی سلسلہ تغیرات کو اطبا نے بلحاظ مدارج ہضم، طبخ اور نضج وغیرہ کا نام دیا ہے جو آلات انہضام کے ساتھ ساتھ عروق اور اعضا کے ساتھ بھی انجام پاتا رہتا ہے۔ ہضم معدی، ہضم کبدی، ہضم عروقی اور ہضم عضوی کی اصطلاحات انہیں تغیراتی مراحل کو واضح کرتی ہے۔ ان مراحل کی تکمیل سے ایک طرف اعضاء کا تغذیہ ہوتا ہے تو دوسری طرف انواع واقسام کے فضلات بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مملکت بدن کی امارت اور سلطانی کے لیے قدرت نے بدن کے اندر ہی ایک مخفی قوت بھی ودیعت کر رکھی ہے جسے اصطلاح میں ''طبیعت مدبرہ بدن'' کہا گیا ہے۔ چنانچہ فضلات بدن کے اخراج کا عمل اس قدرتی قوت کے زیرِ تدبیر خود بخود انجام پاتا رہتا ہے۔ اسی کو اطباء نے استفراغ طبعی کے نام سے بیان کیا ہے۔

جب کبھی طبعی استفراغات کے عمل میں کسی قسم کا خلل واقع ہوجاتا ہے تو بدن انسانی طرح طرح کے امراض وآفات سے دوچار ہوجاتا ہے۔ طبیب کا دائرہ کار محض اس قدرتی قوت کی مدد کرنا ہے۔ چنانچہ جب طبعی استفراغات میں خلل پیدا ہوتا ہے تو طبیب تدابیر یا ادویات کے ذریعہ اس امر میں طبیعت کی مدد کرتا ہے جسے اصطلاحاً ''استفراغ صناعی'' کہا گیا ہے۔

جدید میڈیکل سائنس بھی اس سچائی کو تسلیم کرچکی ہے کہ جسم کے اندر بعض آلات [مثلاً اقراص دم وغدد بدنیہ] ''خاکروب بدن'' کا کام انجام دیتے ہیں یعنی وہ مخفی طور پر اجسام خبیثہ اور رطوبات فاسدہ کو ہضم وتحلیل کرکے بدن کا تنقیہ کرتے ہیں اس طرح ''مادہ مرض'' کے مفہوم کو بھی طب مغرب کسی نہ کسی شکل میں تسلیم کرتی ہے۔ کولسٹرول [شحمی مادہ دم] کو قلبی عروقی امراض میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ وعلیٰ ہذا یوریا اور یورک ایسڈ جیسے فاسد مواد بدنی کا اعتراف طب مغرب میں کیا گیا

ہے۔لیکن چونکہ اس کے نظریہ علاج کے بنیادی اصولوں میں استفراغ اور تنقیہ کے تصور کو کوئی درجہ نہیں دیا گیا ہے۔اس لیے وہ ان امراض میں صرف غذائی احتیاط اور علاقائی علاج پر انحصار کرنے پر مجبور ہے۔

جراثیم اور مادہ مرض:

''جراثیم اور مادہ مرض کے نظریات میں کوئی تضاد نہیں ہے'' بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جراثیم کی دریافت نے طب قدیم کے ''نظریہ مادہ مرض'' کی تشریح کو اور بھی آسان اور قابل فہم بنا دیا ہے، یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ حدوث امراض میں جراثیم کا بلا واسطہ کوئی رول نہیں ہے، بلکہ جراثیم کی سمیت کاری کے لیے بدن میں موافقِ عمل ماحول اور قابل کاشت مزرع[Culture Media] کا ہونا ضروری ہے فضلات اور فاسد رطوبات کا اجتماع جراثیمی سمیت[Toxins] کی حامل بن کر مرضی کیفیات کو جنم دیتی ہیں۔تنقیہ اور استفراغ کا مقصد دراصل بدن کے استحالاتی اور تغیراتی اعمال کو تیز کرنا ہوتا ہے تاکہ طبیعت نضج اور دفع مواد پر پوری طرح قادر ہو جائے۔

تنقیہ بدن کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ بدن کے آلات نافضہ [فضلات کو دفع کرنے والے اعضاء] کی قوت دفع کے فعل میں تحریک پیدا کر کے مواد کو خارج کیا جائے دوسری صورت وہ ہوتی ہیں جس میں اعضاء کے فعل طبعی میں تحریک نہیں پہنچائی جاتی بلکہ اعضاء کو کاٹ کر اور شگاف دے کر موذی اور فاسد مواد کو بہا دیا جاتا ہے،اسہال، ادرار،تعریق پہلی صورت کی مثالیں ہیں اور فصد، بزل اور جراحت کاری کے ذریعہ دموی، آبلی اور صدیدی مواد کو خارج کر دینا دوسری صورت کے استفراغ اعمال ہیں۔

استفراغی کے قوانین کلی:

واضح ہو کہ استفراغ ردایت وعدم ردایت کے چند اصول اور مقاصد ہوتے ہیں، بدن میں مادہ کا امتلاء وخلل مزاج، سن، عمر، پیشہ، ملک، موسم، عادات و معمولات کی مناسبت یا عدم مناسبت کے ساتھ قوت اور ضعف کو بھی پیشِ نظر رکھ کر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ استفراغ کرنا چاہیے یا نہیں! وعلیٰ ہذا استفراغ کے وقت مواد کے اخراج کا میلان اور اس عضو کی مشارکت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جس عضو سے یہ مواد خارج ہو سکتے ہیں۔امراض کبد میں امتلاء صفرا کی صورت میں مدرات صفرا دے کر اثنا عشری میں گرانا نیز یرقان کی حالت میں صفرائے عروق کو گردے ومثانہ کی راہ سے مدر بول ادویہ دے کر خارج کرنا اسی اصول کے مطابق ہے۔یہ بھی ضروری ہے کہ وہ عضو جسے بطور مخرج مواد منتخب کیا گیا ہو وہ اس عضو سے جس سے مادہ کا اخراج کرنا مقصود ہو شرافت اور نزاکت میں کم درجہ رکھتا ہو نیز استفراغ میں یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ جس عضو کی راہ مادہ کا اخراج کیا جائے وہ اس کا طبعی مخرج بھی ہو۔وقت استفراغ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مادہ مرض میں اخراج کی مطلوبہ خاصیت [نضج] پیدا ہو چکی ہے یا نہیں! ایسا امراض مزمنہ کی ہر حالت میں اور امراض مادہ کے جوش ہیجان اور سمیت کے باعث انتظار نضج میں خطرات کا اندیشہ ہو پیش نظر رکھنا ضروری ہوا کرتا ہے۔ملحوظات استفراغ میں اس امر کی بھی اہمیت ہے کہ مادہ بقدر ضرورت اور قوت ہی نکالا جائے۔

استفراغی اعمال:

اگر چہ ریاضت دلک اور حمام گرم جیسے اعمال بھی [جن میں حرارت بدنیہ بڑھ جاتی ہے اور قوتِ مغیرہ بیدار ہو جاتی ہے] استفراغی مقاصد کے حصول کا ذریعہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔لیکن اسہال، ادرار، قی، فصد، تعریق، تعلیق اور حجامت استفراغی عملیات کی خاص صورتیں ہیں جن کے ذریعہ بدن کے فضلات اور فاسد مواد کو خارج کیا جاتا ہے۔

اسہال:

جب صرف امعاء اور قرب امعاء کے مواد خارج کیے جاتے ہیں تو اسے اصطلاح میں تلئین کہا جاتا ہے اور جب عروق اور اعضاء بعید کے مواد خارج کیے جاتے ہیں تو اسے اسہال کہا جاتا ہے کبھی بلا تخصیص دونوں صورتوں کے لیے اسہال کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

عمل اسہال سے بالواسطہ دو طرح کے فوائد حاصل کیے جاتے ہیں فاسد اور سمی رطوبات کا اخراج ایک ایسا فائدہ ہے جو اسہال میں براہِ راست حاصل ہوتا ہے اور اس استفراغ اور تنقیہ مواد کے بعد نتیجتاً قویٰ غاذیہ ومغیرہ میں جو تیزی وفعالی آتی ہے وہ ''فائدہ بالواسطہ'' کی حیثیت رکھتی ہے۔

موادِ اسہالی:

مسہلات کے ذریعہ جو مواد اخراج پاتے ہیں وہ مندرجہ ذیل اقسام کے ہوتے ہیں:

۱- فضلات اور معدہ کے اجزاء غیر منہضم جو آنتوں سے معدہ میں پہنچتے ہیں۔

۲- دورانِ انہضام آنتوں کے اندر تعفن اور تخمیر کے طور پر تولید پانے والے سمی وغیر سمی مواد جو خون میں جذب ہو کر تمام اعضاء کو متاثر کرتے ہیں اور مختلف عوارضات پیدا کرتے ہیں مثلاً صداع، سدر و دوار، اختلاج قلب وغیرہ۔

۳- وہ رطوبات جو آنتوں کی غشاء مخاطی اور غدد سے ہمہ وقت رستی رہتی ہیں۔

۴- مائیت اور فضلات دم مثلاً مادۃ البول، حامض بولی وغیرہ۔

۵- جگر اور مرارہ سے مترشح ہونے والا صفرا۔

۶- رطوبت بانقراسیہ۔

مسہل کے اغراض:

۱- اخراج مائیت، مثلاً استسقاء ذقی لحمی وغیرہ۔

۲- اخراج بلغم مثلاً نزلہ، عوارضات راس و اعصاب وغیرہ۔

۳- اخراج صفرا مثلاً یرقان

۴- تصفیہ خون مثلاً امراض جلدیہ، حمیات، نقرس، وجع مفاصل وغیرہ

۵- تقلیل حرارت مثلاً حمیات میں

۶- امالہ و جذب مواد مثلاً امتلاء دم دماغی، سکتہ، سرسام

استفراغ بذریعہ قی:

قی کے ذریعہ اگرچہ براہ راست تنقیہ معدہ اور قرب معدہ کا ہوتا ہے مگر اس کے چند فوائد بعید بھی ہوتے ہیں جو اخراج مادہ کے نتیجے میں حاصل ہوتے ہیں تسمم غذائی یا زہر خوری کی حالت میں معدہ کی صفائی، حلق اور مری کے مجاری میں اٹکی ہوئی کسی جنس غریب کا اخراج یا جوف معدہ کی حاد یا لزج وغلظ [جس کی وجہ سے تخمہ اور فساد ہضم جیسی بیماریاں پیدا ہوتی رہتی ہیں] کا نکالنا قی کے فوائد قریبہ کے طور پر شمار کیے جاتے ہیں اور انتصاب النفس یا قصبۃ الریہ میں اجتماع بلغم کی صورت میں قی کرانے سے جو مفید نتائج نکلتے ہیں انہیں فوائد بعید سمجھنا چاہیے وعلیٰ ہذا تکدر بصارت و امتلاء راس، قروحِ مثانہ وکلیہ، یرقان، صداع سددی، امراض بلغمی عصبی، مالیخولیا مراقی، استسقاء، نقرس، عرق النساء وغیرہ امراض میں قی سے بیش بہا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

استفراغ بذریعہ جلد:

معرقات کے ذریعہ غدد جلدیہ کے فعل کو بڑھا کر پسینہ کی شکل میں فضلات بدن کا اخراج استفراغ بذریعہ جلد ہے۔ جلد کے اندر دو قسم کی گلٹیاں ہوتی ہیں:

۱- غدد عرقیہ

۲- غدد شحمیہ

جب خون جلد میں پہنچتا ہے تو کچھ گلٹیاں خون کے حصۂ مائی کو جذب کر کے بصورت پسینہ جلد سے باہر نکالتی ہیں انہیں غدد عرقیہ کہا جاتا ہے اور کچھ گلٹیاں خون کے روغنی اور شحمی حصہ کو چھانٹ کر خون سے جُدا کر کے جلد کی راہ باہر نکالتی ہیں۔ انہیں غدد دہنیہ یا غدد شحمیہ کہا جاتا ہے خون کے یہ روغنی اجزا مائیت جلدیہ کے ساتھ مخلوط ہوا کرتے ہیں۔ پسینہ میں جلد کے دوسرے مواد رطوبات بھی ملے ہوئے ہوتے ہیں مثلاً مواد بولیہ وغیرہ۔

[مطبوعہ: سالانہ میگزین ۸۸-۱۹۸۷ء، آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج، قرول باغ، نئی دہلی، ص ۱۴-۱۶، ۳۳]

●●●

اطبائے قدیم کے سہل الاستعمال مجربات

حکیم مظہر سبحان عثمانی

۱- **مرزنجوش** کا سونگھنا دردسر میں جس کا سبب ریح غلیظ ہو بہت مفید ہے۔ [علی ابن عباس مجوسی، شیخ الرئیس بوعلی سینا، علامہ ابن ہبل]

۲- **کندر دماغ** کو رطوبات بلغمیہ سے پاک کرتی ہے اور قوت حفظ میں زیادتی پیدا کرتی ہے۔ [علامہ انطاکی]

۳- **فندق ہندی** [ریٹھہ] کا عطوس [نسوار] لقوہ کے مجربات میں سے ہے۔ [شیخ الرئیس]

۴- **عطاش** میں بچے کی یا فوخ [چندیا] پر بنفشہ پانی میں پیس کر برف سے ٹھنڈا کر کے رکھنا بہت ہی مفید ہے۔ [شیخ الرئیس]

۵- **سرد پانی** میں غوطہ لگا کر دیر تک آنکھیں کھولے رکھنا مقوی بصارت اور مزید نظر ہے۔ [صاحب کامل الصناعہ]

۶- شعر زائد اور شعر منقلب [پڑبال] میں بال اکھاڑ کر **نوشادر کو پتہ بڑ** میں ملا کر استعمال کرنا مفید ہے۔ [علامہ سویدی]

۷- **چقندر** کے ساتھ خردل کا استعمال شب کوری کو نفع عجیب بخشتا ہے۔ [علامہ رازی، جالینوس، علامہ سویدی]

۸- **برگ سداب** بستانی کو آب برگ انار میں گھس کر لگانا غرب [ناسور چشم] کو مندمل کرتا ہے۔ [علامہ طبری صاحب فردوس الحکمت۔ شیخ الرئیس بوعلی سینا]

۹- **شلجم** کا مداومت کے ساتھ کھانا بہت زیادہ مقوی بصر ہے۔ [صاحب غنی منی، شیخ الرئیس بوعلی سینا]

۱۰- **اگر چکی کا پتھر** گرم کر کے اس پر سرکہ ڈالا جائے اور اس کی بھاپ کان میں لی جائے تو بطلان سماعت اور نقصان سماعت کے لیے بہت مفید ہے۔
[زکریا رازی، ابن سینا، علامہ سویدی]

۱۱- **جنگلی تلسی** کے سبز پتوں کا پانی ناک میں قطور کرنے سے بالخاصیت رعاف [نکسیر] کو فائدہ دیتا ہے۔ [سمرقندی، صاحب اسباب وعلامات]

۱۲- **خردل** کثرت کے ساتھ کھانا ثقل زبان کے لیے نافع ہے۔ [ابن سینا، علامہ سویدی]

۱۳- **نمک** اور شہد کا زبان پر ملنا جلد بولنے میں بچہ کی اعانت کرتا ہے۔ [علامہ مجوسی صاحب کامل الصناعہ، علامہ سویدی]

۱۴- **سرکہ اور نمک** کا استعمال داڑھ کے درد کے لیے بہت ہی مفید ہے۔ [صاحب کامل الصناعہ، علامہ سویدی، علامہ رازی]

۱۶- **تغیر لون اسنان** [دانتوں کے رنگ کا متغیر ہو جانا] میں **خاکستر انجیر** کو روغن زیتون میں ملا کر لگانا دانتوں کو سفید کرنے کے لیے بے مثال دوا ہے۔ [علامہ انطاکی]

۱۷- **جوشاندہ برگ پودینہ** اور انجیر مرض انتصاب النفس بالخصوص سینہ کی خلط لزج وغلیظ کو خارج کرنے کے لیے بہت مفید ہے۔ [شیخ الرئیس]

۱۸- **گندھک** مسفوف کو زردی بیضہ مرغ نیمبرشت میں ملا کر کھانا سعال بارد میں غایت درجہ نفع بخش ہے۔ [شیخ الرئیس]

۱۹- **قرنفل** قلب کے امراض باردہ اور طباشیر قلب کے امراض حارہ کے لیے عجیب النفع دوا ہے۔ [جالینوس، رازی، ابن سینا]

۲۰- جوشاندہ **افسنتین** سے زیادہ نفع بخش کوئی دوسری دوا معدہ کے امراض صفراوی کے لیے نہیں ہے۔ [زکریا رازی]

۲۱- **گلاب خالص**، قرنفل اور بسباسہ کا مطبوخ درد معدہ بارد اور درد معدہ ریحی کے مریض کو پلانا مجرب ہے۔[صاحب کامل الصناعہ]

۲۲- **جو درد معدہ** کھانا کھانے کے بعد پیدا ہوتا ہے اور بغیر قے کے سکون پذیر نہیں ہوتا، اس میں روزانہ کھانے سے پہلے شہد کا استعمال بہت مفید ہے۔[ابن سینا]

۲۳- **اگر زیرہ کو تیز** سرکہ میں ایک رات و دن بھگو کر خشک کر کے بریاں کر کے کھلائیں تو مرض وحم کو ختم کر دیتا ہے۔[امام سویدی]

۲۴- **قرنفل اور کشنیز** خشک کا سفوف باہم ملا کر کھانے سے جشاء[ڈکار] میں خاص فائدہ ہوتا ہے۔[علامہ انطاکی]

۲۵- **نمک** اور صعتر فارسی سائیدی لیموں پر چھڑک کر چوسنا متلی کو زائل کر دیتا ہے۔[امام سویدی]

۲۶- **کندر** بقدر مناسب استعمال کرنا اور اس پر گرم پانی گھونٹ گھونٹ پینا فواق[ہچکی] بالخصوص فواق ریحی کے لیے مجرب ہے۔[علامہ ابن ہبل]

۲۷- **پوست نارنج** مروڑ متلی اور قے کو روکنے کے لیے غایت درجہ مفید ہے۔[علامہ انطاکی]

۲۸- **کشوث، ریوند چینی اور افسنتین** سدہ جگر کو کھولنے کے لیے لاجواب دوائیں ہیں۔[ابن سینا]

۲۹- **ریوند چینی** درد جگر مزمن کے لیے بہت ہی مفید دوا ہے۔[امام سویدی]

۳۰- **یرقان سدی** کے ساتھ اگر بخار بھی ہو تو بتھوا ایک عمدہ دوا ہے۔[ابن سینا]

۳۱- **بکری یا گائے** کے دودھ میں پتھر کا ایک صاف ٹکڑا یہاں تک ابالیں کہ دودھ ایک تہائی رہ جائے۔ پھر اسے ٹھنڈا کر کے پلائیں اسہال مزمن کو بہت ہی نافع ہے۔[ابن سینا، علامہ ربن طبری]

۳۲- **ثمر توت خام** خشک کردہ قروح امعا اور سحج کے لیے لاثانی دوا ہے۔[صاحب غنی منی]

۳۳- سحج صفراوی کے لیے **گائے کی چھاچھ** عجیب النفع چیز ہے۔[علامہ ابن ہبل]

۳۴- **خبث الحدید** کو ایک ہفتہ سرکہ میں بھگو کر نکالیں اور کڑاہی میں ڈال کر بھونیں پھر مثل غبار پیس کر بقدر مناسب اطریفل صغیر میں ملا کر کھائیں۔ خون بواسیر کو بند کرنے کے لیے مجرب ہے۔[ابن سینا]

۳۵- **مویز منقی** میں فلفل سیاہ بھر کر کھانا برودت۔ حصاۃ گردہ اور تقطیر بول کو نافع ہے۔[علامہ انطاکی]

۳۶- **تخم خطمی، خاکسترانجیر** ہم وزن سرکہ میں پیس کر ضماداً ورم انثین[ورم خصیہ] کے لیے بہت ہی نافع ہے۔[علامہ طبری]

۳۷- **روغن خندقوقی**[بسکھپرا کا تیل] وجع مفصل۔ تحجر مفصل۔ صلابت مفصل، وجع مفصل ریحی کے لیے بہت ہی نفع بخش دوا ہے۔[علامہ طبری، علامہ ابن ہبل، ابن سینا]

۳۸- **جوشاندہ برگ حنا** میں شکر سفید ملا کر چالیس یوم تک استعمال کرنا جذام کے لیے بہت ہی مفید ہے۔[علامہ انطاکی]

۳۹- **آرد باقلا** کو شراب کہنہ میں ملا کر لگانا اس بہق کو بہت ہی مفید ہے جو لڑکوں میں وقت بلوغ پیدا ہوتا ہے۔[امام سویدی]

۴۰- **برگ حنا** ایک حصہ پر **سیاوشاں** نصف حصہ دونوں کو کوٹ چھان کر مولی کے پانی میں ملا کر رات کو بالوں میں ملیں اور صبح کو **آب مطبوخ خطمی** سے دھو ڈالیں۔ بالوں کی طوالت مضبوطی، روئیدگی اور سیاہی کے لیے بہت ہی فائدہ مند ہے۔[امام سویدی]

۴۱- اگر کسی جگہ کے بال اکھاڑ کر **نوشادر** کو بکری کے پتہ میں حل کر کے بار بار لگائیں تو بالوں کا اگنا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔[امام سویدی]

۴۲- **نخود بریاں** کے ساتھ قدرے بادام ملا کر مداومت کے ساتھ کھانا فربہی پیدا کرتا ہے۔[علامہ انطاکی]

۴۳- **سندروس** کا سکنجبین کے ساتھ دائمی استعمال موٹاپا اور شحمیت کو دور کر دیتا ہے۔[علامہ انطاکی]

۴۴- نقرس گرم میں **اسپغول** کو سرکہ میں بھگو کر سرد کر کے مقام ماؤف پر رکھنا تسکین عجیب دیتا ہے۔[صاحب غنی منی]

[مطبوعہ: ہمدرد طبی کالج میگزین، دہلی، ۷۷-۱۹۷۶ء، ص ۳۳-۳۶]

●●●

تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں

مظہر سبحان گورکھپوری

۲۰ رفروری ۶۱ء کو آل انڈیا ہندو مہا سبھا کے زیر اہتمام بمقام لکھنؤ ''جبل پور میں مسلم غنڈہ گردی'' کے خلاف ''یوم'' منایا گیا ڈاکٹر رادھے شیام اور سالک رام نے ہندوستان کے مسلم سلاطین بالخصوص اورنگ زیب کو ''غنڈہ'' کہتے ہوئے مسلمانوں کو یہ دھمکی دی کہ اگر وہ اورنگ زیب کی ذہنیت بدل نہیں سکتے تو انہیں ہندوستان میں رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ [حوالہ قومی آواز ۱۲ رفروری ۶۱ء]

جبل پور اور ساگر وغیرہ میں ایک خستہ حال اور نحیف قوم پر ہندو فرقہ پرستوں کی یلغار خواہ کتنی ہی بھیانک ''رقت انگیز'' اور ہوش ربا کیوں نہ ہو، تعجب انگیز اور خلاف توقع بالکل نہیں!

محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا واسطہ ایک ایسی قوم سے آپڑا ہے جس کی گھٹی میں اگر ہندوستان کے سارے مسلمان اپنا آخری قطرۂ خون بھی ٹپکا دیں تو بھی ان کی ''رواداری'' مشکوک ہی رہے گی... میجر ہڈسن کی ظالمانہ ذہنیت سے بڑھی چڑھی پولیس جب مسلمانوں کے جان و مال کو تباہ و برباد کرنے میں خود بھی چنگیز و ہلاکو کا پارٹ ادا کرنے لگے تو مسلمان یہ کیونکر باور کرے کہ اس کی جان مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کا یہ تاریک ترین دور کبھی اچھے مستقبل سے بدل بھی سکے گا۔

جبل پور اور ساگر کے مسلمانوں پر قیامت سے پہلے ایک قیامت آئی، محلّے کے محلّے پھونک دیئے گئے، مسجدیں اور مقبرے مسمار کر دیئے گئے۔ مردوں کے شکم میں خنجر اتار دیئے گئے اور عورتوں کی عصمتیں لوٹ لی گئیں اور آہ... ''حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے''۔

جہاں زندگی مسکراتی اور رقص کرتی تھی وہاں آج موت کا بھیانک پہرہ لگا ہوا ہے جہاں اونچی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں وہاں خاک اڑ رہی ہے اور جو کل تک لکھ پتی تھے وہ آج خورد و نوش کو محتاج ہو گئے... ستم بالائے ستم یہ کہ اس پر بھی فرقہ پرست درندوں کی شقاوت قلبی آسودہ نہ ہوئی اور زہریلے خنجروں کی پیاس نہ بجھی اور سالک رام و رادھے شیام جیسے ہزاروں ننگ قوم، ننگ وطن اور ننگ انسانیت درندے مسلمانوں کو پریشان اور تباہ حال کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ اورنگ زیب کے خلاف زندگی بھر 'مکاری' کرنے والے شوریدہ سروں کے یہ جانشیں اورنگ زیب جیسے نیک سیرت اور منصف سلطان کو غنڈہ کہہ کر اپنی غنڈہ گردی اور دریدہ ذہنی کا چاہے جتنا بھی ثبوت بہم پہونچائیں، مسلمان اورنگ زیب کی ذہنیت بدلیں گے اور نہ اپنے تہذیبی سرمائے سے دستبردار ہوں گے۔ ان کا ''روزہ ان کی نماز'' ان کی اذان اور ان کی تہذیبی تقریبات سے جلنے والے جلا کریں جلنا تو ان کی قسمت میں لکھا جا چکا ہے۔ جب تک زندہ رہیں گے اپنے 'آتش کدہ تصور' میں جلیں گے اور جب مر جائیں گے تو انہیں ان کے شایان شان ٹھکانے پہنچا دیں گے۔

مسلمانوں کو ہندوستان چھوڑ دینے کی دھمکی دینے والے یہ مہا سبھائی، جن سنگھی، راشٹریہ سیوکی، آریہ سماجی، شیوائی، دیانندی، شردھانندی، ٹنڈنی، سمپورنائی اور کاٹجوئی، مسلمانوں کو صرف اورنگ زیب بابر اور شاہجہاں کے روپ میں دیکھتے آئے ہیں۔ یہ ابھی بلالؓ، صہیبؓ، عمارؓ، اور سمیہؓ کے کردار سے آشنا نہیں ہیں آج

یہی زندگیاں ہمارے لیے مشعل راہ ہیں، ہم تاج محل، قطب مینار اور لال قلعہ کی پیشانی پر اپنی عظمت، عروج کی داستانیں نہیں پڑھتے آج ہماری نظریں عرب کے اس تپتے دیئے ریگستان پر مرکوز ہیں جہاں ہمیں برہنہ جسم کر کے تڑپایا گیا ہے جس سے ہم نے مصیبتوں میں ثابت قدم رہنا سیکھا ہے ہم اپنے لیے صبر وثبات کی قوت کا اکتساب ان پہاڑی ٹیلوں سے کرتے ہیں جہاں ہمارے اسلاف کے سینوں کو آفتاب کی نوکیلی کرنوں سے زخمی کیا گیا ہے۔ ہماری مظلومی اور ستم رسیدگی کی تاریخ کا ایک ورق 'شعب ابی طالب' اور 'دار ارقم' ہے ہم اندلس پر روئے ہیں، بلقان اور طرابلس پر اشک باری کی ہے، فلسطین اور الجزائر کا المیہ دیکھا ہے، مبارک پور ہو یا بھوپال اور سیتا مڑھی، فیروز آباد ہو کہ جبل پور اور ساگر ہر جگہ اور ہر وقت ''خوگر جور'' اپنا تیر آزمائیں اور ہم اپنا جگر۔ دیکھا چاہیے کہ ان کے ترکش کے تیر ختم ہوتے ہیں یا ہمارے ہاتھوں سے صبر وتحمل کا دامن چھٹتا ہے۔

مگر انہیں ایک تاریخی حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہیے..... کہ ان کا وطنیت کے مفہوم کو اتنا تنگ اور محدود سمجھنا کہ خود اس ملک کے رہنے والے مختلف اقوام بھی وہاں کے اصلی رہنے والے ثابت نہ ہوسکیں، ان کی وہی پرانی اور موروثی تنگ خیالی ہے جس نے تاریخ میں ان کو ہمالہ اور سمندر کی چہار دیواریوں میں بند اور اچھوت بنایا۔ جس نے نفرت کی پرانی لڑائی ہزاروں برس سے کھڑی کر رکھی ہے اور جس نے تاریخ کے ہر دور میں ان کے اندر نفاق پیدا کیا ہے اور انہیں مجبور کیا ہے کہ وہ باہر کا سہارا ڈھونڈیں اور باہر والوں کو اپنی مدد کے لیے اپنے گھر بلائیں اور نتیجہ میں اپنے ساتھ دوسروں کو بھی غلامی کی زنجیروں میں اسیر کرائیں۔

[مطبوعہ: پندرہ روزہ 'برادری'، جلد ۴، شمارہ ۶، ۱۵/ مارچ ۱۹۶۱ء لکھنؤ]

•••

آئینۂ عبرت

مظہر سبحان گورکھپوری

- بلاشبہ عید کا تصور نشاط وشادمانی کا گہوارہ ہے..... یقیناً آپ کے رفقاء واحباب آپ کو تہنیت ومبارک باد کے روح افزا گلدستوں سے کیف وسرور کی گہرائیوں میں پہونچا دیں گے۔
- مگر یہ نہ بھولیے کہ جس چاند کا آپ 'ہلال عید' کے نام سے استقبال کرتے ہیں۔ اسی چاند نے دست رسالت کے ایک اشارے پر اپنا سینۂ نور چاک کر ڈالا تھا.....اور آج اس کے سینۂ چاک پر آپ کی عظمت وجلال کی لکیریں بھی مرتسم ہیں اور نکہت وزوال کے نقاط بھی۔
- اس چاند نے ''قیصر وکسریٰ'' دنیا کی دو عظیم طاقتوں کے سر سے کلاہِ غرور ونخوت کو خاک پر گرتے بھی دیکھا ہے.....اور ان مجاہدان اسلام کے سرگرم سفر قافلوں کا نظارہ بھی کیا ہے۔ جو رات میں اپنے رب کے حضور سربسجود رہتے تھے تو دن کی روشنی میں گھوڑوں کی پیٹھ پر تلواروں کے سایہ میں آجاتے تھے..... آپ بھول گئے تو بھول جائیں مگر چاند کو وہ منظر بھی یاد ہے جب کہ انسانیت کی گرہ کشائی کے لیے مغرب کی جانب سے ایک جری، بہادر، حق شعار نوجوان مجاہد ''محمد بن قاسم'' کی صورت میں ساحل سندھ پر نمودار ہوا تھا..... چاند کو تو سب کچھ یاد ہے مگر آپ کو کچھ بھی یاد نہیں۔
- ہلال عید پیام مسرت ونشاط بھی سناتا ہے اور اپنی زبان خاموش سے آپ کی غفلت ونادانی کا مضحکہ بھی اڑاتا ہے۔

پیامِ عیش ومسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے [اقبال]

- جب ہماری عظمت وقیادت کا آفتاب عروج پر تھا تو ہماری عید بھی عید ہوتی تھی۔ آج ہم تنزل وپستی کے تحت الثریٰ میں پہونچ چکے ہیں تو یہ وقت عید ومسرت سے کہیں زیادہ ''عبرت وآہ'' کا متقاضی ہے۔

[**مطبوعہ**: پندرہ روزہ 'برادری' لکھنؤ جلد ۴، شمارہ ۶، ۱۵/ مارچ ۱۹۶۱ء]

•••

'یہ بندگانِ نہرو'

مظہر سبحان گورکھپوری

جب جبل پور، ساگر اور مدھیہ پردیش کے دیگر مقامات پر ''آگ وخون'' کا ڈرامہ اسٹیج کیا جارہا تھا، جب بے کس مسلمانوں کی آہ وفغاں سے سینۂ زمین پر ارتعاش اور فلک پر لرزہ طاری تھا اور جب فرقہ پرستوں کا دست جنوں عفت مآب خواتین کے دامنِ عصمت کی دھجیاں اڑا رہا تھا، جب نوخیز غنچوں کو ماں کی اشک آلود مامتا کے سامنے قدموں تلے مسلا جارہا تھا اور جب فری پریس جنرل، ہندوستان ٹائمز، اسٹیٹسمین، نیشنل ہیرلڈ اور بل ز جیسے غیر مسلم اخبارات دردوکراہ کی روشنائی سے اپنے ادارتی کالموں کا پیٹ بھر رہے تھے نیز جب ڈانگے، بھوپیش گپتا اور انتھونی ظلم وبربریت کے خلاف بیانات دے رہے تھے... کچھ لوگ ''ردائے وزارت'' تانے ہوئے استراحت فرمارہے تھے۔ یہ انریبل حافظ محمد ابراہیم ہیں، یہ سید ہمایوں کبیر ہیں، یہ کیپٹن شاہ نواز ہیں، یہ جناب عابد علی، یہ احمد محی الدین اور یہ مسٹر سعادت علی خاں ہیں... یہ وہ لوگ ہیں جنہیں مسلمانوں نے اپنی سیاسی قیادت سونپی ہے اور جن سے ان کا ایک گہرا رشتہ یعنی ''رشتۂ اخوت'' وابستہ ہے مگر اپنی قوم کی تباہی وبربادی پر ان کی زبان سے احتجاج وتاسف کا کوئی کلمہ نکلا نہ رنج وہمدردی کی کوئی ''آواز'' جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں، ان کی آنکھوں نے اخباروں میں کچھ پڑھا ہی نہیں اور جیسے یہ لوگ کسی ایسی دنیا میں رہ رہے ہیں جس کا ہماری اس دنیا سے کوئی تعلق ہی نہیں... ان کے دلوں میں کوئی تڑپ ہے نہ فکر وذہن کی آسودگی کے لیے کوئی چیلنج۔

جب ایک پڑوسی ملک کے باشندوں نے جبل پور وساگر کے مظلومین کی حمایت میں غلط یا صحیح طور پر احتجاجی مظاہرہ کیا تو یہ سب حضرات بہ یک جنبش وبہ یک جوش اعلان کرنے لگے ''ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے محبوب وزیر اعظم نہرو کی قیادت پر مکمل اعتماد ہے'' نہرو گویا ''ہندوستان'' ہیں کہ اس موقع پر ان کی محبوبیت اور قیادت پر اظہار اعتماد نہ کرنے سے مسلمانوں کی وفاداری مجروح ہوئی جارہی تھی— کیا ان لوگوں کا مصرف صرف یہی رہ گیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر آگ برس رہی ہو تو یہ لوگ باہر کی دنیا کو بتلائیں کہ ''مسلمان تو موسم بہار سے لطف اندوز ہورہے ہیں''

نہرو کی اقلیت نوازی چاہے کتنی ہی پرکشش کیوں نہ ہو اور کانگریس کا نظریہ جمہوریت خواہ کتنا ہی جاندار کیوں نہ ہو ہمیں تو اسے دیکھنا ہے جو ہمارے ساتھ واقعات اور عمل کی دنیا میں پیش آیا ہے.....نہرو کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ''گفتہ او گفتہ کانگریس بود'' کا مصداق ہے۔ نہرو سینکڑوں مخالفتوں کے باوجود یوپی کی وزارت علیا اپنے کسی منظور نظر کو سونپ سکتے ہیں اور سارے بنگال کی مخالفتوں کے باوجود بیروباڑی پاکستان کو منتقل کرسکتے ہیں مگر وہ اُردو کو اس کا غصب شدہ حق واپس نہیں دلا سکتے۔ مسلمانوں کے ساتھ زیادتیوں اور بے انصافیوں کا سدباب نہیں کرسکتے۔ کہنے کو نہرو سارے ہندوستان کے ڈکٹیٹر ہیں مگر مسلمانوں کے معاملات میں زبانی تسلیوں اور لفظی غمگساریوں کے سوا ہر معاملہ میں بے بس ومجبور!

اوروں کے لیے کانگریس کا انتخابی نشان ''دو بیلوں کی جوڑی'' ہے مگر مسلمانوں کے لیے ''نہر'' جب الیکشن آتا ہے تو مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ کانگریس کو مت دیکھوں، ہندو کو دیکھو!! اور پھر راگ الاپنے والے الاپنے لگتے ہیں ''نہرو تمہارا کس قدر ہمدرد ہے، تمہارا کتنا خیال رکھتا ہے''—— ہمیں کہنے دیجئے کہ نہرو کی شخصیت مسلمانوں کے لیے مارفیا کا انجکشن بنادی گئی ہے، مسلمانوں کو اس ''افیون زدہ'' زندگی سے نکلنا ہوگا اور اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے کے لیے دریوزہ گری اور کاسہ گدائی سے دست کش ہوکر ایک واضح نصب العین کے ماتحت جدوجہد کرنا ہوگا، اسی میں ہماری فلاح ہے اور ملک کی بہتری''

حادثۂ کراچی اور ہندوستانی ہائی کمشنر:

ہندوستانی ہائی کمشنر کے دفتر واقع کراچی کے سامنے پاکستانیوں کے مظاہرہ کی مذمت میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہوگا۔ ممکن ہے اس مظاہرہ میں کچھ لوگوں کی

شرکت جذبۂ اخوت اور ملی خلوص پر مبنی ہو لیکن عقل و ہوش کی باگ ڈور کو نری جذباتیت کے سپرد کر دینے کا نتیجہ سوائے شرمندگی اور رسوائی کے کچھ اور نہیں ہوتا۔ پاکستان میں مدھیہ پردیش کے فسادات کے زیر اثر جو کچھ بھی ہوا ہے اس پر ہمیں افسوس اور شرمندگی ہے — رشتۂ اخوت کا احترام بڑی اچھی بات ہے اور ایک بھائی کی تکلیف پر تڑپ اٹھنے اور اس کے دل کی دھڑکنوں کو اپنے اندر سمو لینے کا احساس بڑی مسعود علامت ہے مگر اس سے بھی بڑی چیز ہے اس کے اظہار کے طور طریقہ میں بلند ظرف شائستگی اور اسلامی وقار کا لحاظ — ہمیں خوشی ہے کہ حکومت پاکستان کے وزیر داخلہ مسٹر ذاکر حسین نے اپنی حکومت کی جانب سے اس پر معذرت چاہی ہے اور اس حادثہ میں ہندوستانی ہائی کمشنر کے دفتر کو پہنچنے والے نقصانات کا معاوضہ ادا کرنے کا اعلان کیا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند:

آزادی کے قبل جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ جتنی روشن تھی آزادی کے بعد اتنی ہی تاریک ہوگئی۔ اگر حادثہ ۴۷ء کی چند روزہ جدوجہد کو حذف کر دیا جائے تو اس پورے چودہ سالہ دور میں جمعیۃ کا وجود اس ضعیف صد سالہ کا مثل بن جاتا ہے جو اپنے دورِ شباب کے اندوختہ پر بڑھاپے کی زندگی گزار رہا ہو — تقسیم ملک کے بعد مسلم لیگ اپنا بوریہ بستر باندھ کر پاکستان کی راہ لے چکی تھی اس پورے برصغیر ہند کی مسلم سیاست کے افق پر صرف جمعیۃ علماء کا علم لہرا سکتا تھا اور اس بات کا واضح امکان تھا کہ منقسم ہندوستان کے ۴½ کروڑ مسلمانوں کی سیاسی قیادت بلا شرکت غیرے جمعیۃ علماء کو حاصل ہو جائے مگر جمعیۃ کے پاس اپنا کوئی نصب العین تھا اور نہ طریق سیاست جو کچھ تھا وہ کانگریس سے مستعار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمعیۃ علماء نے مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کا وہ نادر موقع کھو دیا جو اس کی واحد حریف مسلم لیگ کے فرار کر جانے سے اسے حاصل ہوا تھا۔

تبدیلی کے آثار:

اجین کانفرنس کی کارروائیوں سے جمعیۃ علماء کی ذہنی تبدیلی کا پتہ چلتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب ''نیاز مندی'' کے چلمن سے باہر نکل کر خود کو مسلمانوں کی عام محسوسات سے ہم آہنگ کرنا چاہتی ہے۔ کانفرنس میں ہندوستانی مسلمانوں کی مظلومی و محرومی پر بہت کچھ کہا گیا تھا اور اب جمعیۃ علماء کے جنرل سکریٹری مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے جبل پور وغیرہ کے فسادات پر جس انداز میں تقریر کی ہے وہ کافی حد تک زوردار اور حکومت بیزار معلوم ہوتی ہے۔ ایک خبر یہ بھی ہے کہ حکومت کی انتظامیہ کے ارباب اثر کی مسلم دشمنی سے متاثر ہو کر مولانا نے کانگریس سے علیحدگی اور جمعیۃ علماء کو ''اینٹی کانگریس'' پوزیشن میں لانے کی دھمکی بھی دی ہے۔ ممکن ہے جمعیۃ کی اس ذہنی تبدیلی پر بعض دیگر عوامل بھی اثر انداز ہوئے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جمعیۃ علماء کی مخالفتوں کے باوجود کیرالہ میں کانگریس مسلم لیگ سمجھوتہ سے مولانا کو یہ باور ہو گیا ہو کہ کانگریس کے نزدیک ''مضبوط دشمن'' کی قدر اس دوست سے زیادہ ہے جو کمزور اور ناتواں ہو۔ ظاہر بات ہے کہ جماعتوں کی طاقت و توانائی کا دوسرا نام ''عوامی مقبولیت ہے'' —— لیکن محض گفتار کا غازی بن جانے سے عوامی مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو ناپائیدار۔ پھر جمعیۃ علماء کے لیے یہ کام اور بھی مشکل ہے کیوں کہ اس نے اپنے آپ کو کانگریس کا ضمیمہ بنا کر اپنی ساخت کو مجروح کر ڈالا ہے۔ اس جراحت کا اندمال اور اس میں خون کی نئی گردش اسی وقت ممکن ہے جب جمعیۃ علماء عملی دنیا میں جرأت مندانہ پالیسی اختیار کرے۔

رقابت اور اشتراک:

مسلمانوں کے اندر چند دیگر تنظیمیں بھی ابھر رہی ہیں۔ اس میں بعض ایسی ہیں جن کا میدان فکر بڑا وقیع اور وسیع ہے ان کی قیادتیں توانائی کی منزلیں نمایاں طور پر طے کر رہی ہیں جمعیۃ اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتی۔ جذبۂ مسابقت بڑی مسعود علامت ہے مگر رقابت اتنی ہی مذموم، یہ تسلیم کہ یہ ایک فطری کمزوری ہے مگر جمعیۃ علماء میں اس کمزوری کا گھر کر جانا بہت بڑی کمزوری ہے ''وشاورھم فی الامر'' اور ''رحماء بینھم'' کی تلاوت کرنے والوں کا ظرف اس سے بہت بلند ہونا چاہیے — دینی تعلیم کے مسئلہ پر بستی میں مختلف مکاتب فکر کے نمائندوں کی جو کانفرنس ہوئی تھی وہ بڑی خوش آیند تھی مگر علاحدگی پسندی کے رجحانات اور چودھراہٹ کی جھوٹی پیاس نے اس اچھے عنوان کو ایک بری تمہید کا شکار بنا دیا۔ اس سلسلہ میں جمعیۃ کی غلط روش پوری طرح محسوس کی گئی۔

[مطبوعہ: پندرہ روزہ 'برادری'، جلد ۴، شمارہ ۶، ۱۵/ مارچ ۱۹۶۱ء لکھنؤ]

خودکشی — مغربی تہذیب کے جوہر سے پھوٹنے والی ایک وباء

میرلن منرو — اس تہذیب کا ایک پامال وجود

م۔س گورکھپوری

مغربی تہذیب کے فروغ سے جہاں انسانی معاشرت کے بہت سے گوشوں اوراس کے نظریات میں کجی و پیچیدگی پیدا ہوئی وہاں اس کے رجائی پسند کردار اور تنازع للبقاء کے مسائل سے نپٹنے کے لیے عمل وحوصلوں کے قویٰ پر اضمحلال وافسردگی کے منحوس اثرات بھی طاری ہوئے۔ انسانی دنیا کے اس طبقہ میں جو مذہب کے دیئے ہوئے بعدالموت محاسبہ کے تصورات سے بے تعلق اور آزاد ہے نامساعد حالات سے گھبرا کر موت کی دہلیز پر سو جانے کا رواج درجہ وباء کو پہونچتا جارہا ہے کیونکہ اس وقت اس کے سامنے سوائے اس ''راہ فرار'' کے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ ناکامیوں اور مایوسیوں کے وقت نہ تو اس کے قلب واذہان میں کسی مافوق الفطرت طاقت سے امید رکھنے اور مدد مانگنے کی کوئی آواز پیدا ہوتی ہے اور نہ ہی جرم خودکشی کے خلاف کسی مذہبی چیلنج کا خوف۔ نتیجہ میں وہ قوت وعمل کی اضاعت کے بعد ذہنی قویٰ کے انتشار، ارادوں کی شکست اور حوصلوں کی موت کے سوا کچھ اور نہیں پاتا۔

خودکشی کے بڑھتے ہوئے رواج کو دیکھتے ہوئے سڈنی کے کچھ حوصلہ مندوں نے ایک ''خودکشی دشمن'' ادارہ کے قیام کا اعلان کرتے ہوئے ایک منصوبہ بنایا ہے۔ خودکشی کے خلاف بین الاقوامی تحریک کا یہ منصوبہ بڑا ہی خوش آیند ہے تاہم سوچنے کی بات یہ ہے کہ انسان کا وہ تصور جو اسے مذہب کی آغوش سے ملتا ہے اور جو بعدالموت محاسبہ کے خوف سے وابستہ ہوتا ہے، اس وباء کی روک تھام میں ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے سوشل مسائل کے ریسرچ اسکالروں کے لیے غالباً یہ ایک قابل غور مسئلہ ہوسکتا ہے کہ یہ وباء کسی مولوی ملا، صوفی صافی، موذن یا کسی مسجد کے امام کے وہاں نہیں پائی جاتی اور نہ ہی اس کا سیلاب ان بستیوں تک پہونچا ہے جہاں مشیت ایزدی پر سجدہ شکر بجالانے والے سیدھے سادھے دیہاتی، گھر گرہستی کے کاموں سے نڈھال مگر دست وبازو کی توانائیوں سے آخر دم تک کام لینے کی ہمت رکھنے والے کسان رہتے ہیں۔ 'اس سیلاب کی لہروں سے کھیلنے والوں میں کوئی گریجویٹ ہوگا یا کوئی گزیٹڈ افسر، کوئی اسٹوڈنٹ ہوگا یا کلبوں اور عیش وعشرت سے سرشار زندگی گزارنے والے ماڈرن لوگ یا کوئی سوسائٹی گرل —'

ہالی وڈ کی مشہور اداکارہ میرلن منرو بھی ۱۴/اگست ۶۲ء کو خواب آور گولیاں کھا کر اسی وباء کی شکار ہوگئی۔ دنیا بھر میں اس کی موت پر آنسو بہائے گئے، سسکیاں لی گئیں اور بہتوں نے اس حادثہ کی تاب نہ لاکر خود کو بھی اسی وباء کے حوالہ کردیا۔ میرلن منرو ''جو ماڈرن حلقوں'' کے دلوں کی دھڑکن اور شباب وسرمستیوں کے لیے

اعلیٰ درجہ کا ٹانک تھی۔ جس کا وجود جنسی اپیل اور جس کا سراپا حسن ورعنائی کا ایک زبردست بت تھا۔ جس کے پرستار لاکھوں کی تعداد میں دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے تھے جو اسے ہر ماہ آٹھ ہزار محبت نامے لکھا کرتے تھے، جسے عام مزدوروں سے لے کر کروڑ پتیوں تک کی طرف سے شادی کے لیے ہر ماہ چالیس پیغامات ملا کرتے تھے، جسے امریکہ کی بڑی بڑی سیاسی اور سماجی شخصیتیں اپنا شریک دسترخوان بنانے کی تمنا کرتی تھیں اور جو موت کے وقت بھی پچیس لاکھ روپئے سے زیادہ رقم چھوڑ گئی''۔ اس کی خودکشی یقیناً اپنے پس منظر میں ماڈرن تہذیب کے پوسٹ مارٹم کے لیے معتبر قسم کے مواد رکھتی ہوگی''۔

میرلن کی ماں گلیڈیز بیکر غربت ومفلسی کی حالت میں ہالی وڈ میں فلم کاٹنے کا کام کرتی تھی۔ میرلن جب پیدا ہوئی تو ڈاکٹر کی فیس اسٹوڈیو کے کچھ ملازمین سے چندہ کرکے ادا کی۔ میرلن کا باپ مارٹن سن جو مسز بیکر کے ساتھ شادی کیے بغیر زندگی گزار رہا تھا اس خبر سے کہ مسز بیکر حاملہ ہے۔ ہالی وڈ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ میرلن کی ماں اسے کم سنی ہی میں اپنے ساتھ اسٹوڈیو لے جاتی تھی جہاں میرلن خواب وخیال کی دنیا میں اپنے آپ کو ہالی وڈ کی اداکارہ سمجھنے لگتی اور پھر اس خوش آیند اور جانفزا تصور سے اس کے انگ انگ رقص کرنے لگتے۔ محلوں کی خواب دیکھنے والی میرلن کو جھونپڑیوں میں رہنا پڑا۔ مختلف گھرانوں میں سرکاری امداد پر اس کی پرورش کی گئی لیکن کوئی خاندان مستقل طور پر اسے اپنا بنانے پر تیار نہ ہوا، حرص وہوس کی اس دنیا میں پرورش پانے کے باوجود میرلن کا باطن عورت کے فطری ناموس وعفت کا احساس گاہ تھا مگر وہ اپنے حسن ودلکشی کے پندار سے کبھی بھی تہی خیال نہیں ہوئی۔ اسے اس کے اس پندار نے برابر یہ خواب دکھلایا کہ وہ چرچ میں بالکل ننگی ہوگئی ہے اور سب لوگ اس کے قدموں پر جھکے ہوئے ہیں اور وہ ان سب سے بے نیاز ان پر پیر رکھے بغیر ان پر سے گزر کر باہر جارہی ہے۔ انہیں ایام میں جب کی میرلن عمر کے آٹھویں زینے کو طے کررہی تھی ایک ادھیڑ مرد نے اسے مٹھائیاں دینے کے بہانے اپنے حجرہ میں لے جاکر بند کرلیا اور اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ میرلن جنس کے اس عمل سے قطعاً غیر متعارف تھی تاہم اسے یہ ضرور محسوس ہوا، جو کچھ ہوا ہے وہ ہونا نہ چاہیے تھا۔ اس رات وہ صبح تک روتی رہی اور اس کے بعد اکثر اس کے ذہن وشعور پر اس ''شب معصیت'' کا تصور ایک ضرب بن کر آتا اور چلا جاتا۔ میرلن کچھ دنوں تک یتیم خانہ میں زندگی گزارنے کے بعد اپنی ماں کی ایک سہیلی کے یہاں منتقل ہوگئی۔ بارہ سال کی عمر میں جب اس نے ایک دن اپنی سہیلی کا سوئیٹر پہنا تو اسکول کے لڑکوں نے اس کا توجہ ودلچسپی کی نظروں سے استقبال کیا اور یہیں پر ماڈرن ماحول نے میرلن کی سادہ اور معصوم نسوانیت کا رخ ہوس وعصیاں کی راہ پر موڑنا شروع کردیا۔ اب میرلن میں حسن کا احساس اچھی طرح بیدار ہوچکا تھا اس نے اپنے سراپے کو دلکش اور پرکشش بنانے کے لیے ایک ہفتہ تک اسکول تک پیدل چل کر بس کے کرائے بچا کر ابرو سیاہ کرنے کی پنسل اور لپ اسٹک خریدی۔ اسکول کے لڑکوں میں میرلن کے پرستاروں کی تعداد اتنی سرعت کے ساتھ بڑھنے لگی کہ اس سے دوسری لڑکیاں جلنے لگیں۔ مسز بیکر کی سہیلی اس نوشگفتہ پھول کے گرد آوارہ بھونروں کے کثرت ازدہام کو دیکھ کر میرلن کی شادی کی فکر میں پڑ گئی۔ چنانچہ میرلن ہوائی جہاز بنانے والی فیکٹری کے ایک اکیس سالہ ملازم، سیزووٹرٹی کے ساتھ بیاہ دی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد دوہرٹی سمندری فوج میں بھرتی ہوگیا جہاں اس نے دیکھا کہ کیمپ کے تمام مرد اس کی بیوی کو تشنہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور میرلن کا جذبہ خودستائش بھی ان کی تشنہ نگاہی سے اور آسودہ ہوتا ہے۔ دوہرٹی کا 'آبگینہ شوہریت' اس منظر کی تاب نہ لاسکا۔ اس نے میرلن کو بیوی بنائے رکھنا چاہا صرف بیوی۔ مگر میرلن کا جسم کسی اور ہی راہ کا لذت آشنا ہوچکا تھا اس نے دوہرٹی سے طلاق لے لی اور پیراشوٹ بنانے والی ایک فیکٹری میں ملازم ہوگئی لیکن فیکٹری کی ملازمت نہ تو اس کے بس کی بات تھی اور نہ ہی اس سے اس کے روز افزوں اخراجات کی کفالت ہوپاتی تھی، وہاں اسے ایک فوٹوگرافر نے ماڈل بننے کا مشورہ دیا چنانچہ میرلن نوکری چھوڑ کر ماڈل ہوگئی اور رسائل وجرائد میں اس کی بے نام تصویریں چھپنے لگیں۔ اس طرح اس پر آر، کے، او۔ ریڈیو پکچرز ٹوئینتھ سنچری فوکس کمپنی کی نظریں پڑیں اور پہلی دفعہ ۱۹۴۶ء میں اسے بطور اداکارہ پانچ سو روپیہ ہفتہ پر نوکر رکھ لیا گیا۔ لیکن اسے صرف ایک فلم میں لفظ ''ہلو'' کہنے کا کام ملا اور وہ بھی فلم کی نمائش سے پہلے فلم سے کاٹ دیا گیا۔ سال بھر بعد میرلن کی نوکری ختم ہوگئی۔ چھ مہینے تک میرلن پھر ماڈل بنی رہی لیکن میرلن کے دل میں ایک فلم اسٹار بننے کی جو آگ

جل چکی تھی اسے سرد ہونا تھا نہ ہوئی وہ بھوکی سو رہتی مگر پیسے بچا کر اداکاری کے ایک اسکول میں ٹریننگ لیتی رہی۔ میرلن کے پاس اس کی اپنی ایک کار تھی جسے اس نے قسطوں پر خریدا تھا۔ قسطیں نہ ملنے پر کمپنی کی جانب سے جب کار واپس لے لینے کی دھمکی ملی تو میرلن نے اپنا عریاں فوٹو کھچوانا منظور کرلیا۔ فوٹو گرافر ٹوم کیسلی نے میرلن کی چھتیس ننگی تصویریں کھینچی جن سے چھپے ہوئے کلنڈر لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئے اور فوٹو بھی ہزاروں کے دام بکے۔ اس کے بعد میرلن کو ایک فلم میں صرف ایک جملہ بولنے کا کام ملا جس کے لیے اسے ایک مہینہ تک سارے امریکہ میں گھمایا گیا جس سے اس کی شہرت بام عروج پر پہونچ گئی اور وہ اپنی ایک فلم ''اسفالٹ جنگل'' کے ذریعہ ایک کامیاب فلم اسٹار تسلیم کی جانے لگی۔ اس نے بیس بال کے مشہور کلاڑی جودی ماگیو سے شادی کی جو سال بھر بھی قائم نہ رہ سکی پھر ڈرامہ نویس آرتھر ملر سے شادی کی جو پچاس ماہ بعد طلاق کی شکل میں ختم ہوگئی۔

میرلن کا وجود مغربی تہذیب کا ایک پکا ہوا ناسور تھا جو برابر رستا رہا۔ اس کی خودکشی سے جہاں اس تہذیب کی خودکار اور بوجھل معیاریت، اس کے کھوکھلے پن اور مکروہ مصنوعیت پر روشنی پڑتی ہے وہاں اس سے نسوانی عفت وعصمت کی تجارت گاہوں سے 'آرٹ وکلا' کا طلائی غلاف بھی چاک ہوجاتا ہے۔ آج ہماری اس دنیا میں ہزاروں میرلنیں پڑی ہیں جنہیں آرٹ وکلا کے فریب نے ان کی فطری پاکیزگی اور نسوانیت کی معصوم ومقدس قدروں سے دور کر کے مصنوعی اور بوجھل زندگی کے دلدل میں پھنسا دیا ہے۔ میرلن کے ماڈرن ماحول نے اسے 'شمع خانہ' بننے کے ہر موقع پر فریب دیا۔ ازدواجی زندگی بسر کرنے کی تمنا نے ہر بار اس کے باطن کو زخمی کیا۔ وہ شادیاں کرتی رہی مگر تجدد زدہ زندگی اور حریت نسواں کی برق پاش چمک اس کی آنکھوں سے اس کا اصلی نور چھینتی رہی۔ ہالی وڈ اس کی وہ اخلاقی جرأت سلب کر چکا تھا جس کے سہارے وہ ان گلپوش خاروں سے اپنا دامن چھڑا کر کسی ایک کی ہوجاتی جو ایک ٹھوس اور صالح بندھن کے تحت زندگی کی حقیقی مسرتیں اس کے دامن میں ڈال دیتا میرلن کے لیے یہی احساس اذیت اس کی روح وباطن کو چھلنی کرتا رہا۔ میرلن ہر ایک کے لیے ایک جنسی کھلونا تھی وہ اسے خوب سمجھتی تھی۔ لاکھوں شیدائیوں کی اس دنیا میں اسے کوئی ایسا نہ ملا جو اس کے سفید وملیح بشرے وجلد سے نظریں ہٹا کر اس کے باطن کے جھروکوں میں اور بے غرض وبے لوث محبت کا کوئی جرعہ اس کے حلق میں اتار دیتا۔

[مطبوعہ: سالنامہ، پندرہ روزہ 'برادری' یکم و۱۵ فروری ۱۹۶۳ء لکھنؤ]

●●●

کعبہ سے.....بُت خانے تک

ملاّ امرود بخت شالجی

یکم جنوری ۱۹۶۰ء: آج سال کا پہلا دن ہے ہر طرف سے مسرت وشادمانی کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں، اخبارات ورسائل اپنے اپنے کالموں میں نئے سال کی خوشحالی اور امنیت کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کر رہے ہیں لیڈران قوم کے نام پیغامات نشر کر رہے ہیں۔ بھلا ایڈیٹر برادری کہاں ایسے جو اپنے اس پندرہ روزہ کو اس سعادت سے محروم ہوتا دیکھ لیں۔ حکم صادر ہوا ہے ملاّ سال نو کی آمد پر تہنیت وتبریک کا پیغام کچھ ایسے انداز نگارش میں قلم بند کرو کہ نہ صرف ناظرین مست و مگن ہو جائیں بلکہ ان کے آباء واجداد بھی عالم ارواح اور آنے والی اولادیں عالم جنین میں خوشیاں منانے لگیں۔ کام کی اہمیت ظاہر ہے از بسکہ اتنا ہی مشکل ہے جتنی کہ چین کے متعلق پنڈت نہرو کی پالیسی ...اور پھر مجھ میں اور پنڈت نہرو میں نسبت ہی کیا ہے ایک نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کا مدبر، دوسرا مجھ جیسا ہیچ میرز پھیچڑ ملاّ جس پر مہربان ہو گئے ایڈیٹر 'برادری' ورنہ پھر درگاہ رضویہ کے گدی نشین خواجہ ثمر بہشت کے قدموں کے علاوہ اور ٹھکانا ہی کہاں تھا؟

سچ کہتا ہوں 'نئے سال' پر تہنیت وتبریک کا کوئی مضمون جب بھی اخباروں ورسالوں میں پڑھتا ہوں تو میرے ذوق کو متلی سی ہونے لگتی ہے۔ اب یہ خدمت میرے سپرد ہوئی ہے تو یہ متلی اور سوا ہونے لگی ہے۔

وہ سال جس میں مجھے اسی قلم سے ایڈیٹر 'برادری' کی بست سالہ ملازمت کے معاہدہ پر دستخط کر دینا پڑا تھا 'مگر مرتا کیا نہ کرتا'۔ وہ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھ پر مصیبتوں وآفتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا سب سے بڑی مصیبت کا سامنا اپنے پیر کی خفگی وناراضگی کی شکل میں کرنا پڑا۔ جس کا اجمال یہ ہے کہ ایک دن حضرت پیر روشن ضمیر اپنی ایک مجلس میں حاضرین ومریدین سے اپنی کرامت بابت ہوا میں اڑنے کا ذکر فرما رہے تھے کہ بدقسمتی سوار ہوئی مجھ پر جو میں نے ''دخل در اظہار کرامت'' کرتے ہوئے روس کے راکٹ کا ذکر چھیڑ دیا۔ بس کیا تھا حضرت کے جلال وجبروت کا کوہ آتش فشاں پھوٹ پڑا۔ نہ صرف میری بیعت فسخ فرما دی بلکہ گزشتہ سات پشتوں کا نکاح کالعدم اور آئندہ تین نسلوں کے ولدالحرام ہونے کا فتوی دے دیا۔ ایک معمہ کے کامیاب حل کی بدولت جو انعامی رقم میں نے حضرت کی خدمت میں از راہ سعادت وحصول قرب نذر گزاری تھی اس کا ثواب لوٹا دیا اور مزید فرمایا کہ اس رقم سے میں نے جتنی بھی ''افیون'' کھائی ہوگی وہ سب کے سب سانپ بچھو کی شکل میں تمہاری قبر میں تمہارے سامنے آئے گی۔

خیر یہ ایک طویل داستان غم ہے جن پر میرے تمام دوستوں کو افسوس ہوا اور اگر کسی کو خوشی ہوئی تو میری جورو کو جس پر ایک مولوی صاحب کی 'چھو' چل گئی تھی جو ہر مسئلہ میں قرآن وسنت کی ٹانگ اڑاتے پھرتے ہیں نہ 'جام معرفت' کی تلاش ہے نہ رموز طریقت کی جستجو بس سارے مسائل اک شریعت سے حل کرتے ہیں۔

قلم میرا کہاں سے کہاں بدک گیا عرض یہ کرنا تھا کہ میں قارئین 'برادری' کو تہنیت ومبارکباد کا پیغام دے کر ان کے ساتھ ''فراڈ'' کرنا نہیں چاہتا۔ غالباً آپ چونک پڑے ہوں گے کہ اس میں فراڈ کی صورت کیسے پیدا ہو سکتی ہے مگر اس ستم زدہ اور ''رسم کش'' ملاّ کو کہنے دیجئے کہ مبارکباد دینے والے جملہ صحافیان وایڈیٹران

آپ کے ساتھ سوا سولہ آنہ فراڈ کرتے ہیں ذرا ذہنی دریچوں سے خوش گمانیوں اور ماضی فراموشیوں کا پردہ ہٹا کر سوچیے کہ آپ سال کے ۱۱ مہینے اور ۳۰ دن گزار کر نئے سال کی دہلیز پر قدم رکھتے ہیں تو جہاں آنے والے اس نئے سال پر دوستوں وعزیزوں کو مبارک باد دینے کی خوشی آپ کے دلوں میں چٹکیاں لینے لگتی ہے وہاں گذرنے والے سال کے ۱۲ مہینوں کی نحوست، ادبار وآلام کے خلاف نفرت و بیزاری کی انگیٹھیاں بھی سلگنے لگتی ہیں...دسمبر کا آخری اور جنوری کا پہلا دن اپنے متضاد تاثرات کی ایک عجیب الخلقت دنیا لیے ہوئے گذر جاتا ہے یہ ایک دستور بن گیا ہے جو صدیوں اور قرنوں سے اسی طرح جاری ہے۔..جب یہ ایک حقیقت ہے اور ناقابل تردید حقیقت ہے تو پھر کیوں نہ ہم اور آپ ایک ایسی مجلس کے انعقاد پر سنجیدگی کے ساتھ غور کریں جس میں آنے والے سال پر خوشی ومسرت منانے کے بجائے گذرنے والے سال کے آلام وابتلاء، مصائب وافلاس پر ماتم وفغاں کا اہتمام کیا جائے۔

قابل رحم جنوں:

الفت میں ہر اک شے الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ے

جی ہاں! مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے۔شمع نظر آتا ہے پروانہ نظر آتی ہے شیریں نظر آتا ہے فرہاد نظر آتی ہے۔..الفت کیا ہوئی جیسے عقل و ہوش کا مکمل اسقاط ہوگیا۔اس شعر کے متعلق میرا خیال یہ تھا کہ اس میں اردو ادب کا قیمہ بڑی سعادت مندی کے ساتھ بنا کے رکھ دیا گیا ہے مگر جب صوفی شکم علی والا واقعہ درپیش ہوا تو خدا رحم کرے اس شعر کے تولد فرمانے والے شاعر پہ اس کی سمجھ پر مجھے رشک آنے لگا۔ہوا یوں کہ صوفی صاحب کے پیر مرشد خواجہ زلف دراز جب ان کی چہیتی بیگم 'گل بہار جہاں' کو بستر وچارپائی سمیت بسبب اپنی کرامت کے فرار ہوگئے تو صوفی صاحب کے دل ودماغ پر بہت ہی ڈبل قسم کا صدمہ حملہ آور ہوا اور محبوب بیوی کی سابقہ محبت بسبب ان کی جدائی کے ''جنوں'' کی شکل اختیار کرگئی۔بیوی کی جدائی کا قلق اور صدمہ بایں جا رسید کہ صوفی صاحب بچارے دیوانے سے ہوگئے پہلے تو ان کی دیوانگی کا منظر صرف گھر ہی والوں کے لیے مخصوص تھا یعنی کہ صوفی صاحب پر آدھی رات کے قریب عالم خواب میں ایک خاص قسم کا دورہ پڑا کرتا تھا، ہوتا یوں تھا کہ وہ اچانک چارپائی پر سے ایک جست لگا کر زمین پر آجاتے اور 'میری گل بہار' 'میری گل بہار' کے 'نیندا چاٹ' نعروں کے ساتھ گھر کے ہر چہار سمت دوڑ لگایا کرتے تھے۔اگر حالت اسی حد تک رہتی تو خیر غنیمت تھی۔مگر ترقی یہاں تک ہوئی کہ ان پر یہ دورہ حالت بیداری میں بھی پڑنے لگا اور عام شاہراہ پر چلنے پھرنے والے لوگ صوفی صاحب کی نظر سے بچنے کی کوشش کرنے لگے اور وہ منظر تو بڑا ہی ٹریڈی جی نما اور دلخراش تھا جب صوفی صاحب امین آباد نخاس روڈ پر اپنے ماموں سے لپٹ گئے اور کسی طرح چھوڑنے کا نام نہ لیتے تھے۔ہر چند سمجھایا گیا کہ یہ آپ کی بیگم گل بہار جہاں نہیں بلکہ آپ کے رشتہ کے ماموں چودھری خفقان صاحب ہیں مگر وہ صوفی شکم علی کہاں جو آسانی سے مان جاتے۔

ہے۔ہے۔ہے۔یہی وہ الفت ہے جس کی رو سے چودھری خفقان مسماۃ گل بہار جہاں نظر آتی ہیں۔

یہ الفت بھی کیا شے ہے کیا کیا گل کھلاتی ہے

ایک خبر ملاحظہ فرمائیے! مگر شرط یہ ہے کہ ضبط کی جھولی پھٹنے نہ پائے کہ واقعہ سو فیصدی درگزر اور معاف کرنے کا ہے۔خبر ہے 'شری پی سی بروا' نے پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے حکومت ہند سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ حکومت حجاز سے ہندوؤں کو کعبہ مکرمہ میں پوجا پاٹھ کرنے کی اجازت دلائے کیونکہ کعبہ میں شیولنگ [لاحول ولاقوۃ] نصب ہے جو ہندوؤں کے نزدیک نہایت ہی مقدس ترین چیز ہے۔مشہور آریہ سماجی اخبار 'تیج' دلی نے خبر مذکور پر ایک ادارتی نوٹ رقم فرماتے ہوئے مزید تائید کا فرض انجام دیا ہے۔[اللہ ان دونوں کے بھیجوں میں عقل اور آنکھوں میں نور بھرے]۔

بہت سے مسلم اخبارات ورسائل نے اس خبر پر غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے حکومت ہند سے احتجاج کیا ہے کہ وہ مہاشے تیج اور مسٹر بروا جیسے ''بہادر بھگتوں''

کے قفل دماغی میں عقل و ہوش کی بالکل ٹھیک ٹھیک کنجی لگائے۔ مگر میں صاف صاف یہ اعلان کیے دیتا ہوں کہ میں ان مہاشے اور مسٹر کے متعلق اپنے ذہن میں یہ خیال قطعاً نہ گھسنے دوں گا کہ یہ حضرات خدانخواستہ شے لطیف سے ایسے محروم ہیں جیسے گدھا سینگ سے۔ ہاں ڈرتا ہوں میاں حیات اللہ انصاری ایڈیٹر 'قومی آواز' لکھنؤ نوراللہ عینہ وزیداللہ عقلہ کی ذات ''مخزن صفات'' سے کہ مبادا میاں صاحب اس خبر کو مفید مدعا بنا کر 'متحدہ قومیت' کے تھکے ہوئے بک ٹٹ پر چابک مارنے لگیں۔ ماشاءاللہ چشم بددور، میاں صاحب کا ذہن شریف وہاں تک پہنچ جاتا ہے جہاں عام ''طائر عقل'' کا پر پرواز جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ کیا آپ بھول گئے کہ میاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے سید وارث علی شاہؒ دیوان ضلع بارہ بنکی کے عرس کے موقع پر ایک ضمیمہ خصوصی شائع کیا تھا جس میں آپ نے اپنی اس تحقیق کا انکشاف فرمایا تھا کہ حاجی صاحب علیہ رحمۃ کا نقطۂ نظر بالکل ''سیکولرازم'' کا چربہ تھا۔ مزید برآں یہ کہ میاں صاحب اس کے قبل بھی اس قسم کا ایک انکشاف مشہور عارف مولانا جلال الدین رومیؒ کے متعلق فرما چکے ہیں۔ سوچئے تو سہی! اس دیدے کے انسان کتنے ملتے ہیں، یقین جانئے کہ اگر آپ کسی مانے ہوئے پیر کا کوئی خاص الخاص تعویذ کھدر کے کپڑے میں زانو پر باندھ کر ڈھونڈنے نکلیں گے تو شاید فی کروڑ ایک کی نسبت سے اس قسم کی چند ہستیوں پر نظر پڑ جائے کہ یہ لوگ مخلوق ہی عجیب ہوتے ہیں۔ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی اس کو کیا کہوں کہ میاں صاحب سلمہ اپنی بعض نادر ''خصوصیات'' کی بناء پر اس غریب ملاّ کو بے حد عزیز ہیں۔ مجھے ناظرین سے یہ عرض کرنا ہے کہ مسٹر پی۔ سی بروا اور مہاشہ تیج کی ''دیوانگی'' سو فیصدی قابل رحم ہے۔ دیوانگی۔ اور۔ رحم۔ یہ جملہ چونکا دینے والا ضرور ہے مگر سمجھ میں آجانے والا بھی ہے۔ یہ ملا امرود بخت شلجمی کہتا ہے کہ اگر صوفی شکم علی صاحب کی دیوانگی قابل رحم قرار دی جاسکتی ہے تو کیا مسٹر بروا اور مہاشہ تیج کی دیوانگی بابت سمجھ لینے سنگ اسود کو شیولنگ [معاذاللہ] قابل رحم قرار نہیں دی جاسکتی۔

اگر کوئی صاحب مذکورہ واقعہ کو مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی توہین کا مسئلہ قرار دے کر ''کورٹ'' میں کیس دائر کرنا چاہتے ہوں تو ان کو میری طرف سے زبردست چیلنج ہے کہ امرود بخت ابن شاہ شلجم نصیب مسٹر بروا اور مہاشے تیج کی بے گناہی ایسے دلائل سے ثابت کر دکھائے گا کہ تمام وکلا اور بالسٹر صاحبان دانت تلے انگلی بلکہ کلائی دبانے پر مجبور ہو جائیں گے اس سلسلہ میں مجھ پر ایڈیٹر 'برادری'، 'قومی غداری' کی فرد جرم عائد کر کے ملازمت سے برطرف بھی کر دیں گے تو کوئی پرواہ نہ ہوگی۔ مجھے کامل اطمینان ہے کہ اس صورت میں جناب حیات اللہ انصاری صاحب ایڈیٹر 'قومی آواز' لکھنؤ مجھے اپنے اخبار کی نوکری فی الفور مرحمت فرمائیں گے۔ اور میں بھی ابھی سے یہ کہے دیتا ہوں کہ میں قومی آواز کا نوکر ہو کر کانگریسی حکومت کا ''حق نمک'' کچھ اس طرح ادا کروں گا کہ انصاری صاحب بھی اس پر پھڑک اٹھیں گے۔ اب رہ گیا گناہ و عذاب آخرت کا ڈر تو۔ 'یہاں تو خیر سے کٹے گی عاقبت کی خبر خدا جانے' اور پھر میں یہ بھی تو سن چکا ہوں کہ پیر ساون علیہ رحمۃ کے مزار پر ۴۴ کبوتروں کی نذر گزارنے سے 'مغفرت کا بیمہ' ہو جاتا ہے۔

اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ناظرین کو مسٹر پی، سی، بروا اور مہاشے پنچ بھگت بہادر کی بے گناہی کی دلیل بھی سنا دوں کہ اگر کچھ یار لوگ عدالت کے دروازے پر دستک دینے کا ارادہ کر چکے ہوں تو وہ اپنے فیصلہ سے باز آجائیں۔ دلیل یہ ہے کہ ''جنون و دیوانگی'' کے عالم میں انسان کا ہر فعل ناقابل اعتنا ہوتا ہے۔ میرے نزدیک مسٹر بروا اور مہاشہ تیج محض جنون و دیوانگی کے شکار ہوئے ہیں جس طرح صوفی شکم علی اپنی بیوی کی انتہائی محبت کے ''جنون'' میں اپنے ماموں چودھری خفقان کو گل بہار جہاں سمجھنے میں بے قصور سمجھے جاسکتے ہیں کہ ''الفت میں ہر اک نقشہ الٹا نظر آتا ہے''۔

مہاشہ تیج اور مسٹر پی۔ سی بروا کی پیشانی کو اگر بغور دیکھا جائے تو اس پر یہ شعر کندہ ملے گا

اے شوق نظارہ کیا کہئے، نظروں میں کوئی صورت ہی نہیں
اے ذوق تصور کیا کیجیے، ہم صورت جاناں بھول گئے

اور اگر ان کی ''سطح ذہن'' کو تراش کر مخصوص خوردبین سے دیکھا جائے تو ثبت ہوگا۔

فریفتہ مجھے عالم کے رنگ و بو نے کیا
بڑا ستم ترے ملنے کی آرزو نے کیا

'ذوق تصور' کا کمال ہی تو سمجھا جائے گا کہ یہ حضرات 'صورت جاناں' [لنگ] بھول گئے ورنہ 'سنگ اسود' کے متعلق 'دھوکہ نہ کھاتے' اور 'لنگم کے ملنے کی آرزو' نے ہی تو یہ ستم ڈھایا ہے کہ یہ حضرات 'سومناتھ' کا راستہ بھول کر 'کعبہ' کی طرف چل پڑے 'لنگم' کے ساتھ ان حضرات کے والہانہ تعلق اور جنون آمیز عشق پر میں نے مذکورہ بالا سطور میں جو کچھ عرض کیا ہے اس کی حیثیت محض 'دلیل عقلی' کی ہے اب ذرا 'نقلی دلیل' بھی ملاحظہ فرمالیجئے تاکہ میرے دعوے کے لیے 'درایت' کے ساتھ ساتھ 'روایت' کی کمک بھی ساتھ ہو جائے۔ مشہور محقق و مفکر ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتا ہے 'ہندوؤں کو مورتوں اور ظاہری علامات سے بے انتہا انس ہے ان کا کوئی مذہب کیوں نہ ہو اس کے اعمال کو یہ لوگ نہایت اہتمام سے بجالاتے ہیں ان کے مندر پرستش کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں جن میں سب سے مقدم و مقدس 'لنگم' اور 'یونی' ہیں جن سے مراد مادۂ خلقت کے دونوں جزء [آلات تناسل مردانہ و زنانہ] ہیں اشوک کے ستون کو بھی عام ہندو لنگم خیال کرتے ہیں اور اسطوانہ اور مخروطی شکلیں ان کے نزدیک واجب التعظیم ہیں' [تمدن ہند ۴۴۷]۔ مشہور آریہ سماجی پیشوا شری دیانند سرسوتی لنگم اور یونی سے ہندوؤں کے والہانہ تعلق اور عشق پر اظہار خیال فرماتے ہوئے لکھتے ہیں ''بعض مورخین کا بیان ہے کہ ہندوؤں کے ایک مذہبی فرقہ کے مرد برہنہ عورتوں کی اور عورتیں برہنہ مردوں کی پرستش کرتے تھے۔ [ستیارتھ پرکاش ۳۴۴] اب مہاشہ تیج اور مسٹر پی سی بروا کے مذکورہ بیانات کو لنگم سے ان کے والہانہ عشق و جنون کی صدائے بازگشت سمجھنے میں کوئی اشکال پیش نہیں ہونا چاہیے۔

خیال فرمایئے جب ہر مخروطی اور اسطوانہ شے میں 'لنگم' کے 'جلوۂ جاناں' کا عکس نظر آتا ہو اور اس پر فریفتگی کا یہ عالم ہو کہ اشوک کی لاٹ جیسی بھاری بھرکم چیز میں بھی 'لنگم' کا پرتو تلاش کیا جارہا ہو تو اس میں کیا اشکال باقی رہا کہ یہ 'جنون' صوفی شکم علی کے جنون سے بھی ٹاپ کر گیا کہ چودھری خفقان اور مسماۃ گل بہار جہاں میں کچھ نہ کچھ ''جسمانی یگانگت'' اور 'نوعی رشتہ' سبھی کو تسلیم ہے مگر لنگم اور اشوک کی لاٹ؟ ارے باپ رے باپ۔

الفت میں ہر اک شے الٹا نظر آتا ہے
مجنوں نظر آتی ہے لیلیٰ نظر آتا ہے

پیر ساون علیہ رحمہ کی زبان حقیقت ترجمان سے ادا ہوا ہوتا تو میں اپنی پہلی فرصت میں پٹنہ والی چھبیلی بائی کی ٹولی بلوا کر رقص و سرود کی وہ محفل جماتا کہ سارے 'عاشقان اولیاء' کے ریکارڈ مات پڑ جاتے۔ چاہے تین ماہ کی پیشگی تنخواہ ہی کیوں نہ لینی پڑتی۔

تو اے ناظرین! مجھے کامل یقین ہے کہ آپ لوگوں نے میری مذکورہ دلیل کا وزن تسلیم کرلیا ہوگا۔ اس لیے مکرر عرض ہے کہ کعبہ مکرمہ کی مبینہ توہین پر اپنے دلوں میں رنج و ملال کو قطعاً جگہ نہ دینا اور نہ ہی زبان سے اُف کہنا کہ 'متحدہ قومیت' کی عمارت میں شگاف پڑنے کا اندیشہ ہے اور اگر 'متحدہ قومیت' کے فارمولے پر آنچ آئی تو پھر جناب حیات اللہ انصاری کا 'آئینہ دل' ضرور ٹوٹ جائے گا جو مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنا اپنے چوغے کی چور جیب۔

[مطبوعہ: سالنامہ، پندرہ روزہ 'برادری' یکم و ۱۵ جنوری ۱۹۶۰ء، لکھنؤ]

●●●

مرثیہ جناب حکیم مظہر سبحان عثمانی مرحوم

اجمل صدیقی

اس دکھ کا بیاں کیا کہ دوا جس کی نہیں ہے
اب چارہ گرِ غم تو کہیں اور مکیں ہے
وہ مظہرِ اعجازِ مسیحائی گیا چھپ
وہ عزتِ حکمت تھا سو اب پردہ نشیں ہے
فردوس کی ایک موج اسے لائی تھی ہم تک
بو گل میں گئی لوٹ، جہاں کی تھی وہیں ہے
اے بلبلِ گلشن نہیں اب کوئی جو سمجھے
بے فائدہ اب تیرا یہ آہنگِ حزیں ہے
اے خاک سوا تیرے بتا کون ہے نازاں
اک جوہر یونان یہاں زیرِ زمیں ہے
وہ نسخہ گر جس پر تھا لکھا غم کا مداوا
اس کو تو صبا لے گئی اب اور کہیں ہے
پی کر جسے یہ رند جگاتے تھے جہاں کو
ساغر وہ یوں چھلکا کہ اب اک بوند نہیں ہے
کس وقت مسیحا کو سفر کرنے کی سوجھی
بالیں سے بیمار جب اٹھنے کے قریب ہے
اب خضرِ رہِ آب شفا کون ہے اجمل
ہے کون جو الرازی کے رازوں کا امین ہے

قطعہ تاریخ وفات

اک نبض ہی تو ٹھہری غم بھی ٹھہر گیا کیا
ماتم میں اک گل کے، گلشن ہی مرگیا کیا
کیوں بے کشش چمن ہے، کیوں بے اثر دوا ہے
بلبل نے روکے پوچھا مظہر گزر گیا کیا

۱۴۳۴ھ

●●●

حکیم مظہر سبحان عثمانی تصویروں کے آئینے میں

تصویروں کی اپنی ایک الگ زبان ہوتی ہے۔ جو بات بہت سارے الفاظ میں کہنا ممکن نہ ہو، اسے ایک تصویر بڑی خوبصورتی سے ادا کر دیتی ہے۔ حکیم مظہر سبحان عثمانی ایک مجلسی شخص تھے۔ ان کی زندگی حرکت ونشاط سے عبارت تھی اور اہم شخصیات سے ان کے قریبی تعلقات رہے۔ مختلف طبّی،، ادبی، سیاسی اور سماجی تقریبات میں ان کی شرکت روزمرہ کا معمول تھی۔ ایسی بھرپور زندگی بہت ساری یادوں کو جنم دیتی ہے جنہیں محفوظ رکھنے کی سب سے خوبصورت شکل تصویریں ہیں۔

سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن سے حکیم مظہر سبحان عثمانی کی طویل وابستگی رہی۔ وہ کونسل کے پروگراموں میں شوق سے تشریف لاتے، اسٹیج کی زینت بنتے، میٹنگوں کی صدارت کرتے، خطاب کرتے اور لوگوں سے ملاقاتیں کرتے۔ ان لمحات میں تصویر گر کو ان کی وجیہ شخصیت کے عکس کو مختلف زاویوں سے کیمرے میں قید کرنے کا موقع مل جاتا۔ آئندہ صفحات میں حکیم مظہر سبحان عثمانی اپنے جلوے بکھیرتے نظر آئیں گے۔ تصویروں کا یہ انتخاب ڈاکٹر اسلم جاوید صاحب کے خصوصی تعاون سے ممکن ہوسکا کہ ان سے اور مسیح الملک حکیم اجمل خاں میموریل سوسائٹی سے مرحوم کو خصوصی تعلق رہا جس کا اظہار بعض تصویروں سے بھی ہوتا ہے۔

آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرول باغ، نئی دہلی کی پلیٹنم جوبلی کے موقع پر منعقد سیمینار میں دیگر مہمانوں کے ساتھ حکیم مظہر سبحان عثمانی

حکیم مظہر سبحان عثمانی سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کے ساتھ

دہلی کی سابق وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دیکشت کو نشان یادگار پیش کرتے ہوئے حکیم مظہر سبحان عثمانی

جامعہ ہمدرد، نئی دہلی کے کنونشن سینٹر میں سابق وزیر مملکت برائے صحت و خاندانی بہبود شری پبن سنگھ گھٹوور کے ساتھ حکیم مظہر سبحان عثمانی

حکیم مظہر سبحان عثمانی دہلی کے سابق میئر شری کیدار ناتھ ساہنی کے ساتھ ایک عوامی اجلاس میں

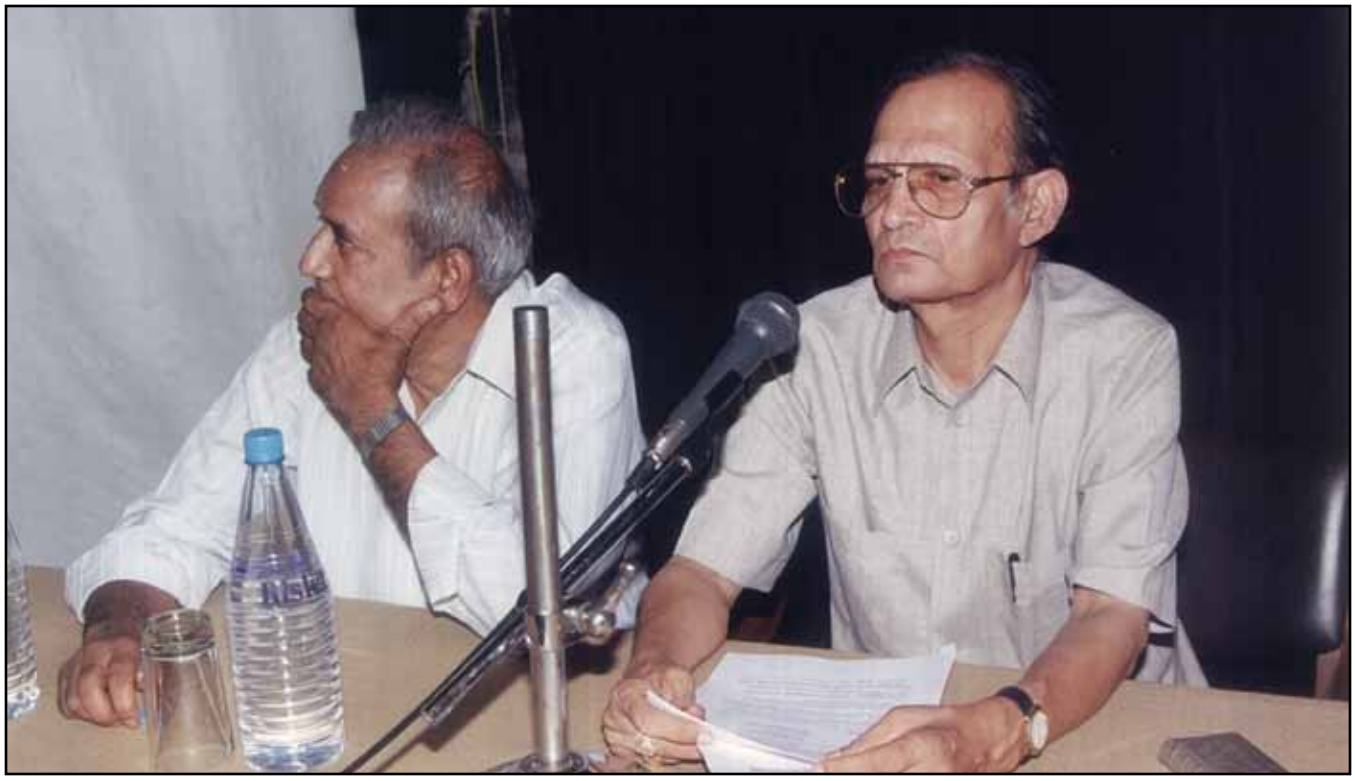

۱۹۹۹ء میں مبادیات طب پر منعقد سی سی آر یو ایم کی ورکشاپ میں حکیم مظہر سبحان عثمانی

حکیم عبدالحمید کی ۹۳ویں سالگرہ کے موقع پر حکیم مظہر سبحان عثمانی کے اعزاز میں منعقد تقریب کا ایک منظر-اسٹیج پر موجود ہیں حکیم مظہر سبحان عثمانی، جناب عزیز برنی، ڈاکٹر سید فاروق، جناب سراج حسین اور ڈاکٹر اسلم جاوید

پروفیسر رئیس الرحمٰن حکیم مظہر سبحان عثمانی کو گلدستہ پیش کرتے ہوئے

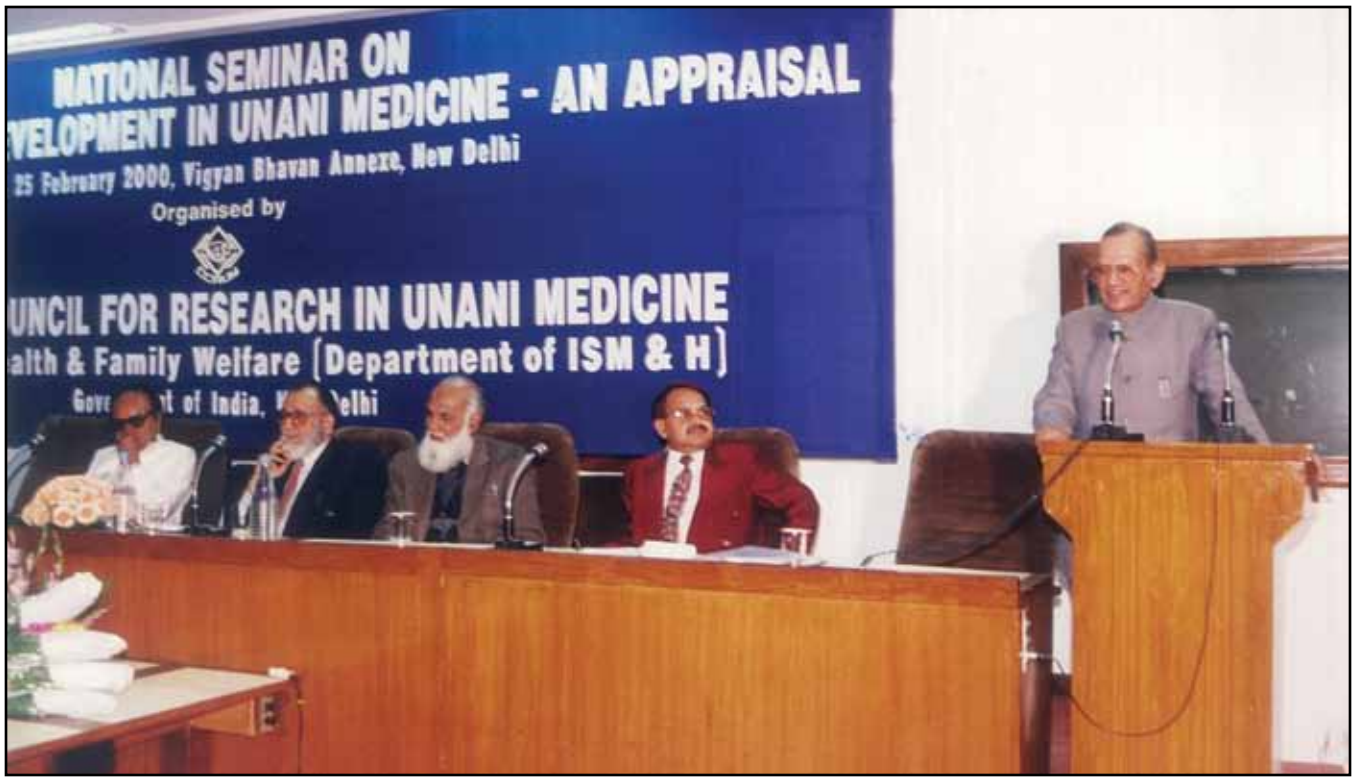

سی سی آر یو ایم کے نیشنل سیمینار آن ریسرچ اینڈ ڈولپمنٹ اِن یونانی میڈیسن، منعقدہ ۲۰۰۰ء میں خطاب کرتے ہوئے حکیم مظہر سبحان عثمانی

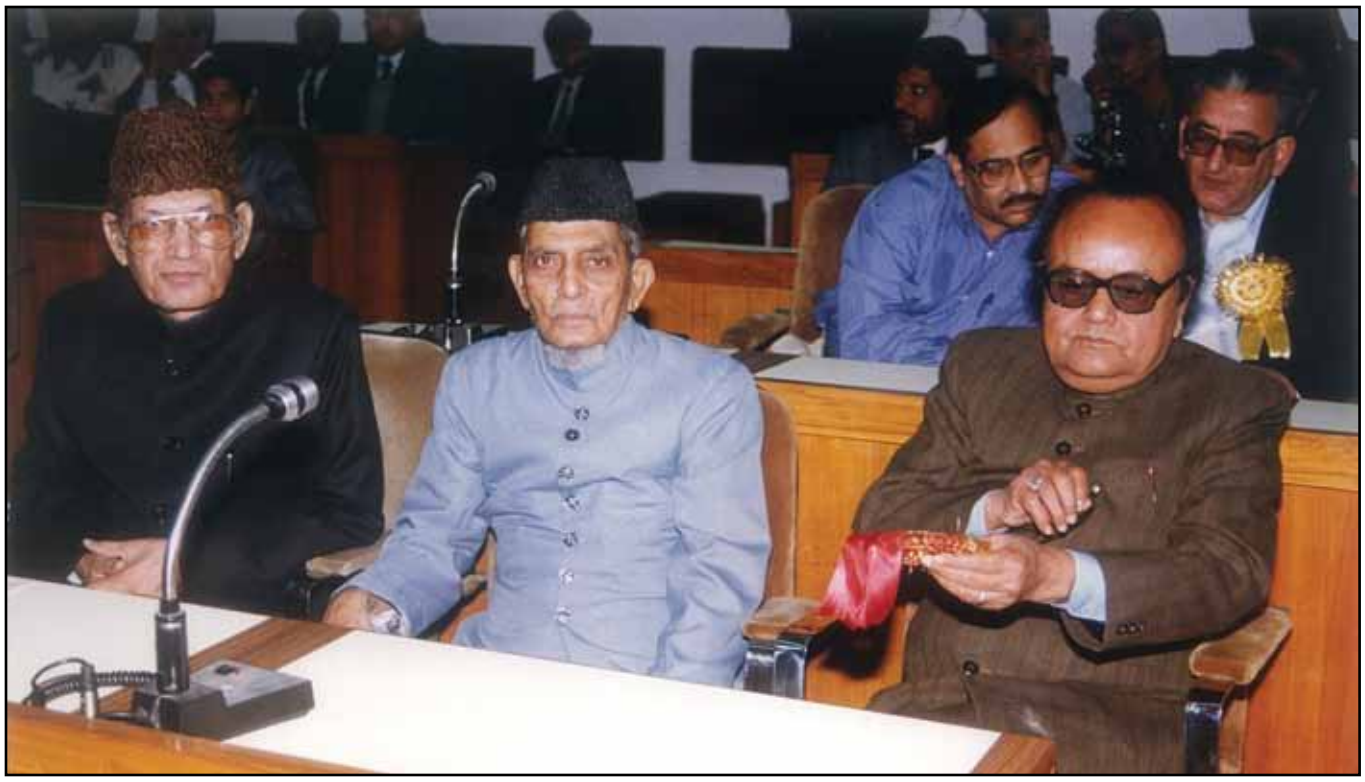

حکیم مظہر سبحان عثمانی، حکیم محمد مختار اصلاحی اور پروفیسر حکیم محمد طیب کی ایک یادگار تصویر

'صحت مشائخ اور یونانی طب' پر منعقد پروگرام میں حکیم مظہر سبحان عثمانی-اسٹیج کے دیگر شرکاء میں محترمہ شیلجا چندرا، حکیم سیف الدین احمد، جناب سراج حسین، ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ اور مائک پر حکیم محمد خالد صدیقی

حاضرین جلسہ کے ساتھ حکیم مظہر سبحان عثمانی

مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے ۲۰۰۳ء کے پروگرام میں اسٹیج پر حکیم مظہر سبحان عثمانی

'صحت مند قلب' پر خطاب کرتے ہوئے حکیم مظہر سبحان عثمانی۔ اسٹیج پر دیکھے جا سکتے ہیں سابق مرکزی وزیر شری رام ولاس پاسوان اور مفتی محمد مکرم

حکیم مظہر سبحان عثمانی شری رام ولاس پاسوان کو نشان یادگار پیش کرتے ہوئے۔اس موقع پر موجود ہیں ڈاکٹر اسلم جاوید

'اجمل ڈے' کے موقع پر سابق ڈپٹی چیئرمین راجیہ سبھا جناب کے رحمٰن خاں سے مصافحہ کرتے ہوئے حکیم مظہر سبحان عثمانی

کانسٹی ٹیوشنل کلب، نئی دہلی میں ایک اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے حکیم مظہر سبحان عثمانی

حکیم اجمل خاں کے حوالے سے منعقد ایک پروگرام میں پروفیسر رئیس الرحمٰن سے گلدستہ قبول کرتے ہوئے حکیم مظہر سبحان عثمانی

'حکیم اجمل خاں میموریل سوسائٹی' کے ایک سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر سنجے پاسوان کے ساتھ حکیم مظہر سبحان عثمانی

سابق وزیر صحت و خاندانی بہبود ڈاکٹر امبومنی رامو داس کے ساتھ حکیم مظہر سبحان عثمانی

سابق نائب صدر جمہوریہ جناب بھیروں سنگھ شیخاوت اور حکیم مظہر سبحان عثمانی ایک خوشگوار موڈ میں

سابق وزیر صحت و سماجی بہبود، حکومت دہلی ڈاکٹر یوگانند شاستری کے ساتھ حکیم مظہر سبحان عثمانی

Registration No. DELURD/2000/7464

Jahan-e-Tib

(Volume 16, Issue 3-4, January – June 2015)

A Quarterly Urdu Journal of

CENTRAL COUNCIL FOR RESEARCH IN UNANI MEDICINE

CENTRAL COUNCIL FOR RESEARCH IN UNANI MEDICINE

Ministry of AYUSH, Government of India

61 - 65 Institutional Area, Janakpuri, New Delhi – 110 058, India

Telephone: +91-11-28521981, 28520501, 28522524

Fax +91-11-28522965

E-mail: unanimedicine@gmail.com

Website: www.ccrum.net

Printed at: Rakmo Press Pvt. Ltd., C-59, Okhla Industiral Area, Phase-I, New Delhi - 110020